شاہ جیؒ

میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا،
پھر تم مجھے پکارو گے۔ لیکن تمہاری پکار تمہارے ہی کانوں سے
ٹکرا کر تمھیں ہلکان کر دے گی۔ مگر تم مجھے نہ پا سکو گے۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

جدید بُک ڈپو
اُردو بازار لاہور
بھوآنہ بازار لائلپور

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ

مؤلف

نذیر مجیدی لائل پوری

بار اوّل ۱۹۶۵ء

جدید بکڈپو اُردو بازار ——— لاہور

باہتمام چوہدری جان محمد کوآپریٹو پریس لاہور میں چھپی۔

ھدیہ ساڑھے سات روپے

فہرست

تاریخ پیدائش

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری"

۱۳۱۰

تاریخ وفات

سید عطاء اللہ شہ بخاری زندہ باد

۱۳۸۱

نذیر مجیدی

دیباچہ

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر جتنے بھی آنسو گرائے جائیں کم ہیں، یہ حقیقت ہے کہ آپ کا وجود ہمارے لئے رحمت خداوندی کا درجہ رکھتا تھا۔ اس گران قدر سرمایہ کا چھن جانا ایک عظیم سانحہ ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سرزمین کے عوام میں انگریزی سامراج کے خلاف جس ہمت و شجاعت سے کام کیا ہے اس کی مثال نہیں، انھوں نے انگریز کے خلاف ایک ذہن پیدا کیا اور پھر یہاں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قوم کو حکومت برطانیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا سلیقہ بتایا، اس زمانے میں جبکہ افرنگی جبر و تشدد کے سامنے چنگیز و ہلاکو منہ چھپائے پھرتے تھے۔ جب حریت پسندوں کے سینے چھلنی کر دیئے جاتے تھے جب انگریزی رعب و دبدبہ ہر خاص و عام کے دل و دماغ پر مسلط ہو چکا تھا حضرت شاہ صاحبؒ نے خیبر سے لے کر کلکتہ تک اور مدراس سے لے کر ہمالیہ تک ایک آگ لگا دی۔ ملک کی فضا کو انقلاب زندہ باد کی گونج میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے انتھک ارادوں کے آگے کوئی طاقت نہ ٹھہر سکی اور چند ہی برسوں میں اس دھرتی کے لوگوں میں ایک عظیم زندگی پیدا کر دی۔ اس میدان میں مولانا ابو الکلام آزاد علیہ الرحمۃ کا "البلاغ و الہلال"، مولانا محمد علی جوہرؒ کا "ہمدرد اور کامریڈ"، مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" اور حضرت شاہ صاحبؒ کی قوتِ گفتار یہ سب یکساں درجہ رکھتے تھے، بلکہ یوں کہنا مبنی بر حقیقت ہوگا کہ وہ دیہاتی علاقے جہاں لوگ ان پڑھ اور اخباری دنیا سے ناواقف تھے، جہاں پر ان تینوں بزرگوں (مولانا ابو الکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علیخاںؒ) کی کوششیں اپنا اثر پیدا نہ کر سکیں، وہاں بخاری زمزمے فضا میں گونج گئے، یہ تینوں بزرگ جو کام اپنی قلم سے سرانجام دیتے

رہے، بالکل وہی کام یہ مردِ مجاہد تنہا سر انجام دیتا رہا، تحریک خلافت ہو یا تحریکِ ترکِ موالات، تحریک کشمیر ہو یا تحریک نمک سازی، تحریک ختم نبوت ہو یا تحریک فوجی بھرتی آپ کی آواز صورِ اسرافیل کی طرح ہر بار ملک میں گونج گئی۔ لاکھوں افراد اپنے اس محبوب رہنما کی آواز سن کر یکبارگی گھروں سے نکل پڑے۔

حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے کام کی رفتار اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے جذبہ و ولولۂ حریت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا تھا کہ جب ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو تحریک نمک سازی اس ملک میں شروع ہوئی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنا طوفانی دَورہ لاہور سے شروع کیا۔ لاہور سے چل کر یہ بطلِ حریت امرتسر، جالندھر، لدھیانہ میں اپنے نعرہ ہائے حریت سے فضا کو مسحور کرتا سہارنپور پہنچا۔ جہاں سے پھر امروہہ، یو۔ پی، سی۔ پی، بہار کو روندتا ہوا بنگال میں دیناج پور کے مقام پر گرفتار ہو گیا، مولانا عزیز الرحمٰن ابن مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اپنی کتاب "رئیس احرار اور ہندوستان کی جنگِ آزادی" نامی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس سارے دورے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریروں سے متاثر ہو کر ایک لاکھ سے زیادہ فرزندانِ توحید نے انگریزوں کے خلاف تحریک نمک سازی میں حصّہ لیتے ہوئے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا، پنڈت موتی لعل نہرو نے شاہ صاحبؒ سے کہا

"شاہ صاحب! کانگریس ستیہ گرہ کی کامیابی صرف آپ سے وابستہ ہے۔"

یہ تھا حضرت شاہ صاحبؒ کا کام کرنے کا جذبہ کہ جس کے آگے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے طول و عرض سکڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ایک سیل رواں تھا کہ جس کا رکنا حکومت کے بس کا روگ نہ تھا، ایک طوفان تھا کہ جس کے آگے گورنمنٹ کی تمام تدبیریں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی رہیں، آسمانِ حریت پر شاہ صاحبؒ کا نام نامی درخشندہ ستارے کی طرح ہمیشہ روشن و منور رہے گا اور آنے والی حریت پسند نسلیں اس بطلِ جلیل کے احترام میں اپنی گردنیں خم کر لیا کریں گی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کہا کرتے تھے کہ "دنیا میں مجھے ایک چیز سے محبت ہے اور ایک چیز سے نفرت، قرآن سے محبت اور انگریز سے نفرت"

دراصل آپ کے اس ارشاد میں آپ کی زندگی کے دو بڑے مشن پوشیدہ تھے، جن کو کامیاب بنانے کے لئے آپ نے اپنی زندگی کے تقریباً ۱۲ برس قیدِ افرنگ کی نذر کر دیئے۔ یہ دو مشن —

اول ——— انگریز کی غلامی کے خلاف آواز اور انگریزوں کے حواریوں کی سرکوبی

دوم ——— ختم نبوت کے قزاقوں کا تعاقب

چنانچہ جہاں تک آپ کے دوسرے مشن کا تعلق ہے آپ کو جو محبت آنحضرت صلعم سے تھی وہ ایک عشق کا درجہ رکھتی تھی، فرمایا کرتے تھے۔

"خدا کے معاملہ میں جو جی آئے کہو ——— لیکن
آنحضرت کے متعلق گستاخی کرنے والی زبان گدی سے
کھینچ لی جائے گی ——— وہ عقیدے کا معاملہ
ہے ——— اور یہ عشق کا معاملہ"

اور پھر حضرت شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں عملی طور پر اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی جس گوشے سے بھی آنحضرت صلعم کے خلاف کوئی زبان حرکت میں آئی، آپ کے جذبات احساسات میں ایک کھلبلی سی مچ گئی، آپ سینہ سپر ہو گئے اور پھر کبھی یہ نہیں دیکھا کہ مخالف کتنا طاقتور اور بااثر ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

غرض آپ مخالفینِ اسلام کے لئے ایک دو دھاری تلوار تھے جو ہمیشہ کفر و باطل کی طاقتوں کے سر پہ لٹکتی رہی، آپ آسمانی بجلی تھے جو منکرین ختم نبوت پہ عذاب الٰہی بن کر گری۔ آپ کی للکار اور قوتِ گفتار کے آگے بڑے بڑے فرعون نہ ٹھہر سکے آپ

کے عزم واستقلال کی قسمیں بہت عرصہ لبعد تک بھی فخر و ناز سے اٹھائی جاتی رہیں گی۔
آپ حق و بے باکی، بہادری، شجاعت، عظمت ووقار، خودداری وغیرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے، ہزاروں مشکلات ومصائب آپ کے پائے ثبات میں تزلزل پیدا نہ کرسکے۔ بڑے سے بڑا لالچ آپ کو اپنے مقصد عالی سے جدا نہ کرسکا شاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والا، یہ مردِ درویش جس نے بڑی جرأت سے فرنگی شان وشوکت کو تملک سنبھے مارے آج اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگیا جس کے ساتھ ہی تاریخ پاک وہند کا ایک خاص دور ختم ہوگیا جو آپ کی انوکھی خطیبانہ خوبیوں اور آپ کے عزم و استقلال سے منور تھا۔

آپ ہم میں نہ رہے تو کیا ؟ آپ کا نام آپ کا کام اور آپ کا حسن کلام ہمیشہ زندہ و باقی رہے گا۔ آپ علم و عمل، شریعت و طریقت، رزم و بزم، شعر و ادب، اخلاق و مزاح، ظرافت و لطافت، ہمت و استقلال، خودداری و بے باکی، انسانیت و شرافت زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، فصاحت و بلاغت کا ایک حسین امتزاج تھے، آپ کی موت کے بعد کوئی ہستی باقی نہیں رہی جو ان تمام خوبیوں کی حامل ہو۔ آپ کی موت ایک بہت بلند انسان کی موت ہے۔

اس پختہ حقیقت سے مگر کس کو مفر ہے
محفوظ نہیں دامِ اجل سے کوئی جاندار
ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ ہو ولی ہو کہ پیمبر
اس راہ سے گزرنا ہے ہر اک شخص کو اک بار

میرے پیش نظر اس کتاب کی ترتیب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس عظیم انسان کی وفات پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اس کو محفوظ کر لیا جائے، تاکہ آنے والی نسلیں اس بطل جلیل کی شخصیت کے صحیح خدوخال سے آشنا رہیں، جس نے برصغیر کی آزادی کے لئے ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور جس کی وفات پر ملک کے پریس، سیاسی و

مذہبی اکابرین اور ممتاز ادیبوں نے نظم ونثر کی صورت میں شایان شان خراج عقیدت پیش کیا۔ کیونکہ بصورت دیگر ان انمول اور قیمتی شہ پاروں کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ شاہ جی کے معتقد و عقیدت مند اس کام کی اہمیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی بے نیازی سے کام لے رہے تھے اور وہ لوگ جن کو شاہ جی سے سیاسی اختلاف رہا ہے وہ اتنے دل گردے کے انسان نہیں کہ ان سیاسی اختلافات کے باوجود شاہ جی کے کارہائے نمایاں کو اپنی تحریروں میں شامل کریں۔ ایسے حالات میں خداوند کریم کا احسان مند ہوں کہ اس کتاب کی ترتیب کے لئے مجھے ہمت دی، شاید یہی وسیلہ بخشش بن جائے۔ یہ ناشکری ہوگی اگر میں یہاں پر ہفت روزہ "چٹان" ماہنامہ "تبصرہ"، روزنامہ "امروز" اور "کوہستان" کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی محنتوں اور کوششوں سے یہ مواد مہیا ہوا۔ نیز میں اپنے ہونہار شاگرد انوار احمد کا بھی ممنون ہوں۔ جس نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے میری ہر ممکن مدد کی۔

(خالد شبیر ایم۔ اے)

"میں ان سؤروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپیریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں، میں کچھ نہیں چاہتا، ایک فقیر ہوں، اپنے نانا کی سنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں اور اگر کچھ چاہتا ہوں، تو صرف اس ملک سے انگریز کا انخلا۔ دو ہی خواہشیں ہیں، میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے، یا پھر میں تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں"۔

(سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ)

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

(فیض)

حضرت امیرِ شریعت پاک و ہند کے عظیم سیاسی، مذہبی اور ادبی رہنماؤں کی نظر میں ✦

✦ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ
"شاہ جی اسلام کی چلتی پھرتی تلوار ہیں"

✦ فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خاں
"وہ جنگ آزادی اور اسلام کے زبردست مجاہد تھے"

✦ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد
"ملک و ملت کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے"

✦ مولانا محمد علی جوہرؒ
"مقرر نہیں ساحر ہیں، تقریر نہیں جادو کرتے ہیں"

✦ مولانا ظفر علی خاںؒ
"بلبل چہکتا ہے ریاضِ رسول ہیں"

✦ نواب بہادر یار جنگ
"اے کاش میں اس شخص کو مسلم لیگ میں لا سکتا۔ اگر یہ میرے ساتھ ہو تو چھ ماہ کے اندر ملک میں انقلاب برپا کر دوں"

✦ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
"وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے"

✦ مولانا شوکت علیؒ
وہ بولتے نہیں موتی

رو لتے ہیں"۔

✦ مولانا داؤد غزنوی — "بخاری مرحوم جیسا اسلام کا شیدائی دنیا میں پیدا ہونا مشکل ہے"۔

✦ سردار عبدالرب نشتر — "وہ باغ و چمن سے لٹے اور دار و رسن سے گزرے ہیں"

✦ لالہ بھیم سین سچر — "وہ ان چند بے خوف شخصیتوں میں سے ہیں جن کے لئے میرا دل ہمیشہ بے پناہ احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے"۔

✦ ضیغمِ اسلام شیخ حسام الدین — "وہ فنِ خطابت کے امام تھے۔ ان کی موت سے اس محفل کے جو چراغ گل ہوئے ہیں، اب وہ ہمیشہ روشنی کو ترستے رہیں گے"۔

✦ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند — ان کی زندگی کے روشن نقوش نہ صرف تاریخ کے صفحات بلکہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے دماغوں پر منقش ہو چکے ہیں"۔

✦ مولانا مظہر علی اظہر — "ان کی سیاسی بصیرت کے علاوہ ان کی دینی علمی اور ادبی بصیرت کی مثال دنیا کے کسی انسان میں نہیں مل سکتی"۔

✦ محمود علی قصوری — "ان کا چلن زندگی کے سفر میں چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے"۔

✦ علامہ علاؤ الدین صدیقی۔ صدر اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان — "اسلام اور آزادی پر دل و جان سے قربان ہو جانا اُن کی زندگی کا منتہا تھا"۔

✦ ماسٹر تاج الدین انصاری — "وہ علم و ادب، فکر و دانش، سیاست و تدبر کی محفلوں کا چراغ تھے"

✦ مظفر علی شمسی — "وہ حقیقتاً "فنا فی الرسول تھے"۔

- شیخ عثمان آزاد کراچی — "وہ برطانوی سامراج کے خلاف طویل جنگ کے عظیم رہنما تھے"
- حافظ حبیب اللہ خاں وائس چیئرمین کراچی میونسپل کارپوریشن — "اُن کا برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی میں بہت بڑا حصّہ ہے".
- ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ — "ان کے معرکوں کی گونج تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ سنی جائے گی".

- حکیم الامت علامہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی — "ان کی باتیں عطائے الٰہی ہوتی ہے".
- علامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری — "قادیانیوں کے خلاف ان کی ایک تقریر ہماری پوری تصنیف سے بڑھ چڑھ کر ہے".
- حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی — "اُن کا دل صرف اسلام کے لئے دھڑکتا ہے"
- شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ — "وہ کسی ایک کے نہیں سب کے ہیں وہ اسلام کی مشین ہیں"
- حضرت احمد علی صاحب لاہوری رح — "وہ ولی کامل اور اسلام کی برہنہ شمشیر ہیں، جب تک وہ زندہ ہیں، اسلام کو کوئی خطرہ نہیں".
- حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم دیوبند (بھارت) — ان کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی پاکیزہ سیرت کی ترجمان تھی"
- حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی — "ان کی موت سارے عالم اسلام کے لئے نقصان عظیم ہے".
- مولانا مفتی محمد شفیع کراچی — "ان کی موت

عالم اسلام کے لئے نقصانِ عظیم ہے۔"

• مولانا مفتی محمد شفیع کراچی — "اُن کی موت سے علمأ کی صف میں پیدا ہونے والا خلا مدتوں پُر نہ ہوگا"

• مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کراچی — "ایک ایسی شخصیت جس نے ایسا کام کیا جو ایک مدرسہ میں ایک ادارہ سے بمشکل ہو سکے"

• مولانا منظور احمد صاحب نعمانی لکھنؤ (بھارت) — "وہ اسلام اور مسلمانوں کے وفادار تھے"

• خطیب پاکستان قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی — "وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔"

• مجاہد ملت مولانا محمد علی صاحب جالندھری — "وہ فقر و استغنا کا پہاڑ تھے"

• مولانا کوثر نیازی — "پاک و ہند کی تاریخ آزادی میں ان کی زندگی ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔"

• مولانا عبدالرحمٰن صاحب میانوی — "جس سے جگرِ لالہ میں ہو ٹھنڈک وہ شبنم"

• مولانا تاج محمود صاحب لائلپوری — "ان کے کل محاسن خطابت کے لئے اور ان کی خطابت عشق رسولؐ کے لئے تھی"

مولانا حسرت موہانیؒ — "وہ خطابت کے شہسوار ہیں"

خواجہ حسن نظامی دہلویؒ — "انہیں دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان یاد آتے ہیں"

مولانا غلام رسول مہر	"ان کے وجود کی ماہیت اور معنویت کا ذرّہ ذرّہ اسلامیت سے سرشار تھا۔"
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور)	"وہ واقعی عظیم اشخاص میں سے تھے۔ جن کی ہستی کی ترکیب و تعمیر میں قدرت کے غیر معمولی قوانین نے کارفرمائی کی۔"
آغا شورش کاشمیری	"قرونِ اولیٰ میں پیدا ہوتے تو یقیناً ایک جلیل القدر صحابی ہوتے۔"
دیوان سنگھ مفتون (بھارت)	"وہ تاریخ آزادی کے ایک بہادر، نڈر، بیباک اور حق گو شخصیت کے مالک ہیں۔"
احمد ندیم قاسمی	"ان کے بے داغ اور بے لوث خلوص کی قسمیں صدیوں بعد بھی کھائی جاتی رہیں گی"
حافظ علی بہادر (ایڈیٹر "دورِ جدید" بمبئی بھارت)	"ایک فقیر جس کے دامن میں اللہ کے خوف اور رسول کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا جس کو ہمیشہ انگریزوں نے سلام کیا۔"
عبدالحمید عدم	"اخوت کا پیکر، لگن کا ضمیر"
انور صابری دیوبند (بھارت)	"کرے گی ناز تجھ پر تا بہ حشر تاریخ انسانی"
علامہ لطیف انور	"تعظیم محمد کی ادا مر نہیں سکتی"
شیر افضل جعفری	"اس کا جنون دانش کا بدل"
حبیب جالب	"تجھ سے پہلے عام کہاں تھی دار و رسن کی بات"
عبداللہ ملک	"وہ لیلائے حریت کی تلاش میں سیاست کی پرخار وادیوں میں دیوانہ وار مصروف رہا"
میاں محمد شفیع (مدیر ہفت روزہ اقدام)	"میں ان کی سادگی اور ان کی خطابت کا قلب و جگر سے معترف ہوں"

خلیق قریشی	"درویش جس نے جیتے ہیں شاہوں سے معرکے"
امین گیلانی	"جیسے خورشید کوئی اس کے گریباں میں ہے"
جانباز مرزا	"تیرے قدموں میں رہا تاجِ فرنگی کا وقار۔"

"جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے"

(فیضؔ)

حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ
کی وفاتِ حسرت آیات پر رہنمایانِ ملت کے تعزیتی پیغامات

فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خاں

"سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات حسرت آیات پر مجھے بے حد رنج ہوا ہے شاہ صاحب جنگِ آزادی کے زبردست مجاہد تھے۔ قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت چھین لی ہے"۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

"یہ بڑی غم ناک خبر ہے۔ آج مسلمان ایک بہت بڑی اہم شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب تھے بلکہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ اُن کی وفات نے ایک بہت بڑی جگہ خالی کر دی ہے"۔

شیخ حسام الدین

شیخ حسام الدین جو چالیس برس سے امیرِ شریعت کے دوست، بھائی اور سیاسی رفیق

تھے انہوں نے شاہ جیؒ کی وفات پر شدید رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"بڑے بھائی اور بزرگ کی موت کا رنج لفظوں میں کون بیان کرسکتا ہے۔ لیکن آج اس برّصغیر کے مسلمان سیاسی رہنماؤں کی اس کھیپ کا سلسلہ ہی ختم ہوگیا ہے جنہوں نے ۱۹۲۰ میں برطانوی شہنشاہیت کو للکارا تھا۔ حضرت امیر شریعت ان عالموں میں سے تھے جنہوں نے جو راہ اختیار کی تھی وہ راستہ ایک لمحہ کیلئے نہیں چھوڑا۔ انہوں نے ہر صعوبت برداشت کی۔ ہر حملہ سہا اور ہر الزام پر مسکرا دیئے لیکن برطانوی شہنشاہیت سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ امیر شریعت کی خطابت نے چالیس برس تک برّصغیر کے عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص متحرک کیا ہے۔ ان کے اندر لڑنے اور ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کرنے میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ آج ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے۔ وہ صدیوں تک پُر نہیں ہوسکے گی"۔

مولانا غلام رسول مہر

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسلام اور آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ ان کی پوری زندگی پُر خلوص قربانیوں کا ایک مرقع ہے کہ خود ان کے بلند مرتبت رفیقوں میں ان کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ انہوں نے تیس چالیس سال ملک وملّت کی بے دریغ خدمت میں گزار دیئے۔ انہوں نے اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہ کیا پوری عمر فقر و درویشی میں گزاری۔ ایسے بے مثل مجاہد قوم کی عزت وعظمت کا بیش بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کی وفات ایک بہت بڑا قومی اور ملّی نقصان ہے وہ یقیناً چند بزرگ ہستیوں میں سے تھے جن کی خالی کی ہوئی جگہ پر ہونا بظاہر ممکن نہیں"

شورش کاشمیری

"برصغیر پاک وہند کا مخلص ترین انسان اٹھ گیا۔ اردو زبان صدیوں تک اتنا بڑا

خطیب پیدا نہیں کر سکے گی ایک ایسا وقت آئے گا کہ تاریخ اس کے احترام کے لئے مجبور ہو گی"!

احمد ندیم قاسمی

"سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے انتقال کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کا وہ زندگی افروز اور ولولہ انگیز باب ختم ہو گیا ہے جس میں آزادی کی خاطر جسمانی اور روحانی صعوبتیں سہنا عبادت کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا وجودِ گرامی اس مقدس جدوجہد کا مجسّم نشان تھا۔ ان کے سیاسی مخالفین کو بھی اس حقیقت کا ہمیشہ اعتراف رہا کہ شاہ جی ہر قسم کی مصلحت اور نوعِ مفاد سے قطعی طور پر بلند تھے۔ ان کا خلوص اتنا بیداغ اور اتنا بے لوث تھا کہ ان کے انتقال کے صدیوں بعد بھی اس خلوص اور اس نیک نیتی کی قسم کھائی جاتی رہے گی۔ تحریکِ آزادی کو شاہ جی کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس میں اس دبدبے اس طنطنے، اس حسنِ اظہار اور اس جمالِ مدعا کی شدید کمی پیدا ہو جاتی ہے جو شاہ جیؒ مرحوم کی شخصیت کے نمایاں عناصر تھے۔

مرحوم تحریک آزادی کے ایک نڈر اور جری رہنما اور ایک آتش نفس شعلہ بیاں مقرر تو تھے ہی۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے ان کی ہمہ جہت شخصیت کے ایک اور پہلو سے بے پناہ عقیدت تھی۔ یہ پہلو ان کی تقریروں کی روانی اور ان کے بیان کی لطافت کی صورت میں نمایاں ضرور ہوتا ہے جبکہ شاہ جی سیاسیات سے ہٹ کر صرف شعر و سخن کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اگر ایک بہت بڑا شاعر بہت بڑی سعادت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا شعر شناس ہونا بھی کم سعادت نہیں ہے اور شاہ جیؒ اتنے بڑے شعر شناس تھے کہ شاعر کی نفسیات کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھے اور شعر کی دا

ہمیشہ اس پہلو سے دیتے تھے جو خود شاعر کی نظر میں اس کی متاعِ عزیز ہوتا تھا، یوں اس کے انتقال سے صرف سیاست کی دنیا ہی نہیں لٹی، شعروفن کی دنیا بھی اجڑ گئی۔ وہ دلآویز حکایت یکایک ختم ہو گئی ہے، جو رومیؒ، غالبؔ اور اقبالؒ نے قائم کی تھی اور وہ رشتہ اچانک ٹوٹ گیا جس کے دم سے ہم ٹیپو سلطان شہیدؒ، سید احمد شہیدؒ کی روحوں کو اپنا نگران سمجھتے تھے۔ خدا ہمیں شاہ جیؒ کی عالی حوصلگی، جرأت مندی، صداقت پسندی اور بے باکی کے ساتھ ساتھ ان کے حسنِ ذوق کی پیروی کرنے کی توفیق بخشے۔"

مولانا داؤد غزنویؒ

"شاہ صاحبؒ جنگِ آزادی کے انتھک سپاہی تھے۔ وہ برطانوی استعمار کے خلاف ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک لڑتے رہے اور ان کی جدوجہد اس وقت تک جاری رہی جب تک انگریز ہندوستان سے چلے نہ گئے۔ شاہ صاحب بہادر سپاہی، مخلص دوست اور ان تھک ورکر تھے۔ ان سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے اس کے پُر ہونے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

مولانا مظہر علی اظہر

"شیرِ معرکہ حریت ہند سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات حسرت آیات پاکستان و ہندوستان کے علمبردارانِ آزادی کے لئے ایک صدمۂ جانکاہ ہے۔ نعرۂ آزادی کی جو گونج حضرت امیر شریعتؒ نے غیر منقسم ہند کے کونے کونے میں پیدا کی وہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ برطانوی استعمار کے مقابلہ میں (فاقض ما انت قاض انما تقضی ھذہ الحیاۃ الدنیا) "پس جو حکم تو نے دینا ہے دے سوائے اس کے نہیں ہے کہ تو اس حیات دنیا کو ختم کر سکتا ہے" کا نعرہ بلند کرنے والا جوانمرد اپنی زندگی کے ایام عزت و وقار سے گزار کر داعیٔ اجل کو

لبیک کہہ گیا ہے۔ لیکن اس نے اپنی زندگی میں ہی اس قاہر و جابر استعمار کا خاتمہ پاک و ہند کی سرزمین میں دیکھ لیا جو اس کی جنگ آزادی کا مطمع نظر تھا وہ جس عزم کو لے کر ۱۹۱۹ء میں میدانِ عمل میں آیا تھا اس نے ۱۹۴۷ء میں بحکم الہٰی اسے کامیاب دیکھا۔ اللہ تعالےٰ اس بطلِ حریت کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اس کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیقِ ارزانی عطا فرمائے۔"

مولانا احتشام الحق تھانویؒ

"مجھے شاہ صاحبؒ کی وفات سے بے حد رنج ہوا ہے۔ اُن کی وفات نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ سارے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے لئے نقصانِ عظیم ہے۔ انہوں نے آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔"

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ صدر دار العلوم کراچی

"مولاناؒ کی وفات سے علماءؒ کی صف میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ عرصہ تک پُر نہ ہو سکے گا۔ ہم آپ کے غم میں پورے طور پر شریک ہیں۔"

ماسٹر تاج الدینؒ انصاری

ماسٹر تاج الدین انصاری نے حضرت قبلہ شاہ صاحبؒ کی وفات پر اشکبار آنکھوں کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ :-

"چالیس برس تک جس کی شعلہ نوائیوں نے مسلمانوں کو گرمایا ہو وہ آج ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ یہ صرف ایک خطیب، ایک عالم، ایک دوست اور ایک بزرگ کی موت ہی نہیں بلکہ ایک دور، ایک تاریخ کی موت ہے، شاید ہی کوئی اس تاریخ کو سمیٹ سکے اور اس کی جزئیات لوگوں تک پہنچائے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو ہمارے دور کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔"

مظفر علی شمسی

سیکرٹری ادارہ تحفظ حقوقِ شیعہ نے اس موقع پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ :-

"امیرِ شریعت عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات سن کر دلی قلق ہوا۔ عاشقانِ رسولؐ کے لئے یہ صدمہ اور جانکاہ ہے۔ ایسا خطیب اور عاشقِ رسول پیدا ہونا مشکل ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے پچیس برس ان کے ساتھ ختم نبوت کی تبلیغ میں گذارے اور میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس مسئلہ پر دلی توجہ دینے والے خطیب کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ وہ حقیقتاً" فنا فی الرسول تھے اور قوم ہزاروں سال اس انمول موتی کے لئے ماتم کرتی رہے گی۔ مسلمانوں کے ہر مکتبِ خیال کو حضرت شاہ صاحب کی موت نے رنج پہنچایا ہے اور اس عظیم شخصیت کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ صدیوں تک پُر نہ ہو سکے گا۔"

علامہ ابو الاسرار حکیم مختار احمد

"اسلام اور مسلمانوں کا سچا شیدائی ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے صدمے کا بوجھ ابھی قوم پر تھا کہ مولانا بخاریؒ کا ایک اور زخم قوم کو مل گیا صدر ایوب قابلِ تحسین ہیں جنہوں نے شاہ صاحب کے معالجے میں خصوصی ہدایات فرمائی تھیں"۔

مولانا کوثر نیازی

"سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کے سیاسی نظریات سے اختلاف ممکن ہے لیکن اس بات سے کوئی شدید سے شدید مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا کہ برِصغیر ہند و پاک کی جدو جہد آزادی کی تاریخ میں ان کی زندگی ایک روشن باب

کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے جانے سے خطابت، سیاست اور مذہب کی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے قحط الرجال کے اس دور میں پُر کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔"

شیخ محمد عثمان آزاد کراچی

روزنامہ "انجام" کراچی و پشاور کے پروپرائٹر اور سابق لیڈر مسلم لیگ کراچی کارپوریشن نے اپنے بیان میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے سانحۂ وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"محترم شاہ صاحبؒ برطانوی سامراج کے خلاف ہمارے برصغیر کی طویل جنگِ آزادی کے نامور رہنماؤں میں سے تھے۔ جن کی پرجوش خدمات اور قربانیاں کبھی فراموش نہ کی جا سکیں گی۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ان مشاہیرِ اسلام میں سے تھے جنہوں نے اپنے جوشِ عمل اور سحرِ خطابت سے قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا نیا خون رواں کیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس کو ہند میں کامیاب بنانے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی بے پناہ جدوجہد اور بے مثالی خطابت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے "خدام کعبہ" خلافت ترک موالات، سائمن کمیشن جمعیت العلماء ہند اور نمک سازی کی سبھی مشہور تحریکات میں مولانا نے پورے جوش و خروش سے حصہ لیا اور بارہا قید و بند کے مصائب برداشت کئے۔ انہوں نے مجلس احرارِ اسلام قائم کی اور اس کے سرخپوش رضاکاروں نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں جس مجاہدانہ جذبہ سے حصہ لیا وہ ہمارے دور کی سیاسی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔"

شیخ عثمان آزاد نے اپنے بیان میں کہا کہ:۔

"تمام سیاسی تعلقات کے علاوہ مرحوم سے میرے گہرے ذاتی تعلقات بھی تھے

اور وہ ہم پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ سے ہمارے راستے بالکل مختلف ہو گئے اور مجھے سید عطا اللہ شاہ بخاری کے سیاسی مسلک کے خلاف لب کشائی کی بارہا ضرورت محسوس ہوئی لیکن ہمارے ذاتی تعلقات میں کبھی فرق نہ آیا۔ مولانا جب کبھی دہلی تشریف لاتے تھے اسی خندہ پیشانی اور محبت کے ساتھ ملتے تھے اور نہ صرف پرائیویٹ صحبتوں بلکہ عام جلسوں میں بھی "انجام" کی صاف بیانی اور بے باکی کی تعریف کرتے۔"

حافظ حبیب اللہ خاں وائس چیئرمین کراچی میونسپل کارپوریشن

"مجھے شاہ صاحب کی وفات پر دلی دکھ ہوا ہے۔ مرحوم نے برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی میں زبردست حصہ لیا تھا۔

اخبارات کی رائے

روزنامہ "جنگ" کراچی

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

ممتاز احرار لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات حسرت آیات کی اطلاع کو ملک کے صرف مذہبی حلقے ہی نہیں قومی حلقوں میں بھی بڑے رنج و غم اور بڑے افسوس و صدمے کے ساتھ سنا جائے گا۔ امیر شریعت گزشتہ چار سال سے برابر علیل چلے آرہے تھے۔ ان کے آخری ایام جن المناک اور اندوہناک مشکلات میں گزرے وہ اپنی جگہ ایک المناک داستان ہے سید عطاء اللہ شاہ بخاری جن کا ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس پورے برصغیر کی ممتاز اور محترم شخصیت کی حیثیت سے لاکھوں انسانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز ہے۔ وہ ایک جادو بیاں مقرر اور برصغیر کی تاریخ کے سب سے زیادہ مؤثر خطیبوں میں شامل تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی ساری عمر قومی خدمت میں گزری۔ پندرہ سال تک وہ قید فرنگ ہی رہے اور سامراجی طاقت کے ساتھ لڑنے میں اپنا تن من دھن لٹاتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک مخلص دیانتدار اصول پرست، اور عوام دوست رہنما کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ حق یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت تھی جو ہم سے جدا ہو گئی۔ ایک مخلص راہنما سے یہ قوم محروم ہو گئی لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور انہوں نے قوم کو آزاد کرنے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لئے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔ ان کی جماعت مجلس احرار نے آزادی سے پہلے جس خلوص اور جذبے سے کام کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ

یادگار رہے گا اور اسے اس ملک کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اعلیٰ العلیین میں جگہ دے اور اس قوم کے نوجوانوں میں وہ خلوص وہ جذبہ اور وہ کردار پیدا کرے جس کا مظاہرہ اس مجاہد نے عمر بھر کیا۔

روزنامہ "امروز" لاہور

"جہادِ آزادی کا ایک اور سالار اٹھ گیا"

"وہ شعلہ نوا زاٹھ گیا ہے جس نے ربع صدی تک سپاہ آزادی کا دل گرمائے اور حوصلہ بڑھائے رکھا۔ دنیائے خطابت کو اس پر ناز تھا اور اس کی یہ صلاحیت ملک و ملّت کی خدمت کے لئے وقف رہی لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا عمل کا دھنی بھی تھا۔ وہی کچھ کہتا جس پر کاربند تھا۔ وہی کچھ کرنے کی تلقین کرتا جو اُس کے نزدیک عامیوں کی سرفرازی کا وسیلہ بن سکتا تھا امیرِ شریعتؒ کے سیاسی عقائد کیا تھے۔ یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں یہ حقیقت ہے، ان سے اختلاف کی گنجائش تھی اور لوگوں نے اُن سے اختلاف کیا۔ البتہ اس بات سے مجالِ انکار نہیں کہ مرحوم دل میں آزادی کی تڑپ رکھتے تھے۔ آزادی کی راہ میں انہوں نے ہر کڑی مصیبت بہ خندہ پیشانی جھیلی۔ آزادی کے نام پر جو بھی افتاد پڑی اسے بطیب خاطر قبول کیا۔ اٹھارہ برس تک قید و بند کی سختیاں سہیں اور زندگی کے اس حصّہ کو حاصلِ زندگی جانا۔ کوئی مصلحت ان کا دامن نہ پکڑ سکی۔ بوریا نشینی پر قانع رہے۔ موٹا جھوٹا پہنا۔ کھانے کے لئے جو مل گیا کھا لیا۔ تکلف، ریا اور تصنع سے کوسوں دور رہے۔ محبت اور شفقت ان ہی کا حصّہ تھی۔ اگر دشمنی بھی کی تو نظریہ کی بنیاد پر۔ ذات کا سوال آیا تو دشمنوں کے لئے بھی دیدہ و دل فرشِ راہ

کئے۔ لیلائے آزادی کے لئے اگر مشقتیں جھیلیں، غیر ملکی حکمرانوں سے ٹکرلی اور اس کی پاداش میں قید ہوئے۔ تو دوسری طرف زندگی کے لطیف پہلوؤں پر بھی نظر رہی۔ یہ نہ تھا کہ سیاست میں ان کی طبیعت کا تنوع چھن گیا ہو۔ ان میں وہ روکھا پن پیدا کر دیا ہو جس کا عموماً سیاست سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ وہ شعر وادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے سخن فہم تھے اور مبدا ٔ فیض سے انہوں نے طبیعت بھی موزوں پائی تھی، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور اپنی تقریر میں شعر یوں لاتے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

اگر ہم ان بزرگوں کی فہرست مرتب کریں جنہوں نے دورِ غلامی میں برطانوی سامراج کے خلاف گفتار و کردار سے رائے عامہ کو بیدار کیا تھا تو امیر شریعت کا نام سب سے پہلے آئے گا، ۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد برصغیر کے مسلمان بری طرح شکستہ دل اور مایوس تھے۔ انہیں احساس کمتری اور احساس شکست سے نجات دلانے کے لئے امیر شریعت ایسے مجاہدوں کی ضرورت تھی جو قلب و دین کو بھی متاثر کریں اور اپنے کردار سے عمل کے لئے مثال بھی قائم کر دیں۔ یہ خدمت انجام دے کر انہوں نے قوم پر بہت بڑا احسان کیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایسے ہی بزرگوں کی جرأت، استحکامت اور ایثار کا انعام ہے کہ ایک محو خواب قوم بیدار ہوئی۔ جہادِ آزادی کے لئے ان گنت رضا کار اٹھے اور ہم غیر ملکیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔

شاہ صاحبؒ کی زندگی کا یہ پہلو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ وہ صرف سیاست کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے۔ اسلام کی تبلیغ کا فرض سعید بھی ہمیشہ ان کی نظروں میں رہا تھا۔ دین فطرت کی سربلندی ان کی سب سے بڑی تمنا تھی اور ناموس رسولؐ کی پاسبانی اور ملت کا اتحاد ان کا مقصدِ حیات تھا۔ زہد و پاکبازی اور مذہب کے گہرے مطالعہ اور علم کی بنا پر وہ امیر شریعت کے منصب پر فائز

ہوئے تھے اور اس منصب پر اپنا حق ثابت کر دیا تھا۔

امیر شریعت رح سید عطا اللہ شاہ بخاری کی رحلت سے قوم ایک بے مثال خطیب اور تحریکِ آزادی کے ایک نمائندے سے محروم ہو گئی ہے اور ایک ایسی شخصیت کھو بیٹھی ہے جس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہیں۔ کہ ایسی شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتیں ہیں۔ یہ واقعی ہی ایک المیہ ہے۔ کہ ہم ایسے بزرگوں سے تو محروم ہوتے جا رہے ہیں جو اپنی دھن کے پکے تھے۔ ثابت قدم تھے ایثار پسند تھے اور دل میں ملت کا درد رکھتے تھے۔ مگر ان کی رحلت سے قومی زندگی میں جو نشستیں خالی ہو رہی ہیں انہیں پُر کرنے کے لئے ہمیں مخلص اور بے لوث شخصیتیں نہیں ملتیں۔ قومیں محض اپنے پیش روؤں کے کارنامے گنوا کر یا ان کا ماتم کر کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ حال کے مسائل مصائب اور ضرورتیں زندہ اصحاب سے قربانی اور ایثار کا تقاضا رکھتی ہیں"۔

مقالہ خصوصی

روزنامہ **کوہستان** لاہور

اِک چراغ اور بُجھا۔۔۔۔۔۔۔

ملک میں سید عطا اللہ شاہ بخاری رح کی موت کی خبر انتہائی رنج و ملال سے سنی جائیگی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو ہماری آزادی کی شاہراہ ربع صدی قبل کے ان تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں سے جا ملتی ہے جہاں چند اولوالعزم انسان درماندہ مسافروں کو آوازیں دے رہے ہیں، کبھی ان کی شعلہ نوائی سے مردہ زندگی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور اپنے حال سے پریشان اور مستقبل سے مایوس مسافر یکایک نئے حوصلوں اور ولولوں سے سرشار ہو کر ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کڑی آزمائشوں کے دور

ہیں ان کے پیچھے چلنے والے قافلوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن ان کوہ پیکر انسانوں کے عزم وثبات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزادی کی تمنا کرنے کے جرم کی پاداش میں ان کے لئے قید خانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کی زبانوں پر سنگینوں کے پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مصیبت، ہر ناکامی اور ہر آزمائش ان کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتی ہے

سید عطا اللہ شاہ بخاری نے فرنگی استبداد کے خلاف اُس وقت عَلَمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ جب سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور آزادی کی خواہش ایک دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی۔

مرحوم برصغیر کے وہ بے مثال خطیب تھے، جن کی شعلہ نوائی نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں آزادی کا ولولہ پیدا کیا تھا۔ ان کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ رات جس میں انہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا کتنی تاریک تھی اور ایمان ویقینِ محکم کی وہ قندیل جو انہوں نے بلند کی تھی کس قدر تابناک تھی۔ اگر ان کے راستے میں آلام ومصائب کے پہاڑ کھڑے تھے تو انہوں نے کس قدر جرأت وپامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا تھا۔

سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی زندگی کا مقصد کروڑوں انسانوں کو آزادی کی تڑپ عطا کرنا تھا۔ اگر ہم آزادی کے ایک نڈر مبلغ کی حیثیت سے ان کے حالات پر غور کریں۔ تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیں ان کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی۔ تو اس وقت سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔ جنہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال قید وبند کی صعوبتوں میں گزارے تھے۔ ہم پورے صدق وخلوص کے ساتھ یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے

اور ہمیں اس سعادت مند قوم کا جذبہ عطا کرے جو کسی بھی حالت میں اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کرتی۔

روزنامہ **آفاق** لائلپور

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات ایک روایت کے انجام کا اعلان ہے۔ وہ روایت کی پیداوار تھے جس میں لفظ گرمیٔ آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا۔ انسانی رشتہ کے اس تصوّر نے خطابت کو جنم دیا۔ جیسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سید عطاء اللہ بخاری ہندی مسلمانوں کے ایک بھرے پرے دور میں پیدا ہوئے تھے۔ اس دور میں قدآور رہنماؤں کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس طرح ایک منفرد مقام پیدا کیا کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو سیاسی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی اور خطابت کو طریقِ اظہار کے طور پر اپنایا جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی دونوں میں ایک مقبول اور مؤثر طریقِ اظہار کا مرتبہ رکھتی تھی۔ یہ خطابت ان کے ہاتھوں میں کم وبیش ایک تخلیقی ذریعہ اظہار بن گئی تھی ان کی ذات کو ہماری خطابت کا آخری سنبھالا کہنا چاہیئے بلکہ ان کے سفرِ آخرت کے ساتھ ساتھ یہ روائیت ہماری اجتماعی زندگی سے سفر کرتی نظر آتی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ایک ایسے خطیب تھے جنہیں بیک وقت مذہبی عالم اور ایک سیاسی رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۲۰ء کو ۲۹ برس کی عمر میں وہ تحریکِ خلافت میں شامل ہوئے۔ مجلس احرار اسلام کے بانیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس جماعت کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے سیاسی نقطۂ نظر سے اختلافات کی بہت

گنجائش ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ ان کے سیاسی خیالات سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی ہم ان کے ذاتی اوصاف اور ان کے ملی جذبہ کی قدر و منزلت کریں۔

روزنامہ "عوام" لائلپور

"کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ"

"امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات کی خبر ایک برق بے اماں ہے جس نے صبر و سکون کے ہر خرمن کو جلا دیا ہے۔ خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری گزشتہ چالیس پچاس سال سے برصغیر پاک و ہند کے اقطاع و اکناف پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی بڑی بڑی مرعوب کن علمی اسناد حاصل نہیں کی تھیں۔ مگر یہ فضیلت انہیں حاصل تھی کہ وہ ہر علمی و ذہنی مجلس میں سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو شعور اس وقت حاصل ہوا، جب غیر منقسم ہندوستان پر انگریزی استبداد پورے زوروں پر تھا۔ انہوں نے علمائے عظام پر حکومت کے عتاب کو دیکھا اور اس سے تڑپ اٹھے۔ انگریز کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ انگریز نے اپنی سنگدلانہ پالیسی سے غیر منقسم ہندوستان ہی نہیں پورے مشرق میں دین اسلام کے ستونوں کو گرانے کی کوشش کی تھی اور اس نے ان بندگوں پر عتاب و عذاب کے دروازے کھولے تھے جو ہر اعتبار سے قابلِ احترام تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایسے وقت میں اپنی عملی زندگی شروع کی۔ خدا تعالٰی نے انہیں خطابت و تقریر اور اثر آفرینی کی دولتِ وافر عطا کی تھی۔ وہ گھنٹوں ہزاروں کے مجمعے کو مسحور رکھ سکتے تھے اور منٹوں میں لوگوں کو جدھر چاہتے بہا لے

جاتے تھے۔ ان کے الفاظ موتیوں کی طرح دمکتے تھے اور فقرے پھولوں کی طرح ہوتے تھے جن کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی تھی۔

مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے قید و بند اور سزا و تعزیر کی مصیبتیں بارہا جھیلیں مگر ان کے پائے استقلال میں کبھی جنبش نہ آئی تھی۔ ان کا انداز اور مسلک قطعی درویشانہ تھا۔ انہیں کسی سے ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ البتہ وہ اپنے تمام عقائد میں شدید تھے اور جسے ان کے عقائد سے اختلاف ہوتا وہ اسے خدا کا دشمن سمجھتے تھے اس لئے اُس کے خلاف شدت اختیار کرتے تھے مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ میں یہ وسعتِ قلبی موجود تھی۔ وہ اپنے کسی اقدام یا فیصلہ کو جب غلط سمجھ لیتے اس پر اصرار نہ کرتے۔ چنانچہ پاکستان کے متعلق آپ نے یہی طریقہ اپنایا تھا۔

مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے دفتر مطلوب ہے وہ ایک جاذب شخصیت تھے۔ خطیب اعظم اور مقرر شیوہ بیان ہونے کے باوجود وہ انتہائی منکسر المزاج تھے۔ کارکنوں کا ان سے بڑھ کر اور کوئی ہمدرد نہ تھا انہوں نے مصیبتیں برداشت کیں مگر اپنے لئے نہ کبھی رحم کی بھیک مانگی نہ وسائل چاہے۔ غریب اور مخلص کارکنوں کے لئے انہوں نے کوئی مدد کرنے میں کبھی تامل سے کام نہیں لیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم نہایت سلجھے ہوئے اور سخن فہم بزرگ تھے۔ اشعار کے ہزارہا نگینے ہر وقت ان کے ساتھ رہتے اور وہ جب چاہتے محفل احباب میں یا مجمع عام میں کسی بہترین نگینے کو الفاظ کی انگشتری میں جڑ دیتے افسوس کہ ان کی سیماب صفت طبیعت نے انہیں جم کر بیٹھنے اور اپنے وسیع ذخائر کو مدوّن کرنے کی فرصت نہیں دی۔ اس طرح کوئی جامع کتاب ان سے یادگار نہیں ہے۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کی نصف صدی کی تاریخ کلی اور کامل طور پر ان کی شخصیت سے متاثر ہے۔

سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات ایک بڑا ملی صدمہ ہے۔ آج ہر پاکستانی کو محسوس ہو رہا ہے کہ شاہ جی کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر

ملت پاکستان پر یہ بہت بڑی آزمائش کا دور ہے۔ ابھی مولوی عبدالحق کی وفات کی خبر فضاؤں میں تھی کہ ایک اور صدمہ عظیم ملک کو برداشت کرنا پڑا یہ لوگ جو بجائے خود ایک تاریخ ہیں ایک ایک کرکے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور ملت پاکستان کو اس قابل بنائے کہ ان کے رہنما ان مرحومین کی خوبیوں کو اپنا کر اس خلا کو پورا کر سکیں۔

ہفت روزہ "چٹان" لاہور

سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چوں مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشاخت دریغ

جی چاہتا ہے آج جی بھر کر رو لوں، بالآخر وہ بھی رخصت ہو گیا جو اس زمانے میں اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھا جس نے مرتے دم تک فقر و استغنا کے پرچم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کی زندگی بہت سی زندگیوں کا مجموعہ تھی۔ جس کا وجود ایک تاریخ تھا، جو ایک عہد تھا ایک ادارہ تھا۔ ایک انجمن تھا، ایک تحریک تھا غرض ایک ایسا محور تھا جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے وہ اس پایہ کا خطیب تھا کہ اس کی آتش بیانی کا لوہا اس کے حریف بھی مانتے تھے، اردو زبان نے اس مرتبہ کا خطیب نہ کبھی پیدا کیا اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گا۔

وہ ایک مجاہد عظیم تھے انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق سے کبھی گریز نہیں کیا

۶۲ برس کی عمرِ مستعار میں انہوں نے ۱۲ سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے میں بسر کیے اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں شاید ان کے ارادوں کی بابت شک رہا ہو۔ مگر انہیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ وہ اس مدرسۂ فکر کے علمبردار تھے جن کی بنیادیں محمد قاسم نانوتویؒ اور محمود الحسنؒ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں۔ تمام زندگی ایک ہی مشن رہا کہ برصغیر سے انگریز کی حکومت کیونکر نکالی جاسکتی ہے۔ وہ علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ میرے سامنے دو چیزیں ہیں اولاً انگریز کی حکومت جہاں سے ختم ہو جائے۔ ثانیاً وہ ختم نہیں ہوتی تو میں اس کے خلاف تبلیغ کرتے کرتے تختہ دار پر لٹک جاؤں۔

پھر ان کا دل عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جلوہ گاہ تھا۔ حضورؐ کے عشق میں وہ اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا یہی عشق تھا۔ اس عشق ہی نے انہیں ختم نبوت کے عقیدہ کی حفاظت کا مجاہد بنا دیا۔ پھر جس عشق و ایثار کے ساتھ انہوں نے اس راستے کا سفر کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بہت سی غلطیوں کو معاف کرتے رہے مگر دو چیزوں سے نہ وہ کبھی سمجھوتے پر آمادہ ہوئے اور اس کے مقابلے میں وہ عفو و درگزر کو پسند کیا کرتے۔

اوّل ——— انگریز کی غلامی اور اس کے گماشتوں کا دوستانہ

دوم ——— ختم نبوت کے قزاقوں کا تعاقب

وہ کہا کرتے تھے میں توشۂ آخرت کے طور پر یہی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ وہ یہی لے گئے۔

وہ اپنے عہد کے ابوذر غفاریؓ تھے۔ فقر و فاقہ ان کا شعار تھا۔ انہوں نے کبھی کسی تحریک و تنظیم قائد و جماعت کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے وہ خلافت و ضمیر کی سودا بازی کے بازار سے ہی ناآشنا تھے۔ ان پر زمانے نے بہت سا

گرد و غبار پھینکا اور خود فروشوں نے الزامات کے چولہے سے چنگاریاں لے کر بارہا ان کی دستارِ فضیلت پر پھینکیں۔ مگر وہ تہمتوں کے بازار سے کنکریاں کھاتے ہوئے نکل گئے، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بارگاہ میں سرخرو ہو گئے ہیں۔ ان شاء اللہ قیامت کے روز بھی سرخرو ہی اٹھیں گے۔

تذکروں میں ہے کہ جب امام تیمیہؒ کا جنازہ اٹھا تھا تو پورا شہر اشکبار ہو کر نکل آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مظلومیت نے لوگوں کے دلوں کو احاطہ کر لیا ہے اور بے چین عوام وقت کی اس عظیم الشان دولت کو آخری خراج ادا کرنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔

شاہ جیؒ کا جنازہ بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ ایک انسان جو عمر بھر مہاجر رہا اور جب امرتسر سے مہاجرت کر کے ملتان میں پناہ گزین ہوا تو ایک کچا مکان کرائے پر لے کر اس میں رہا۔ بارہ برس اس میں رہا۔ آخر وہیں اس کی روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔ وہیں سے اس کا جنازہ اٹھا۔ لیکن فقیر کا جنازہ شاہوں کے جنازے کو مات دے گیا۔ ایک شخص جو بالطبع فقیر تھا۔ جس کے دامن میں اللہ کے خوف اور رسولؐ کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کو ہمیشہ زنجیروں نے سلام کیا۔ جس کا سیم وزر کے تہہ خانوں میں ذکر تک مفقود رہا، جس نے ایک لحظہ کے لئے بھی اخباروں اور کتابوں کے صفحوں میں اپنا نام ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی جو آخر تک چٹائی پر بیٹھا، لیٹا اور سوتا رہا جو اس مقام میں بھی رسولؐ کی زندگی کا عکس تھا اور جب اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو ایک اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان لوگ اشکبار چہروں کے ساتھ اس کی میت کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں ایک تہائی لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ لوگوں نے سینے پیٹ لئے۔ کیا اس فقیر نے یہ آنسو خریدے تھے؟ وہ تو شاید دوسرے وقت کی روٹی خریدنے پر بھی قادر نہ تھا۔

یہ سب کچھ اس کی بے غرضی اور بے نفسی کا صلہ تھا۔ وہ اگر لاہور،

لائلپور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ میں رحلت فرماتے تو ہجوم کئی لاکھ تک پہنچ جاتا۔ لیکن دورافتادہ اور پسماندہ ملتان میں بھی ان کا ماتم اس شدت سے کیا گیا کہ ملتان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔ ہم نے اپنے اس وطنِ عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علمائے اور فضلاء آغوشِ لحد میں اتارے گئے۔ لیکن شاہ جی کی میت کے گرد عشاق کا جو ہجوم تھا اور لوگوں نے جس بے اختیاری کے ساتھ ان کا ماتم کیا۔ فقراء و علماء کی پوری صف اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب دماغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوصف انہیں اس اقلیم میں جو وقار اور اقتدار حاصل تھا۔ اس کا اقرار و اعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رفاقت، اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ سر دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان کے فدائیوں کا قبیلہ ملک کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا وہ کبھی پُر نہ ہوگا خطابت بیوہ ہو گئی لوگ کبھی اس طرف سے گزریں گے جہاں شاہ جی گرجتے اور گونجتے رہے ہیں۔ تو دلوں سے ہُوک اُٹھا کرے گی کہ یہاں کبھی وہ مردِ مجاہد صرصر بہ آغوش راتوں میں اپنا چراغ جلایا کرتا تھا جس کی نوا پرائیوں پر قیاس ہوتا تھا۔ کہ قرونِ اولیٰ کا کوئی غزوہ نقاب الٹ کر سامنے آ گیا ہے۔ یا پھر لوگ غارِ حرا کے اردگرد کھڑے ہیں۔ قرآن اتر آیا ہے اور قند و نبات کی طرح گھلتا ہوا کانوں کے راستے سے دلوں کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح بیٹھتا چلا جا رہا ہے لیکن اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

ہفت روزہ لیل و نہار لاہور

بطلِ حریت

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ رحلت کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون عجیب المیہ ہے کہ اس دور میں جو بھی بزرگ اٹھتا ہے اس کے ساتھ ایک تہذیب کی علامت اٹھ جاتی ہے۔ ایک درخشاں روایت کی شمع گل ہو جاتی ہے اور اس کے مرنے سے ایک دور مر جاتا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم کی صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تقریر کا جادو استعارہ نہیں مرحوم کی ذات میں ایک حقیقت تھا۔ وہ اپنی سحر بیانی سے لاکھوں کے مجمع کو گھنٹوں محوِ حیرت رکھتے ہنساتے، رلاتے تڑپاتے اور آمادۂ عمل کرتے۔ اتنا بڑا شعلہ نوا اور معجز بیان اب پیدا نہ ہو گا اور وہ اس لئے کہ بقول ایک معاصر "وہ روایت جس میں لفظ گرمی آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا اور وہ روایت جس نے خطابت کو جنم دیا۔ کمزور ہو چکی ہے۔

شاہ صاحبؒ مرحوم نے سیاسی تحریکات کے ایک بھرے پُرے دور میں آنکھ کھولی۔ جلد برصغیر کے طول و عرض میں برطانوی غلامی کے خلاف بغاوت اور حریت کی علامت بن گئے۔ یہ موقعہ ان تحریکات پر تبصرہ اور افراد کے سیاسی مسلک پر تنقید کا نہیں۔ لیکن شاہ صاحبؒ مرحوم کیلئے یہ کچھ کم نہیں کہ مسلمان قوم جو ماضی کی شاندار روایات کے تصور میں گم تھی یا حال کی شکست اور درماندگی میں مبتلائے خواب سے بیدار کیا۔ ان میں جوشِ عمل پھونکا اور کچھ کر گذرنے کی ترغیب دی۔ مسلمانوں میں حقیقت پسندی اور خود اعتمادی پیدا کرنے

کی جو کاوش سرسید مرحوم اور ان کے رفقاء نے کی تھی، تحریک آزادی کے عہد شباب میں اسی کاوش کی تکمیل اپنے طور پر شاہ صاحب نے بھی کی۔ مرحوم کے سیاسی مسلک سے بجا طور پر اختلاف کیا گیا۔ لیکن ان کے جذبۂ حریت سے انکار ممکن نہ تھا۔ لوگ مرحوم کی شعلہ بیانی پر عش عش کرتے تھے حالانکہ وہ محض ان کی ذات کی نمود تھی۔ وہ آزادی کے انتھک سپاہی تھے اور جب قربانیوں کے دعوے کرتے اور کڑی آزمائشوں کو دعوت دیتے تو رسماً یا لطف بیانی کیلئے نہیں۔ مرحوم جب یہ کہتے کہ تین چوتھائی زندگی ریل میں (شہر شہر کا دورہ کرتے) کٹ گئی اور ایک چوتھائی جیل میں، تو حقیقت بھی یہی ہوتی تھی، وہ محض ایک سیاسی رہنما نہ تھے، ایک مکمل شخصیت تھے، مجاہد بھی اور رند بھی، جس طرح لاکھوں کے مجمع میں گرجتے، اسی طرح احباب کی محفل میں چہکتے اور اپنی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری سے ہر ایک کا دل مٹھی میں رکھتے، شعر و ادب کا مذاق نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ محبت و مروت، اخلاص اور ایثار رواداری اور دوست داری کا پیکر تھے اور یہ صفات اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔

ہفت روزہ "اقدام" لاہور

آہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل پاکباز

اگلے روز ملتان میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے انتقال سے تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ مرحوم و مغفور ایک سچے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی انگریز کے خلاف جہاد میں بسر کی، وہ اس حد تک تن، من، دھن سے اس جہاد میں شریک تھے

کہ انہیں تاریخ کے ایک نازک موڑ پر یہ بات سوچنے کی بھی فرصت نہ ملی کہ انگریز کے بوریا بستر گول کر جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے بعد جب ہندوستان میں سیاسیات جدید کا دور شروع ہوا تو متوسط طبقہ کی فعال سیاسی جتھہ بند مجلس احرار اسلام جس میں شاہ صاحب ایک گرم اور تڑپتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتے تھے، اجتہادی غلطی کا شکار ہو گئے اور تحریک پاکستان کا یہ ہراول دستہ بننے کی بجائے سیاسی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو گئے اگر اس وقت مسلم لیگ کو مجلس احرار اسلام ایسی فعال جتھہ بند اور جانبدار جماعت کی تائید حاصل ہو گئی ہوتی تو کم از کم پنجاب کی شہ رگ کے قریب سے تقسیم نہ ہوتی خیر یہ تو اب تاریخ کی بات ہے اور آئندہ کا مؤرخ ہی لکھ سکے گا کہ کس نے کہاں پر غلطی کھائی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اردو اور پنجابی کے بے مثل خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ انہیں اختلاف عقیدہ کے علاوہ احمدیوں سے غیر فانی کد کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بانئ سلسلہ نے انگریز سلطنت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا (خدا تعالیٰ ابر رحمت کی طرح ہمارے لئے انگریزی سلطنت کو دور سے لایا اور ہم پر اور ہماری ذریت پر یہ فرض ہو گیا کہ اس مبارک گورنمنٹ برطانیہ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں۔ ازالہ اوہام صفحہ ۱۳۲)

اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولہ باری جاری رکھی اور دونوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔

ہمارے خیال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس وقت جبکہ ان کے بیشمار نیاز مند طول و عرض ملک میں موجود ہیں ان کی مدد سے ان کی ایک مستند سوانح عمری تیار کی جائے جس میں لفاظی کی بجائے اس دور کی تاریخ کے پس منظر میں ان کی صحیح حیثیت کا یقین کیا جائے۔ ایسی کتاب لکھنے کے لئے

شاعر کی ضرورت نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم تاریخ کے اصولوں سے آگاہ ہو۔

ہفت روزہ "قندیل" لاہور

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

برّصغیر ہندوپاک کے ممتاز دینی رہنما اور مشہور سیاسی لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ طویل علالت کے بعد ملتان میں انتقال فرما گئے ہیں اِنا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ گزشتہ پانچ ماہ سے شدید بیمار تھے نشتر ہسپتال ملتان اور پھر لاہور میں زیر علاج رہنے کے باوجود جب آپ کی بیماری میں کوئی افاقہ نہ ہوا تو حکیم عطاء اللہ نے یونانی علاج شروع کیا۔ لیکن مرض الموت کا کیا علاج ——— سید صاحب اپنے مولا کو پیارے ہو گئے

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک سحر بیان، شعلہ فشاں اور آزادیٔ وطن کے ایک جرار سپاہی تھے۔ ان کی تمام زندگی قومی خدمت میں گزری۔ زندگی کے آخری ایام میں ان پر فالج کے کئی حملے ہوئے پھر ملتان میں وہ ایک ایسے بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر تھے۔ جو فالج کے مریضوں کی رہائش کے بالکل ناقابل تھا۔ شاہ صاحب انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ بُرے حالات کا مقابلہ کرتے رہے صدرِ پاکستان کو جب ان کی آخری بیماری کا علم ہوا تو انہوں نے ماہرین کو ہدایت کی کہ وہ شاہ صاحبؒ کا طبی معائنہ کریں اور علاج میں خاص دلچسپی لیں لیکن یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور آخری وقت آن پہنچا۔

صدرِ پاکستان نے شاہ صاحب کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پیغام تعزیت میں کہا ہے کہ "سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات حسرت آیات

سے مجھے بے حد رنج ہوا ہے۔ آپ جنگ آزادی اور اسلام کے ایک زبردست مجاہد تھے اور قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت جدا کر دی۔ خدا آپ کی روح کو جوارِ رحمت میں جگہ دے

ہفت روزہ "ایشیا" لاہور

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا صدمہ ابھی تازہ تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ۷۲ سال کی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ شاہ صاحبؒ کو مرحوم لکھتے وقت کلیجہ کانپتا ہے لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے۔ وہ اپنے معین وقت پر آتی ہے اس سے فرار کسی کو ممکن نہیں۔

شاہ صاحبؒ مرحوم گزشتہ پانچ ماہ سے شدید علالت کا شکار تھے مختلف ہسپتالوں میں قابل ڈاکٹروں کی زیرِ نگرانی ان کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن شاہ صاحب کی حالت روز بروز گرتی گئی اور آخر ۲۱ اگست کو شام چھ بج کر ۱۵ منٹ پر ان کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم جامع کمالات شخصیت تھے۔ برصغیر میں اس پائے کا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ جنگ آزادی میں شاہ صاحبؒ نے نمایاں طور پر حصہ لیا اور عمر عزیز کا ایک حصہ تقریباً ۱۸ سال جیل میں بسر کئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری زندگی بھی کیا تین چوتھائی ریل میں کٹی اور ایک چوتھائی جیل میں۔

ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ صاحب مرحوم نے اپنی شعلہ بیانی تقریروں کے ذریعہ عوام میں وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی جو بہت کم لیڈروں کو

نصیب ہوئی۔ ان کی تقریر سراسر اعجاز تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع کرتے اور فجر کی نماز تک تقریر جاری رہتی۔ ان کی تقریر کے دوران کسی شخص کو جلسے سے اٹھ کر جانے کا ہوش نہ رہتا تھا۔ مخالف سے مخالف کے مجمع کو شاہ صاحب اپنی سحر بیانی سے مسحور کر لیتے تھے۔ ہزارہا افراد کو بیک وقت رلا دینا اور ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

۱۹۲۹ء میں مولانا ابو الکلام آزاد کے مشورے کے مطابق مجلسِ احرار قائم کی گئی۔ شاہ صاحبؒ مرحوم جماعت کے روحِ رواں تھے۔ چوہدری افضل حق صاحبؒ مرحوم کو جماعت کا دماغ اور شاہ صاحبؒ کو زبان سمجھا جاتا تھا۔ جرأت، ہمت اور استقلال میں شاہ صاحب مرحوم اپنی مثال آپ تھے۔ غیرتِ حق اور روحِ رواں ایمانی سے ان کا سینہ ہمیشہ معمور رہتا تھا۔ اسلام کے بنیادی عقائد اور نبیٔ اکرمؐ کی آبرو پر جب کوئی دشمنِ دین ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو شاہ صاحبؒ بے دھڑک اس کے آگے سینہ سپر ہو جاتے —— اور پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ مخالف کتنا طاقت ور اور با اثر ہے۔ برطانوی سامراج کے ہاتھوں انہیں بڑی صعوبتیں سہنا پڑیں۔ لیکن ان کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہ ہوئی

قیامِ پاکستان کے بعد وہ عملاً سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لیکن تحریکِ ختمِ نبوّت کے دوران وہ پھر اسلام کی آبرو بچانے کے لئے میدان میں اتر آئے تھے۔ شاہ صاحبؒ ایسی جامعِ کمالات شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ پرانے بادہ کش ایک ایک کر کے اس محفلِ ہستی سے اٹھتے جاتے ہیں اور کوئی ان کی جگہ پُر کرنے والا نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور

آہ! امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ

۲۱ر اگست ۱۹۶۱ء کو یہ جگر خراش خبر سارے ملک نے انتہائی رنج و قلق سے سنی کہ ملک کے مایۂ ناز فرزند بطل جلیل، مجاہد اعظم، جنگ آزادی کے شیر دل رہنما، محب و محبوب اولیاء اللہ شمع ختم نبوت کا پروانہ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

حضرت شاہ صاحبؒ حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سر پر پڑتی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی، وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھی کہ کفر ضلالت کے جس خرمن پر گرتی اس کو راکھ کر دیتی۔ وہ وطنِ داؤدی کا اس دور میں نمونہ تھے کہ دوست و دشمن سب کو مسحور کر لیتے وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی جس کی ایک آواز پر ۵۰ ہزار رضاکار آزادئ کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر چل پڑتے۔ جن کے ایک اشارے پر متحدہ ہندوستان کے برطانوی جیل خانے بھر جاتے۔ جن کا داخلہ قادیان ایوانِ مرزائیت میں زلزلہ ڈال دیتا جو علم و عمل، شعر و ادب، اخلاق و مزاح، ظرافت و لطافت، شریعت و طریقت اور رزم و بزم کے مجمع کمالات تھے۔ وہ جو تقریر خطابت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ جہاں کہیں آپ کی تقریر ہوتی، مسلمان تو مسلمان ہندو سکھ آپ کی زبان سے قرآن کی تلاوت سننے آجاتے، مخالفین تقریر سے محظوظ ہونے کو شریک ہوتے اور خدام و معتقدین پروگرام بننے کے لئے حاضر ہوتے۔ آپ کے توشۂ آخرت کے لئے

یہ قابل فخر سامان بس ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عطا اللہ تو عطا ــــ اللہ ہے۔

۲۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ کے آپ منظورِ نظر تھے اور ایک بار مزاح فرمایا

"یہ میرے مرید نہیں پیر ہیں"۔

۳۔ خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کشمیری نے آپ کو امیر شریعت بنایا۔

۴۔ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ نے آپ کو چھاتی سے لگایا اور دل میں جگہ دی۔

۵۔ شیخ السلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتئ اعظم کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت شیخ السلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سب اکابر امت اور اولیائے ملت آپ کو محبوب رکھتے۔

قطب زماں حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سراجیہ مجددیہ، نقشبندیہ کندیاں شریف نے جب سنا کہ امیر شریعت پر سکندر حیات کی حکومت نے مسلح بغاوت کا مقدمہ بنایا ہے تو وہ بے چین ہو کر متوجہ ہوئے اور اللہ تبارک وتعالے سے دعا مانگی۔ غرض کہ حضرتِ امیر شریعتؒ سب کی آنکھوں کا تارا تھے۔ اب وہ اپنے حقیقی آقا کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ جہاں زود یا بدیر ہم سب کو پہنچنا ہے اور جہاں سے پھر کبھی کسی کو واپس نہیں آنا ہے شک یہ سانحہ ایک قومی حادثہ ہے۔ صاحبزادگان محترم کو ہم سے زیادہ صدمہ ہے۔ ان کے متعلقین بلکہ سارے ملک کو صدمہ ہے۔ مگر رونے والو ان پر نہ روؤ۔ وہ اپنا سفر کامیابی سے طے کر چکے۔ اپنی بےسامان بدنصیبی پہ آنسو بہاؤ کہ اس نازک دور میں ہم ان مبارک ہستیوں سے محروم ہو گئے۔ اپنے ایمان کی خیر مناؤ۔ ان نفوس قدسیہ کے مشن کو زندہ کرو۔ علمائے حق کا ساتھ دو۔

اسلاف امت کا اتباع کرو اور اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کر کے اس کی رضامندی کے راستوں پر چل پڑو۔ بے شک وہ حضرات ہم سے جدا ہو گئے مگر ان کی روشن کی ہوئی مشعل ابھی تک روشن ہے۔ اس کی روشنی میں چلو۔ اللہ تعالےٰ آپ کی مدد کرے گا۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ان کے فرزندانِ رشید کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

ہفت روزہ **"الاعتصام"** لاہور

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

---

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب کو ملتان سے یہ اندوہناک اطلاع موصول ہوئی کہ محفلِ وعزم وعمل کا وہ چراغِ روشن جو کئی سال سے مرض وضعف کے مسلسل اور شدید جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا، ۷۲ سال جنا گستریوں کے بعد ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ کی شام کو چھ بج کر ۵۵ منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

یعنی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے فالج، لقوہ اور یرقان کی تکلیف دہ بیماریوں میں متواتر چار سال مبتلا رہنے کے بعد اس دنیائے فانی کو الوداع کیا اور اپنے بےشمار دوستوں، مریدوں اور معتقدوں اور مستفیدوں کو محزون و ملول چھوڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ۴ ربیع الاول ۱۳۱۰ ہجری ۱۸۹۱ عیسوی کو جمعہ کے روز ہندوستان کے صوبہ بہار کے مشہور شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے،

دودھیال کی طرف سے ان کا نام عطاء اللہ اور ننھیال کی طرف سے شرف الدین رکھا گیا۔ باپ کا نام ضیاء الدین احمدؒ اور دادا کا نام نورالدین احمدؒ تھا ان کا نسب نامہ ۳۶ ویں پشت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ جب فہم و شعور نے انگڑائی لی اور سن و سال کے عقل و خرد کی کچھ منزلیں طے کیں تو امرتسر میں آ گئے اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔ ان کی سیاسی اور عملی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ بڑا ہنگامہ خیز اور پُر آشوب تھا۔ اور تحریک خلافت پورے شباب پر تھی۔ اس زمانہ میں شاہ صاحبؒ مرحوم امرتسر کی ایک مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ منصب ذمہ داری کے اعتبار سے عام طور پر ان کے زیر بحث اگرچہ مذہبی مسائل ہی رہتے تھے۔ لیکن اس ابتدائی دور میں ان کی تقریریں بڑی روانی بڑا زور اور بڑا اثر تھا۔

مولانا سید داؤد غزنویؒ کا شمار اس دور میں خلافت کے معروف اور ذمہ دار لیڈروں میں ہوتا تھا۔ شاہ صاحبؒ کی تقریر کی تاثیر پذیریوں اور ان کے انداز بیاں کی بے پناہیوں کی اطلاع مولانا غزنویؒ کو پہنچتی رہتی تھی۔ اسی اثناء میں ایک روز انہوں نے شاہ صاحبؒ کو یاد فرمایا اور کہا کہ مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلیں۔ خطابت و امامت کی محدود ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد کریں۔ ملک کے وسیع تر اور غیر محدود مفادات کا جائزہ لیں اور سیاسیات کی دنیا میں قدم رکھیں۔ آج ملک کو آپ کی بے لوث اور مخلصانہ خدمات کی بے حد ضرورت ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب میدان میں اترے اور اپنی تمام تر خدمات ملک و قوم کے حوالے کر دیں۔ یہ ان کی بھرپور اور پرجوش جوانی کا زمانہ تھا۔

سیاسیات کے کوچے میں قدم رکھتے ہی ان کی تقریریں ہونے لگیں اور نتیجۃً ۳ سال کے لئے جیل بھیج دیئے گئے۔ اس کے بعد ان پر سنگین سے سنگین مقدمے

پڑے. زبردست آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، پھانسی اور عمر قید تک کے منصوبے بنائے گئے. بارہا جیل گئے اور عمر عزیز کے کئی سال زندانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں گذار دیئے. آخری دفعہ وہ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کی مشہور اور ہمہ گیر تحریکِ ختم نبوت میں ماخوذ ہوئے.

مدیر "الاعتصام" کو ایک سلسلہ میں مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی کی معیت میں مارچ ۱۹۵۶ء میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا. وہ لاہور تحفظ ختم نبوت کی ایک کانفرنس میں تشریف لائے تھے اور دہلی دروازے کے باہر دفتر احرار میں قیام فرما تھے. مولانا تاج محمود نے تعارف کرایا تو اس عاجز کو اپنے پاس چارپائی پر بٹھایا اور الاعتصام کی تعریف کی. بعض مضامین کی تو بہت تحسین کی اور فرمایا میرے کہنے سے ملتان کی تحفظ ختم نبوت نے ان کو کتاب کی شکل میں شائع کیا. مختلف عنوانات پر باتیں ہوتی رہیں. مولانا داؤد غزنوی کی خیر و عافیت دریافت فرمائی اور کہا میں تو ایک گوشہ نشین فقیر تھا اور مجلس میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دیتا تھا. خلافت کے زمانہ میں مجھے داؤد غزنوی ہی مسجد کے گوشۂ عافیت سے کھینچ کر سیاست کے خار زار میں لے آئے تھے.

شاہ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے. ان کی موت تنہا ایک شخص اور ایک فرد کی موت نہیں ہے. ایک عہد، ایک دور اور ایک جماعت کی موت ہے، وہ ایسا بے تاب و مضطرب دل لے کر آئے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے قرار ہو جاتا تھا. ان کی آواز اتنی پُر درد اور پُر سوز تھی کہ برصغیر پاک و ہند اور عالم اسلام کے ہر سانحہ میں بے اختیار بلند ہو جاتی تھی. ظلم کے خلاف ان کی صدا اتنی موثر تھی کہ ایک آن میں صور اسرافیل بن جاتی تھی. ان کی آنکھیں اسلام اور اہلِ اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آلود ہو جاتی تھیں. مسلمانوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف بھی نہ وہ خود برداشت کر سکتے تھے اور نہ یہ گوارہ کرتے تھے کہ کوئی برداشت کرے. ناممکن تھا کہ وہ مظلوم کو ظلم و ستم

کے شکنجہ میں جکڑا ہوا دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ ملک وقوم کی تکلیف کے وقت خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ انہوں نے غلام آباد ہندوستان میں انگریز کے خلاف زبردست ٹکر لی اور اس کی حکومت کو اپنا سب سے بڑا حریف قرار دیا۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر ماتم کناں ہوتے ہیں اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت پر بھی مضطرب ہو ہو گئے۔ انہوں نے عراق، ایران، نجد حجاز مصر، شام، ٹرکی، بیت المقدس غرضیکہ ہر خطہ ارض کے مسلمانوں کی مظلومیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے

یہی وجہ ہے کہ آج صرف ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں، پورا عالم اسلام ان کا عزادار ہے اور ہر مسلمان کی آنکھیں ان کی موت پر اشکبار اور ہر شخص کا دل محزون و غمگین ہے۔ وہ قادر الکلام مقرر تھے جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ وہ بلبلِ خوش نوا تھے جس کے ترانے اب کبھی نہ سنے جائیں گے۔ وہ آتش زباں خطیب تھے جو قیامت تک نہ بول سکیں گے۔ وہ بہادر اور بیخوف انسان تھے جو اب کبھی اپنی بہادری کے جوہر نہ دکھا سکیں گے۔ وہ جنگ آزادی کے ایسے بے باک اور نڈر سپاہی تھے جو ہمیشہ میدانِ جنگ میں دشمن سے لڑتے تھے اور اب ایسے گرے ہیں کہ کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔ وہ ایک مردم آفریں عہد اور خاص دور کی پیداوار تھے۔ اب نہ وہ دور واپس آئے گا اور نہ اس قسم کے اولوالعزم اور باہمت وجری لوگ پیدا ہوں گے۔

"الوداع عطاء اللہ شاہ بخاریؒ الوداع"

پنجاب یونیورسٹی کا اُردو مجلہ محور ستمبر ۱۹۶۱ء

اِک دیا اور بُجھا۔۔۔۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات اِس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

البتہ اس لئے کہ نئی نسل یہ تو جانتی ہے کہ برک نے برطانوی پارلیمنٹ میں کیا کچھ کیا۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ روم میں انطونی نے کس طرح اپنی خطابت سے بروٹس کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ شاہ صاحبؒ نمازِ عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے تھے اور ہزاروں سامعین رات بھر بیٹھنے کے بعد فجر کی نماز ان کی امامت میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کی خطابت کا سحر راہ چلتے لوگوں کو کھینچ کر جلسہ گاہ میں لے آیا کرتا۔

ایک بار انجینئرنگ کالج مغلپورہ کے انگریز پرنسپل کے خلاف لاہور میں جلسہ ہو رہا تھا۔ رات کے دو بجے تقریر کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے فیصلہ کیا کہ ابھی موچی دروازہ سے جا کر سب لوگ کالج کے سامنے مظاہرہ کریں اور دس ہزار کا مجمع نعرے لگاتا ہوا شاہ صاحب کے پیچھے چل پڑا۔

یہ آواز کا جادو اس لئے تاریخی حیثیت اختیار نہ کر سکا کہ انطونی کی طرح انہیں کوئی شیکسپیئر نہ ملا۔ اور پھر اس لئے بھی کہ بعد میں ان کا سیاسی مسلک انہیں مسلم لیگ سے دور لے گیا اور وہ تحریکِ حصولِ پاکستان سے کٹ گئے، وہ غلط راستہ پر تھے، مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی دیانت، خلوص اور بے غرضی شبہ سے بالاتر تھی۔

ان کی درویشی اہلِ بصیرت کے لئے آج بھی چراغِ راہ ہے۔

ہفت روزہ "لاہور" لاہور

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات دراصل سابق علاقہ پنجاب کے (عوامی نفسیات کے ماہر) ایک ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے جس کا بدل شائد ہی پیدا ہو سکے۔ پنجاب کے عوام کو تو خاص طور پر ان کی تقریروں کا ایسا چسکا بلکہ (چسکا) تھا کہ وہ نظریاتی مخالفت کے باوجود رات گئے تک بیٹھ کر آپ کی تقریریں سننے اور

چسکے لیتے رہتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل جب احرار کا کانگریس سے ساجھا ہو چکا تھا اور یہ جماعت اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کو نا ممکن بنانے کے لئے ہر ممکن سعی میں مصروف تھی، احرار نے حسب معمول شاہ صاحب کے حسنِ خطابت کو آلہ کار بنایا اور اُس دور کی سیاست میں عملی دلچسپی لینے والے گواہ ہیں کہ مسلم لیگ کے کتنے ہی شیدا و والاان کی تقریریں اسی ذوق و شوق سے سنتے آتے تھے جتنے ذوق و شوق سے وہ اپنے ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔

نجی زندگی میں شاہ صاحبؒ نہایت ہی سادہ اور پرخلوص بذلہ سنج اور ملنسار انسان تھے۔ جماعت احرار نے ہمیشہ آپ کی سادگی کو اپنی سیاسی اغراض کیلئے اکسپلائٹ کیا اور وہ اپنی ان کمزوریوں یا صفات کے باعث ہمیشہ اکسپلائٹ ہو جاتے رہے شاہ صاحبؒ کے گلے میں ایک عجیب و غریب قسم کا رس تھا جس کا حسن و جذب عام طور پر اس وقت ظاہر ہوا کرتا تھا جب اپنی تقریروں سے پہلے تلاوت کلام پاک کیا کرتے تھے۔

میں ان علمائے حق کا پرچم لئے پھرتا ہوں جو ۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے تھے، ربّ ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں، لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے وہ شروع سے تماشائی ہیں اور تماشا دیکھنے کے عادی ہیں، اس پر نہیں میں مجدد الف ثانی کا سپاہی ہوں، شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا متبع ہوں، سید احمد شہید کی غیرت کا نام لیوا اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی جرأت کا پانی دیوا ہوں میں ان پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پابہ زنجیر صلحائے امّت کے لشکر کا ایک خدمت گزار ہوں جنہیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں، ہاں! ہاں!! میں انہی کی نشانی ہوں۔ انہی کی صدائے بازگشت ہوں، میری رگوں میں خون نہیں، آگ دوڑتی ہے، میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں قاسم نانوتویؒ کا علم لے کر نکلا ہوں میں شیخ الہند کے نقش قدم پہ چلنے کی قسم کھا رکھی ہے، میں زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا میرا اس کے سوا کوئی مؤقف نہیں، میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ برطانوی سامراج کی لاش کو کفنانا یا دفنانا ــــــــ

(سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ)

شاہ جی کے سوانحی خطوط

حسب و نسب

ننھیال کی طرف سے شرف الدین احمد نام تھا، ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ۔ باپ کا نام ضیاء الدین احمدؒ، دادا کا نام نور الدین احمدؒ (نور اللہ مرقدہٗ) چھتیسویں پشت میں آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے ملتا ہے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے سید ابو ذر غفاری خاندانی اکابر اور ان کی مختلف شاخوں کے حالات فراہم کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ سواطع الالہام (شاہ جی کے فرزند کی تالیف) میں جو اشارات موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان میں بعض بڑی ہی جلیل القدر ہستیاں گزری ہیں — مثلاً حضرت شاہ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ، سلطان مراد خاں ثانی والی کشمیر کے مرشد سید محمد شاہ بخاریؒ، سلطان زین العابدین فرمانروائے کشمیر کے مرشد سید عبد الغفار بخاری — جن بزرگ نے سب سے پہلے دہلی میں قدم رکھا، سید اکمل الدین بخاری تھے جو حضرت شاہ غلام علی دہلوی سے بیعت تھے ان سے خرقۂ خلافت لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پنجاب کے ضلع گجرات موضع سرہالی میں وارد ہوتے۔ اور تا حینِ حیات وہیں رہے۔ شاہ جی کے دادا سید نور الدین بخاریؒ مرشد کی تلاش میں حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی کے آستانہ پر حاضر ہوئے تو وہ سرو قد کھڑے ہو گئے۔ کچھ دنوں مہمان رکھا۔ پھر پروانۂ خلافت اور سندِ ارشاد دے کر رخصت کیا۔

پیدائش

شاہ جی یکم ربیع الاول سنہ ۱۳۱۰ھ ہجری (سنہ ۱۸۹۱ء عیسوی) کو جمعہ کے دن نو بجے تڑکے

پٹنہ میں پیدا ہوئے، آپ کی والدہ سیّدہ فاطمہ اندرابی لکھنؤ طبیہ کالج کے فارغ التحصیل حکیم سید احمد اندرابی کی صاحبزادی تھیں۔ حکیم صاحب امورِ دین سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ قدرت نے ان کی آواز میں کوٹ کوٹ کر جادو بھر رکھا تھا۔ ان کے والد یعنی شاہ جی کے پرنانا میر سیّد عبدالسبحان اندرابی کشمیر سے اٹھ کر عظیم آباد پٹنہ چلے گئے اور وہیں آباد ہو گئے تھے۔

شاہ جی کی نانی حضرت باقی باللہ قدس سرہٗ کی نواسی تھیں۔ میر عبدالسبحان صاحب اندرابی پٹنہ جاتے وقت شاہ جی کے بزرگوں کے ہاں گاؤں میں ٹھہرے تھے۔ مہمان نوازی سے تعلقات کا رشتہ استوار ہو گیا۔ چنانچہ جب شاہ جی کے والد اپنے چچا صاحبان کے ساتھ تجارت کے لئے پٹنہ گئے تو حکیم سید احمد شاہ اندرابی ہی کے ہاں قیام کیا، ان کے زہد و تقویٰ اور قناعت کو دیکھ کر انہوں نے شاہ جی کے والد کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ رہائش کے لئے ایک وسیع مکان دیا جس کا نام خانہ باغ تھا۔

شاہ جی چار برس کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد نے شاہ جی کو پالا پوسا حتیٰ کہ نو برس تک ساتھ سلاتے رہے۔ شاہ جی دسویں سال کے پیٹے میں تھے کہ حافظ سیّد ضیاءُ الدین پٹنہ سے اپنے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات میں چلے آئے۔ وہاں دوسرا عقد کیا، ۱۹۴۹ء میں واصل بحق ہوئے۔ دوسری والدہ ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔ ان میں سے ایک فرزند حافظ عطاالرحمٰن ہیں جو گجرات میں بزازی کا کاروبار کرتے ہیں۔ اگلی والدہ سے ایک ہمشیرہ بھی تھیں۔ یہ دونوں بہن بھائی بھی پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں شاہ جی نے پنجاب کا رخ کیا۔

تعلیم و تربیت

شاہ جی نے ابتدائی کتابیں اپنے نانا ہی سے گھر میں پڑھی تھیں، زبان و بیان بھی گھر ہی سے حاصل کئے۔ بڑی بوڑھیوں سے روزمرہ و محاورہ سیکھے۔ شاد عظیم آبادی اور ان کے ہم نشینوں سے ادبی ذوق میں رونق پیدا ہو گئی۔ اپنے ماموں سے رات گئے تک بیت بازی کیا کرتے تھے، جس سے شاعری کا مذاق نکھرتا رہا اور فارسی میں طاق ہو گئے۔ وہیں خواجہ عنبر

کی مسجد میں ایک مولوی صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر یہاں آکر اپنے گاؤں سے قریب ہی ایک دوسرے گاؤں راجو وال میں قاضی عطا محمد صاحب کے مدرسہ میں پڑھتے رہے ـــــ ۱۹۱۲ء میں امرتسر گئے۔ حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی علیہ الرحمۃ سے فقہ حضرت مفتی محمد حسین نور اللہ مرقدہٗ سے علم حدیث اور حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن پاک کی تفسیر پڑھی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن حالی مقیم چاٹگام سے بخاری شریف کا مطالعہ کیا۔ پھر اس کے بعد مبداءِ فیاض نے علم و نظر کے راستے اس طرح کھولے کہ وقت کے ساتھ تمام ہندوستان اور پاکستان عش عش کر اٹھا۔

سلطان عبد المجید خاں سلطان ترکی کی بیٹی کے بچوں کے اتالیق ایک عرب قاری سید عمر عاصم تھے کسی بات پر وہاں سے چلے آئے، اور پٹنہ میں خواجہ عنبر کی مسجد میں قرآن پاک کا درس دینے لگے ـــــ قدرت نے ان کے لحن کو جادو کر دیا تھا۔ شاہ جی کی روایت کے مطابق جب وہ کلام پاک کی تلاوت کرتے تو ہندو، مرد، عورتیں اور بچے بھی ان کی خوش آوازی کا لطف لینے کے لئے مسجد کے دروازے پر آ کھڑے ہوتے اور ان سے دم کرایا کرتے تھے عمر عاصم بے حد خوددار تھے۔ کسی سے پھوٹی کوڑی نہ لیتے تھے۔ اپنے گھر میں گھڑیوں کی مرمت کیا کرتے، اور اس طرح روٹی کمایا کرتے تھے۔ شاہ جی نے پہلے پہل ان کی قرأت کا چربہ اتارا، انہوں نے سن پایا تو بہت محظوظ ہوئے، پھر باقاعدہ مشق کراتے رہے، آخر کویت چلے گئے وہاں جب انہیں مولوی عبد اللہ ڈار سے یہ معلوم ہوا کہ ان کا شاگرد عطاء اللہ شاہ تمام ملک میں مشہور ہو چکا ہے اور اس کا مرتبہ و درجہ یہ ہے تو بہت خوش ہوئے ـــــ

شاہ جی راوی تھے، کہ والد مرحوم دو تین بجے شب جگا دیتے ـــــ دو پارے منزل سنتے، اور سلا دیتے، پھر نماز فجر کے لئے جگاتے، بعد میں سبق ہوتا، یہی دن تھے جب ان کے حافظہ نے جلا پائی اور ان کا دین سے شغف پختہ سے پختہ تر ہو گیا ـــــ

اولاد

شاہ جی کے نو بچے تھے۔ چار لڑکے اور ایک لڑکی بفضلِ تعالیٰ حیات ہیں۔ سب سے

بڑی لڑکی سیدہ صفیہ خدیجہ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئی۔ شاہ جی جیل میں تھے۔ سوا ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

دوسری سیدہ صالحہ بانو ایک برس زندہ رہ کر ۱۹۲۵ء میں اللہ سے جا ملیں۔ تیسری بیٹی سیدہ ام کلثوم سوا سال کی عمر میں رخصت ہو گئی۔ اُن دنوں شاہ جی دیناج پور جیل میں قید تھے۔ سب سے چھوٹی بیٹی سیدہ سامہ بانو خان گڑھ کی غریب الوطنی کے زمانے میں ۱۹۴۸ء میں وفات پا گئی ——

شاہ جی کے بڑے صاحبزادے حافظ سید عطا المنعم جو اب سید ابوذر غفاری کے نام سے معروف ہیں، مدرسہ احرارِ اسلام ملتان کے مدرس اعلیٰ ہیں۔ باقی بچے دینی مدرسوں کے طالب علم ہیں، آپ کے داماد سید وکیل شاہ شرافت و نجابت کا پیکر متحرک ہیں —— ایم اے کیا ہے اور منٹگمری کے کسی کالج میں لیکچرر ہیں ——

سیاست میں شرکت ——

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ملک کو رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ اور مارشل لا کے روپ میں جو انعام ملا تھا۔ اس نے خلافت کی بربادی کے ساتھ ایک احتجاج اور غصّہ کی شکل اختیار کر لی، ملک کا رجحان ہی بدل گیا۔ نئے خیال اور نئی لیڈر شپ کا در وا ہو کھل گیا۔ شاہ جی نے اسی دور میں سیاسیات کی وادی میں قدم رکھا —— مولانا سید محمد داؤد غزنوی انہیں محلہ کی مسجد سے اٹھا کر سیاسیات کی اسٹیج پر لے آئے جس سے ان کا آفتاب لعجلت تمام نصف النہار کو پہنچ گیا۔ خود مولانا داؤد غزنوی کے الفاظ میں شاگرد —— استاد سے منزلوں آگے نکل گیا۔

"الہلال" اور "ستارہ صبح" کا مطالعہ ان کے دل پر اپنے نقش جما چکا تھا۔ شاہ جی کی زبان نے اپنا نقش جمانا شروع کیا —— دیکھتے آنکھوں وہ ملک کے سب سے بڑے خطیب اور لسّان بن گئے۔ پھر انہوں نے علالت شدید کے آخری ایّام تک کمر ہمّت نہ کھولی —— ملک کی تمام سیاسی جماعتیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، ان کی

مرہونِ خطابت رہیں۔ وہ اس میدان میں بجائے خود ایک لشکر کی حیثیت رکھتے تھے ـــــ ان کا تنہا وجود کئی وجودوں کا مجسمہ تھا۔ مجلس احرار تو ان کی معنوی اولاد تھی۔

دینی کارنامے:ـــــ

انہوں نے مسلمانوں کی دینی خدمات کا ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے کہ اس سے ایک دفتر قائم ہوتا ہے، وہ تنہا انسان تھے جنہوں نے اپنے ہمراہیوں سمیت اور اسّی فیصد تنہا بدعات رسومات اور ان کے خاندان کی دوسری مکروہ شاخوں کا چالیس برس تک ڈٹ کر مقابلہ کیا حتیٰ کہ ایک خاص نسل کے دماغوں میں ان کی خانہ ویرانی کا سامان پیدا کر دیا۔ وہ کسی طرح بھی انگریزی سیاست اور اس کے گماشتوں پر اعتبار نہ کرتے تھے ـــــ مرزائیت کے خلاف جہاد ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو بارگاہ الٰہی میں ان کی بخشش اور بلندی درجات کا سب سے افضل زادِ راہ ہے۔

شاعری کا شوق:ـــــ

شعر کہنے کا شوق بھی تھا۔ ندیمؔ تخلص کرتے۔ بعض خوبصورت شعر بھی کہے ہیں۔ لیکن اس میدان کے کھلاڑی نہ تھے۔ نانا مرحوم سے یہ شوق ورثہ میں پایا، شادؔ عظیم آبادی کی صحبتوں میں پروان چڑھا۔ شعر کہنا شروع کیا تو مولانا محمد دین غریبؔ امرتسری سے تلمذ اختیار کیا۔ میانوالی جیل میں سالکؔ صاحب سے مشورہ سخن کیا، پھر جناب طالوتؔ سے استفادہ فرمانے لگے لیکن یہ ان کی جیتی تصویر کا ایک معمولی سا پہلو ہے۔

لباس و خوراک:ـــــ

تمام عمر موٹا جھوٹا پہنا۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ آخری دنوں میں تہبند باندھتے تھے فرماتے میاں (حضورؐ) بھی یہی باندھا کرتے تھے۔ کھانے پینے میں کوئی امتیاز نہ تھا جو ساگ ستو ملا کھا لیا، اس معاملہ میں فقر و درویش کا مرقع تھے ـــــ دستر خوان پر جو موجود ہوتا، خدا کا

نام لے کر بڑے مزے سے کھاتے تھے۔ چائے خود بنا کر پیتے اور صحیح چائے پیتے تھے۔ پان بھی خود ہی بناتے ——— اور کھاتے تھے ——— رہن سہن کا عالم بھی یہی تھا۔ ایک فقیر کی جھونپڑی اور ان کے مکان میں کوئی فرق نہ تھا ——— اس اعتبار سے وہ قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کا صحیح نمونہ تھے۔

محاسن و محامد :———

زندگی میں بہت سے رہنما دیکھے جو مارِخ النظر طبیعت اور حسن و خوبی کے بےشمار گوشوں میں منفرد تھے۔ مگر ایک بات شاہ جی کے بارے میں پختہ یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ قرونِ اولٰی کے مجاہدین ہی میں سے ایک تھے، رسول اللہ کے عہد میں ہوتے تو ابوذر غفاری خالد بن ولید اور بلال حبشی (رضی اللہ تعالٰے عنہٗ) کی جدوں سے بھی آگے نکل جاتے۔ رسول اللہ کا عشق ان کے خون میں گردش کرتا تھا ——— انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی غیبت نہیں کی، اور نہ سنی، کبھی کسی جماعت کا روپیہ نہیں کھایا۔ کبھی اپنے آپ کو فروخت نہیں کیا، کبھی انگریز دوست نہیں رہے۔ کبھی دوستوں سے دغا نہیں کی، جس سے ایک دفعہ چوٹ کھائی پھر اس کا رخ نہیں کیا لیکن برا اس کا بھی نہیں چاہا۔ انتقام اللہ پر چھوڑ دیتے تھے کینہ اور بغض ان میں نام کو نہیں تھا ——— ان کی مجلس میں ہر شخص بغیر روک ٹوک کے آ جا سکتا تھا۔ صوفیائے کے مختلف سلسلوں سے باطنی سا ربط رکھتے تھے۔ ہر چمن کے پھولوں کا احترام کرتے۔ سب سے پہلے حضرت پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمتہ کے ہاتھ پر بیعت ارشاد کی۔ ان کا وصال ہو گیا تو حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت ہو گئے۔ ان کی مجلس میں بڑے ادب سے بیٹھا کرتے تھے ——— مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت جہاد بھی کر چکے تھے ——— حضرت علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے پانچسو دوسرے علمائے کے ساتھ انہیں امیر شریعت نامزد کیا، بلکہ لاہور میں خود ان کے ہاتھوں بیعت ہوئے تھے ——— یہ گویا ایک دینی عظمت کی طرف سے ان کی دینی صفات کا اعتراف تھا ———

بیماری:۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت تھک چکے تھے۔ تمام عمر کی جدوجہد کا حاصل مسلمانوں کی ناشکرگزاری کا وہی انعام ملا تھا جو اس سے پہلے تمام غیرت مندانِ اسلام کو ملتا رہا ہے۔ مختلف قیدوں کی طویل مدت نے (غالباً دس برس مجموعی قید ہوتی ہے) اس کے جسم کو بیماری کا گودام بنا دیا تھا۔ خود کہا کرتے تھے نصف عمر ریل میں کٹ گئی نصف جیل میں۔ فالج گرا اس پر قابو پالیا۔ پھر کئی امراض عود کرتے رہے ——— ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ قدرت نے انہیں دو سو برس جینے والا جسم دیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے جسم سے بغاوت کی ہے، جس کا نتیجہ موجودہ امراض ہیں ———

موت سے کوئی چار سال قبل آپ کو ذیابیطس کا مرض لاحق ہوا تھا۔ پھر اچانک فالج گرا، لیکن علاج ہوتا رہا اور آثار کبھی اُدھر اور کبھی اُدھر ہوتے رہے۔ چند ماہ پہلے بھی مرض نے حملہ کیا، صورت حال تشویشناک ہوگئی۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان نے نشتر ہسپتال ملتان کو ہدایات جاری کیں کہ ان کا علاج گراں سے گراں قیمت پر بھی کیا جائے ہر ممکن علاج کیا گیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ——— شاہ جی کے عقیدتمند لالہ مولوی محمد افضل اور مولوی محمد اکرم مالکان سلطان فونڈری بادامی باغ لاہور انہیں لاہور لے آئے۔ اپنے بنگلہ پر رکھا۔ اور کرنل ضیاء اللہ سے علاج کرایا۔ روپیہ پانی کی طرح خرچ ہوتا رہا۔ مگر آفتاب کو ڈوبنا تھا۔ ڈوب کر رہا۔ ۱۴ اگست ۱۹۶۱ء کو حالت دگرگوں ہوگئی۔ ۲۰ اگست کو موت نے پَر پُرزے نکالنا شروع کیے۔ ۲۱ اگست کو چھ سوا چھ بجے شام روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ۲۲ اگست کو دن کے پہلے اوقات میں انہیں عام قبرستان میں دفنا یا گیا۔ حکومت کی طرف سے کمشنر نے قلعہ میں مزار کے لئے امتیازی جگہ پیش کی مگر مناسب یہی سمجھا گیا کہ عام قبرستان میں دفن ہوں۔ ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں نے جنازے میں شرکت کی۔ گھر سے جنازہ گاہ تک انسانوں کا ہجوم در ہجوم تھا ———

بلاشبہ پاکستان میں شروع سے اب تک کسی فقیر کا جنازہ اس ٹھاٹھ سے نہیں اٹھا

اور نہ کسی اتنے آزردہ دل انسان نے اس طرح وفات پائی کہ تمام ملک ماتم کدہ بن گیا اور بے روک آنسوؤں کے ساتھ اس انسان کو سپردِ خاک کر دیا گیا. جس نے زندگی بھر اپنی خطابت کے معجزوں سے لاکھوں لوگوں کے دل و دماغ کو زندہ کیا تھا.

بخاری کے سیاسی کردار کا تاریخی پس منظر

(۱)

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے عروج کا دور آٹھویں صدی کے آغاز میں محمد بن قاسم کے فتح سندھ سے شروع ہوتا ہے۔ کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمان اس برصغیر کے مختلف حصوں میں برسراقتدار رہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کا قدم اس خطۂ زمین کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ زراعت و تجارت، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن کے میدان میں ترقی کی نئی راہیں نکلیں اور یہ برصغیر جیسا کہ اوراق شاہد ہیں دنیا کے متمدن ممالک کی صف اول میں آگیا۔ مؤرخین اس خطے میں مسلمانوں کے زوال کا دور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے شمار کرتے ہیں۔ اس عظیم فرزند ملت کی موت نے مسلمانوں کو قومی تنزل اور زوال کی راہ پر ڈال دیا مسلمانوں کے تساہل و تغافل، عیش و عشرت، قومی بے راہ روی ترک و تازی اور کشور کشائی کی روایات سے روگشتی نے ان کی عظیم الشان سلطنت کو پاش پاش کر دیا۔

(۲)

دورِ زوال ہی میں بہت ہی دردمند شخصیتوں نے قومی سربلندی کے احیاء کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں۔ ان مساعی کی کہانی ملت کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور اپنے دامن میں بہت سی عبرتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ اس سرزمین میں اسلامی سطوت کی سب سے بڑی مخالف سکھ تحریک تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بندہ سنگھ بیراگی کی سرکردگی میں ان لوگوں نے ان بستیوں کو تاراج کرنا شروع کیا۔ ہمعصر مؤرخ خوافی خاں نے منتخب اللباب میں

ان واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ سرہند، جالندھر، دوآب اور بٹالہ وغیرہ میں بندہ نے جس طرح مسلمانوں کے جان ومال، عزت وآبرو اور ان کے مساجد ومدارس اور کتب خانہ کو تباہ کیا۔ وہ ایک عبرت ناک داستان ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زوال پذیر قوم تخریبی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی عیش پرست مغل امرا بندہ کے پرجوش اور خونخوار رضاکاروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور برسوں اسلامیانِ پنجاب ان کی تعدی کا شکار رہے۔ آخر کار فرخ سیر نے عبد الصمد خاں کو جو نقشبندی شیوخ کے ایک معتقد خاندان کے فرزند تھے۔ اور جن کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سے ملتا ہے۔ صوبۂ لاہور کا ناظم مقرر کیا۔ عبد الصمد خاں کچھ ترکی الاصل سپاہیوں کے ہمراہ وسط ایشیا سے نئے نئے تلاش معاش کے لئے مغلیہ ہند میں آئے تھے۔ ان میں اور ان کے متوسلین میں ابھی اسلامی کردار کی آن بان باقی تھی۔ ناظم لاہور کی حیثیت سے دن ان کے تیغ زنی اور امورِ جہانبانی میں گزرتے تھے اور راتیں ریاضت وعبادت میں بسر ہوتی تھیں۔ بندہ سنگھ بیراگی کے مقابلے میں انہوں نے بہادری کے جوہر دکھلائے اور جس گروہ کے سامنے عیش پرست اور توہم پسند مغل جرنیل ناکام تھے۔ اس لشکر کو اس خواجہ زادہ احراری نے نیست ونابود کر دیا اور پنجاب میں امن وامان قائم کیا۔ تقریباً نصف صدی تک اس خاندان کے افراد، لاہور، ملتان اور کشمیر کے صوبوں میں موروثی حاکموں کی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہے۔ یہ حکام دہلی کے مغل تاجداروں کے ماتحت شمار کئے جاتے تھے۔ اس نصف صدی میں پنجاب میں مسلمانوں کی ثقافت اور تہذیب نے ترقی کی اور امن وامان کی فضا میں خلقِ خدا نے آرام کا سانس لیا ۱۷۵۳ء میں میر معین الملک کی اچانک موت اور احمد شاہ درانی کے لگاتار حملوں اور دہلی کی مغل سلطنت کی کمزوری نے حالات پھر خراب کر دیئے اور پنجاب میں سکھوں کو ابھرنے اور مسلمانوں کو برباد کرنے کا موقع مل گیا۔

ایک سکھ حکومت میں مسلمانوں کو جن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی تفصیل کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی یہ اس کا نفس مضمون ہے۔

ان حالات نے ملت کو ایک دردمند فرزند سید احمد شہیدؒ اور ان کے معتقد رفقا کو بے چین کر دیا اور انہوں نے برصغیر کے ان حصوں میں جو آج پاکستان کہلاتے ہیں طاغوتی قوتوں

کی تسخیر اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے جہاد کیا۔ ہماری آزادی کی تحریکوں میں یہ تحریک بے حد اہم ہے۔

(۳)

سید احمد شہید کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق اور احیائے سنتِ نبوی تھا۔ اس مقصد کی خاطر وہ سکھوں اور انگریزوں سے یکساں جہاد کے حامی تھے۔ پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی جو دُرگت بن رہی تھی۔ اس کے حالات بے حد ہوشربا اور جانگداز ہیں۔ عام مسلمانوں میں سکت نہ تھی کہ وہ ان مظالم کے خلاف آواز بلند کر سکیں۔

رنجیت سنگھ کی حکومت کے خلاف یہ واحد جہاد ہے جس میں مسلمانوں نے تلوار اٹھائی مگر ناکام رہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سکھ حکومت کے زوال کے بعد پنجاب میں زمام اقتدار انگریز کے ہاتھ میں آگئی۔ اگرچہ انگریز کا طریق کار مختلف تھا۔ اس نے امن و امان قائم کر کے سماجی اور اقتصادی ترقی کی نئی راہیں بھی نکالیں۔ لیکن مسلمانوں میں قومی شعور اور ملی جذبہ بیدار نہ ہو سکا۔ مغربی تعلیم انھیں الحاد کی طرف لے جانے لگی، پادریوں کے مدرسوں نے انہیں اسلام سے بیگانہ کر دیا اور نہ صرف بہت سے مسلمان مرد بلکہ عورتیں حلقہ بگوش مسیحیت ہو گئیں۔ ان حالات میں یہاں انجمن حمایت اسلام لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے دردمند بانیوں کے پیش نظر ایسے مدارس کا قیام تھا۔ جہاں مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم و عقائد سے بھی طلبہ کو روشناس کرایا جائے تا کہ وہ اپنے دین و ایمان کو قائم و برقرار رکھ سکیں۔

(۴)

انیسویں صدی میں پنجاب میں کوئی خالص سیاسی تحریک نہ ابھر سکی۔ یہ دور علمی، اقتصادی اور

سماجی ترقی کا تھا۔ برصغیر میں عملی سیاست کا زمانہ پہلی تقسیم بنگال سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے قائد سید احمد خاں مرحوم تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے باز رکھا اور انہیں علمی اور سماجی ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان شکست خوردہ، کمزور، پس ماندہ اور انگریز کے معتوب تھے۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ کچھ عرصہ وہ عملی سیاسیات سے علیحدہ رہ کر اپنی حالت بہتر بنائیں۔ مگر بیسویں صدی کے حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس حکمت عملی کو خیرباد کہہ کر میدان میں نکل آئیں۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہمارے وہ مجاہدین جنہیں وہابی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے سرگرم عمل تھے۔ ان میں وہ لوگ تھے جو سید احمد شہید سے فیض یاب تھے اور شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے بہرہ ور تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ سید احمد شہید جہاد اور ایثار کا پیکر تھے اور یہ جذبہ انہوں نے اپنے نامور اسلاف سے ورثے میں پایا تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ وہ مجاہد ملّی اور امام انقلاب تھے جنہوں نے منصور عباسی کی استبدادی حکومت کے خلاف جہاد کر کے نظام خلافت راشدہ کے احیا کی کوشش کی اور اس مبارک کوشش میں ان کے خاندان نے وہ قربانیاں پیش کیں کہ آج بھی اوراق تاریخ ان سے درخشاں ہیں ع

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

اس مجاہد کا نام محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن مجتبےٰ ابن علی مرتضےٰؓ ہے اور انہیں نفس ذکیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۵) ---

پنجاب میں سیاسی اور ملّی شعور کی بیداری اقبال اور ظفر علی خاں کی تحریکوں کی مرہون منت ہے۔ تحریک خلافت کے طوفان نے مقررین اور مجاہدین کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس نے ملک کے گوشے گوشے میں گھوم پھر کر اپنی تقاریر سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور انہیں اس امر کا احساس دلایا:

اٹھو وگرنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ان قائدین نے قوم میں ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کیا اور ہزاروں نوجوان شمع آزادی پر پروانہ وار قربان ہونے کو میدان عمل میں نکل آئے۔

ہماری تاریخ کا یہ دَور بے حد اہم ہے۔ اسی خلافت کی تحریک نے مسلمانوں کی ملی خودی کو بیدار کیا۔

(۶)

سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ اسی دور کی ایک مقتدر شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی خداداد خطابت وفصاحت کو مسلمانوں کے سیاسی شعور کی تربیت کے لئے وقف کر دیا۔

سید صاحب ہمارے مقتدر و محترم سید احمد شہید کی طرح حسنی سادات میں سے ہیں خانوادہ عالیہ عرب سے نکل کر بخارا میں آباد ہوا۔ ترکستان کی سرزمین وہ متبرک سرزمین ہے جو خلیفہ ولید اُموی کے دَور میں حضرت قتیبہ بن مسلم کی مساعی سے آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز سے مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور صدیوں اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا۔ بہت سے عرب خاندان یہاں آباد ہوئے اور دعوت و ارشاد کی متعدد مسندیں یہاں آکر آراستہ کی گئیں۔ ترکستان ہماری ایک اور دکھتی ہوئی رگ ہے۔ یہ خطہ جو راسخ العقیدہ اور ایثار پیشہ مسلمانوں کا وطن اور اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ آج نظام اشتراکیت کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ بقول اقبال ؎

بدستِ ما نہ بخارا نے سمرقند است
دعا بگو ز فقیراں بہ ترکِ شیرازی!

اسی بخارا کی نسبت سے سید عطاءاللہ بخاری کہلاتے ہیں۔ یہ شہر ہمارے ادب میں بےحد مقبول ہے اور ہماری قومی ثقافت کا اہم مرکز رہا ہے۔ حافظ شیرازی کا یہ شعر کیا موقع پر یاد آیا ہے ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا ٭ بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

مسلمانوں کے بہت سے خاندان ترکستان اور ایران سے آکر کشمیر میں آباد ہوئے اور پھر اسی خطۂ رنگ ورامش سے وابستہ ہو گئے ان میں سید عطاء اللہ کا خاندان بھی تھا جو بخارا سے کشمیر چلا آیا۔ کشمیر اور پنجاب کے ضلع گجرات میں ان کے اجداد فقر وروحانیت کی ہاشمی روایات کے علمبردار رہے۔ نانا ان کے حکیم سید احمد اندرابی جو ایک باکمال طبیب بیان کئے جاتے ہیں۔ صوبہ بہار کے دار الحکومت پٹنہ میں مقیم تھے۔ اسی قدیم تاریخی شہر میں سید صاحب ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے جس کے لحاظ سے شاہ صاحب کی عمر اس وقت ستر برس ہوتی ہے جو اتنی کچھ زیادہ نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حوادثِ روزگار نے تھکا دیا ہے اور جسمانی صحت نے اس مجاہد کی تاریخی عظمت کا ساتھ نہیں دیا۔ اور وہ خطیب جو بے تکان گھنٹوں فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتا اور اپنوں پرایوں سے داد و تحسین وصول کرتا ہے آج اس کے متعلق یہ منحوس خبر آتی ہے کہ گویائی کی قوت سے محروم ہو چکا ہے۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

(۲)

اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں کہ سید عطاء اللہ بخاری کے سوانحی خطوط مرتب کئے جائیں اجمالاً یہ عرض کیا جاتا ہے کہ جب تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا آپ امرتسر میں مقیم تھے۔ رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کے واقعات اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد بلادِ اسلامیہ کے حالات نے ان کی حساس طبیعت پر اثر ڈالا اور آپ ایک مذہبی واعظ سے سیاسی مقرر بن گئے جوانی کا عالم تھا۔ قدرت نے خوش روئی کے علاوہ خوش گلوئی کی نعمت بھی دے رکھی تھی۔

چند دنوں میں ان کی شہرت اکنافِ ہند میں پھیل گئی۔ انہوں نے زندگی کے بہترین لمحات مسلمانوں کے سیاسی شعور کی بیداری اور برطانیہ کے جیل خانوں میں بسر کئے۔ بخاری کی تقریر کسی بستی میں ہو اور لوگ رات گھروں میں سو کر گزاریں۔ یہ ناممکن تھا۔

لاہور میں ان کی تقاریر دہلی دروازہ کے باہر ہوا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لوگ دن بھر

انتظار کرتے رہتے اور سرِ شام ہی باغ میں لوگوں کے سر ہی سر نظر آنے لگتے، حالانکہ تقریر کہیں عشاء کے بعد شروع ہوتی۔

کتنی مبارک ہے وہ زندگی جو قال اللہ اور قال الرسول کی روشنی میں قوم کو جھنجھوڑنے میں اور اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کرنے میں بسر ہوئی ہو۔

پنجاب کے مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں جن اکابر کی مساعی کا ہاتھ ہے۔ اس میں سرِ فہرست بخاری کا نام ملے گا۔

بخاری صرف مولوی، صوفی یا سیاسی خطیب ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے روابط ایسے لوگوں سے بھی رہے ہیں، جن کی سیاسی یا ثقافتی راہیں ان سے مختلف تھیں۔ جب میں نے پہلی بار یہ پڑھا کہ ظفر، تبسم، سالک اور تاثیر وغیرہ سے ان کے مراسم و روابط تھے اور تاثیر مرحوم کے ہاں ان کا آنا جانا تھا تو یہ امر بے حد عجیب معلوم ہوا۔ سمجھا تنگ نظر یا جوشیلے مذہبی اور سیاسی کارکن نہیں بلکہ ایک فراخدل اور وسیع القلب انسان ہیں جو کامل خلوص سے ہر ایسے انسان سے ملتے رہے ہیں جس میں کوئی جوہر ہو۔

اللہ۔ اللہ وہ محفلیں کس قدر دلفریب ہوں گی، جن میں اقبال شعر سناتا تھا اور بخاری ان سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ تحریکِ خلافت کا زور تھا تو پنجاب کے خلافتی قائدین نے مجلسِ احرار کے نام سے ایک جماعت منظم کی۔ یہ جماعت مسلمانوں کی الگ تنظیم کی داعی ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادی میں کانگریس کی ہمنوا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو اس کے اسلامی جذبے سے ہمیشہ خوف کھاتا رہا اور احراری رضاکاروں کی کلہاڑی کو تشدد کا نشان بتاتا رہا۔ انگریزی دَور کے لاہوری ہندو اخبارات کے فائل اگر مل جائیں تو ان سے اس امر کی تائید ہو سکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے مکتبِ فکر کی مکمل تاریخ لکھی جائے تو احرار کی مساعی اس تاریخ کا ایک اہم باب ہوگا۔ اسلامیانِ پنجاب کے متوسط طبقے کو انگریزی حکومت سے بیزار کرنے اور ان میں آزادی کی سچی تڑپ پیدا کرنے میں ان کا کردار بہت اہم ہے اس جماعت کے کئی کاموں سے اور اس کی حکمتِ عملی کے کئی پہلوؤں سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس نے ایثار پیشہ قومی کارکنوں اور سیاسی خطیبوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جن کی مساعی تاریخ تحریکِ آزادی کا ایک زریں باب ہے۔

شیخ حسام الدین

شاہ صاحب اور اُن کا عہد

یہ کیا دستِ اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے!
چمن سے توڑنا پھول اور ویرانے میں رکھ دینا

شاہ جی

شاہ جی اس دنیا سے گئے اور ہمیشہ کے لئے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ گھن گرج کی آواز جو ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء میں امرتسر کے بازاروں میں ایک مصلح اور عوامی واعظ کی حیثیت سے بلند ہوئی اور دیکھتے دیکھتے اتنی موثر، دلچسپ اور توجہ کے لحاظ سے اتنی ہمہ گیر اور جاذب ثابت ہوئی کہ پرانے ٹھیکیداروں، مناظرین اور واعظین کی شہرت اور آسودگی کی بظاہر آراستہ اور رفیع دکانوں پر برقِ صاعقہ کی تیزی کے ساتھ کچھ اس بے باکی سے گری کہ جہاں دیدۂ عالم پختہ کار واعظ اور گرگِ باراں دیدہ مناظر سب کے سب اپنے حال و مستقبل کے تحفظ سے یکسر پریشان اور مضطرب نظر آئے، بالخصوص وہ یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے کہ ان کے مدِ مقابل ایک ایسا نو آموز اور نو مشق نوجوان تھا جو پبلک سٹیج پر جلوہ آرا ہوتے ہوئے اپنے ساتھ نہ تو دیرینہ شہرت و تحصیلِ علم و تدریس کی پختہ کاری رکھتا تھا بلکہ محض اخلاص و جرأت و خطابت کی خصوصیات سے آراستہ و پیراستہ عوام سے صرف ان کی بولی میں گفتگو کرنے کی اہلیت سے کما حقہٗ واقفیت کا مظہر تھا۔ چند ہفتوں کے اندر اندر لوگ ان کی مجالسِ وعظ میں ہزاروں کی تعداد میں شرکت کرنا سعادت و عبادت سمجھنے لگے اور ساداتِ بخارا کا یہ نونہال سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام پر دلوں کے جذبات و احساسات سے کھیلتا ہوا عوامی مذہبی ذہن کو کچھ اس طرح سے کھنگالتا نظر آیا

کہ غالب کی زبان میں لوگوں نے یہ سمجھنا اور آپس میں کہنا شروع کر دیا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا!
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تقریباً پینتالیس سال گزرنے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کی ابتدائی پبلک زندگی کو سمجھنے اور اس کے صحیح خدوخال سے بخوبی شناسائی حاصل کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس دور کے پس منظر کا ہلکا سا خاکہ بھی ذہن کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تاکہ اس عالی مرتبت کی مذہبی سٹیج پر اتفاقیہ اور جو اس وقت کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں کے لئے ناخوشگوار حادثہ اور عوام اور اسلام کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی، واقفاتی اور اتفاقی طور پر سمجھ میں آسکے اور بخوبی اندازہ کیا جا سکے کہ اس نصف صدی کے پُرآشوب اور نازک ترین دور میں اس مردِ درویش نے ملک و ملت کی خدمت میں کس مخلصانہ اور سرفروشانہ طریق پر مسلسل جانبازی کا حق ادا کیا۔ جس کو گوان کی زندگی میں مناسب حد تک قدر و منزلت کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ لیکن وہ وقت قریب ہے کہ منصف مزاج مؤرخ تاریخ کے اوراق میں ان کو ان کے صحیح مقام پر فائز کرنے پر مجبور ہوگا۔ مصداق

اس کو ناقدریٔ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

سیاسی پس منظر ——————

حضرت شاہ صاحب کی پبلک زندگی اس وقت شروع ہوئی جب برطانیہ، فرانس، زار شاہی روس اور اطالیہ و یونان اپنی اسلام دشمن چالوں اور سازشوں سے ترکانِ آلِ عثمان کے اخلاف جسے عرفِ عام میں خلافت اسلامیہ کے مقدس و محترم لقب سے یاد کیا جاتا تھا! مشرقِ وسطیٰ اور طرابلس میں کامیاب و ناکام جنگ لڑ چکا تھا اور اسلامی دنیا میں نفرت و حقارت اور اسلام ازم کے جذبات و حسیاتِ عالم گیر تحریکات کے رنگ میں ابھرنی شروع ہو گئی تھیں، برطانیہ اور روس ایران کے شمالی اور جنوبی علاقوں کی باہمی تقسیم پر رضامندانہ

خفیہ معاہدات کے باوجود اپنے مذموم مقصد میں ناکام ہو چکے تھے۔ لیکن موقع کی تلاش میں برابر سرگرم رہے۔ غازی انور پاشا اور کمال پاشا کی سرکردگی اور رہنمائی میں انجمن اتحاد و ترقی کے جانباز و سرفروش قائدین ایک طرف تو حریص اور عیاش سلطان اور ان کے زمانہ ساز اور غدار درباریوں اور عہدیداروں کے چنگل سے اندرون ملک کی گرتی ہوئی بنیادوں کو سہارا دینے اور اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں ایک حد تک فائز اور کامران نظر آتے تھے تو دوسری طرف ملک و ملت کی محبت سے سرشار ہو کر طرابلس کے ریگزاروں میں اسلام دشمن طاقتوں کو اس بری طرح پامال و زخمی کر چکے تھے کہ تمام طاقتیں سلطنت عثمانیہ کے وجود کو ہی ختم کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں اور مناسب موقع کی تلاش میں تھیں کہ وہ اپنی سامراجی قوتوں کو اعلانیہ استعمال کر کے اسلام کے اس آخری سہارے کو بھی بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم کی صورت میں انہیں یہ موافق موقع دستیاب ہوا۔

پہلی جنگِ عظیم

اگست ۱۹۱۴ء میں یوگوسلاویہ کے شہزادے کے قتل کے شاخسانہ پر پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی اور امنِ عالم یک لخت ایک خونریز اور خونخوار لڑائی کی ہولناک تباہی کی آماجگاہ تھا۔ برطانوی سامراج نے "برصغیر پاک و ہند یعنی اس وقت کے متحدہ ہندوستان کو اپنی مملکت کا حصہ تصور کرتے ہوئے ملک کی رائے معلوم کرنے کے تکلف سے بے نیاز ہو کر جنگ میں حلیف کی حیثیت سے شرکت کا اعلان کر دیا۔ جبکہ اس وقت کی سیاسی دنیا نے ناپسندیدگی کے اظہار میں اپنی عافیت دیکھی۔ وائسرائے کے حکم کے ماتحت جنگ کے مقتضیات کی روشنی میں تقریر و تحریر پر احتساب قائم کر دیا گیا اور ناپسندیدہ اخبارات پر پابندیاں عائد کر کے نظربندیوں اور ضبطیوں کے ہتھیار علی الاعلان اور بلا تکلف استعمال کیے گئے۔ پڑھی لکھی دنیا جو پہلے ہی اجتماعی حیثیت میں آئینی احتجاجات کے چکر میں خوگر تھی، اقتدار کی اس ملک گیر دراز دستی پر منتشر ریزہ ہو کر رہ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر کے "کامریڈ" اور "ہمدرد"، مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال"، "البلاغ"، مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" اس سیاسی دار و گیر میں سرِ فہرست تھے

علی برادران مولانا آزاد اور دیگر زعمائے ملت نظر بندیوں کا شکار بنا کر دور دراز مقامات پر پوری احتیاط اور خاموشی کے ساتھ پہنچا دیئے گئے۔ علمائے دیوبند کے مجاہدین کا ایک فعال گروہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کی قیادت میں گرفتار کر کے مالٹا میں محبوس کر دیا اور ہندوستانی مرکزی خفیہ پولیس کے محکمہ کی طرف سے ایک فتویٰ تیار کیا گیا جس پر مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے مقتدر علمائ سے اس مضمون کے دستخط حاصل کئے گئے کہ آل عثمان خادم حرمین شریف ہونے کے باوجود برطانوی استعمار سے برسرِ جنگ ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس ناپاک تحریر پر یوپی کے دو ممتاز مدرسہ ہائے فکر کے برگزیدہ بانیوں کے بھی دستخط حاصل کئے گئے۔ محض اس افترا اور کذب بیانی سے کہ دولتِ عثمانیہ اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے اسلام چھوڑ چکی ہے اور ملتِ ترکیہ کے شیر دل مجاہدین برٹش سرمایہ اور عورت کے چکر میں پھنس کر ملت اسلامیہ کو تاخت و تاراج کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ مجھے یہ بھی ندامت اور افسوس ہے کہ اس عہد کے مشائخ اور پیروں کی تقریباً تمام کھیپ اپنی دنیاوی زندگی کے تحفظ اور بقا کے لئے اسلام دشمنی کی اس کھلی ہوئی سازش میں انگریز کی سیاہ پوری طرح شریک تھی۔ بلکہ ان میں سے ایک پنجابی بزرگ نے تو مسلمان فوجوں کو یہ یقین دلایا کہ امام ضامن کے تعویذ بھیجے تھے کہ ترک کافر ہو چکے ہیں ان کی گولی تم پر قطعاً اثر نہیں کرے گی۔ البتہ تمہاری بندوقوں سے داغی ہوئی گولیاں ترکوں کے سینہ پر براہ راست پیوست ہوں گی۔" خواندہ و ناخواندہ مسلم و غیر مسلم خطاب یافتہ گروہ سب کے سب اس کارِ خیر میں آقایانِ ولی نعمت کا پورے مخلصانہ اور سعادت مندانہ طریق پر ہاتھ بٹا رہے تھے۔ پختہ کار اور جہاندیدہ مناظر و واعظ اور پنڈت سوامی اور گرنتھی بھی تمام ملک میں اس محکمہ کے اشارہ پر فرقہ وارانہ مجالس اور مناظرے منعقد کرنے پر مامور کئے گئے تھے تاکہ سادہ لوح عوام اس گورکھ دھندے میں محصور ہو کر اپنے ارد گرد کے حالات پر توجہ دینے کے قابل نہ ہو سکیں اس پر ہی بس نہیں کیا گیا بلکہ اس دراز اور رنگ اسلام طائفہ نے سقوطِ بغداد پر انگریز کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے چراغاں بھی کئے جس میں سرکاری طور پر مسلمان کہلانے والا طبقہ سر فہرست تھا۔

مذہبی بیان کردہ خاکے کے ساتھ ساتھ غیر ضروری نہ ہوگا۔ اگر یہاں پر چند الفاظ میں اس

دور کا سیاسی مرقع بھی چند الفاظ میں پیش کر دیا جائے۔ تاکہ قارئین معاشرے کے سیاسی و مذہبی خدوخال کو بخوبی سمجھتے ہوئے اندازہ کر سکیں کہ یہ مردِ قلندر کن خوفناک عزائم اور ہلاکت آفریں ماحول سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سعی کرتا رہا۔

انقلابِ روس، خفیہ معاہدے اور ان کے نتائج

عالمگیر جنگ کے اختتام پذیر ہونے سے ایک سال پہلے یعنی اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روسی مزدوروں اور کسانوں کی متحدہ یورش کے سامنے زارِ روس کی فلک بوس عمارت غیر متوقع طور پر زمین بوس ہوئی اور دنیا کو پہلی دفعہ یہ باور کرنے کے امکانات واقعاتی حیثیت میں سامنے آئے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی سرمایہ دارانہ و جاگیرانہ نظامِ مملکت غریب و بے کس انسانوں کے ہاتھوں زیر و زبر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس خونی ڈرامے کے کامیاب ڈراپ سین کے ساتھ ہی دنیا کے سامنے ان خفیہ معاہدات کی نقول بذریعہ اخبارات دیکھنے میں آئیں۔ جن کے مطالعے سے دنیا کے مسلمانوں کو بالخصوص اور کائناتِ ارضی پر سانس لینے والی مخلوق کو بالعموم یہ ناقابلِ یقین سچائی نظر آئی کہ دولِ خارجہ اپنے تمام ادعائے امن گستری اور انصاف پروری کے باوجود اس حد تک اسلام دشمنی پر اتری ہوئی تھی کہ اس نے ایک ہی وقت میں شریفِ مکہ کو سیادتِ عربیہ کے قیام و فروغ کے نام پر یہ یقین دلایا تھا۔ کہ اگر عرب من حیث القوم اس جنگ میں انگریزوں کے حلیف بن کر ترکی کا مقابلہ کریں گے تو دولِ خارجہ یعنی انگریز، فرانس روس، اٹلی اور یونان اس کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ دنیائے اسلام میں ملتِ عربیہ یعنی سیادتِ عربیہ کی ایک واحد مملکت کی تدوین و ترتیب کے ذمہ دار و ضامن ہوں گے۔ دوسری طرف علاوہ اسی زمانہ میں شریف حسین کی اولاد سے علیحدہ علیحدہ خفیہ عہد نامے کر کے یہ طے پایا تھا کہ مملکتِ عربیہ کے تین حصے۔ عراق۔ شرق اردن اور حجاز کے نام پر فیصل اور عبداللہ (شریف حسین کے دو بیٹے) شریف حسین کی ماتحتی میں دے دیئے جائیں گے۔ اگر شریف حسین حجاز پر حکومت کرنے سے انکار کرے تو اس ٹکڑے پر اس کے چھوٹے بیٹے شہزادہ علی کو بادشاہ تسلیم کیا جائے گا۔ اس کے بدلہ میں شام اور فلسطین فرانس اور برطانیہ کی حکمرانی میں

دس سال کے لئے دے دیئے جائیں گے۔ دنیا نے یہ دیکھا کہ گو عرب من حیث القوم ترکی بھائیوں کی جانوں سے قتل و غارت کی ہولی کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ لیکن واقعتہً سیادتِ عربیہ کی وحدت کی بجائے عربستان پانچ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا اور نہ صرف شریف حسین غدار اسلام ناکام و نامراد ہو کر قبرص کے جزیرے میں زہر کی وجہ سے ختم کر دیا گیا بلکہ اس کی اپنی اولاد باپ سے بغاوت کرکے خود بھی اس بے ایمانی اور غداری کا ثمر حاصل نہ کر سکی اور یہ ملک اس عظیم جرم کی وجہ سے اب تک سکون و طمانیت قلب اور امن و ترقی سے محروم چلا آتا ہے۔ اس پر بس نہیں کیا گیا بلکہ دنیا یہ دیکھ کر اور زیادہ متنفر ہوئی کہ اسی زمانہ میں وزیر خارجہ برطانیہ لارڈ بالفور نے دنیا کے یہودیوں کے سرمایہ اور امداد کو اس شرط پر حاصل کیا کہ دنیائے اسلام کے عین مرکز میں یعنی فلسطین میں یہودیوں کا وطن بھی بنا دیا جائے گا جس کے بعد قیامت تک کے لئے مرکزِ اسلام میں اس ناسور کی موجودگی میں سیاسی و سماجی ترقی کی تمام راہیں مسلمانوں پر مشکل کر دی جائیں گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی نہ تو عرب من حیث القوم کسی ایک سیادت پر مجتمع ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ کامیابی کے ساتھ اپنی قومی اور مذہبی حریف یعنی مملکت اسرائیل سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہے۔ اس صورت حال سے بجا طور پر دنیائے اسلام میں برطانیہ اور فرانس وغیرہ کیخلاف نفرت و حقارت کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی اور مسلمانوں نے پہلی دفعہ سنجیدگی کے ساتھ اسلام دشمن قوتوں کے خلاف سر جوڑ کر سوچنا شروع کیا۔ مصر اور ہندوستان ان تحریکوں کا مرکز قرار پائے اور متفقہ طور پر یہ اعلان ہوا کہ برطانیہ اور فرانس سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ہندوستان اور سویز کے علاقوں کو مکمل طور پر ان کی دست برد سے مطلقاً آزاد کرنا از بس ناگزیر ہے۔

عالمگیر جنگ کے اثرات ہندوستانی سیاست پر:۔

اِدھر ہندوستان کے اندر عالمگیر جنگ کے اثرات کی وجہ سے آزادیٔ ملک کی تحریک نئے اسلوب سنوارنے کی فکر میں تھی۔ یعنی ملک میں گاندھی جی خدمت خلق کے ایک تجربہ کار قائد کی حیثیت میں ایک ایسے ہمہ گیر پروگرام کے ساتھ میدان عمل میں آئے جس کے بعد

ملکی سیاست میں تمام پرانی سیاسی جماعتیں اور قائدین اپنی صفیں لپیٹنے پر مجبور ہوئے اور ملک میں پہلی دفعہ عوامی سطح پر آزادیٔ وطن کے لئے تمام فرقوں کے باہمی اتحاد کا نعرہ بلند کیا گیا اور ہندو مسلمان کو ایک ہی سیاسی پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے لئے مسئلہ خلافت کو بھی قومی ملکی پروگرام میں شامل کر لیا گیا جس کے نتیجہ میں برطانوی استعمار بوکھلا کر انسانیت سوز مظالم پر اتر آیا۔ جلیانوالہ باغ کا وہ تاریخی حادثہ رونما ہوا جو برطانوی نوکر شاہی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ ہر قسم کے مظالم روا رکھنے کے باوجود نہ تو عوام میں خوف و ہراس جگہ پا سکا اور نہ ہی فطری سیاسی عمل کی رفتار کے راستے میں کوئی بند کھڑا کیا جا سکا۔

اپریل ۱۹۱۹ء میں مارشل لاء نافذ ہوا اور چھ ماہ کے اندر اندر مظالم پنجاب کی تحقیقات کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری کمیشن بیٹھے اور دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری ہفتہ میں امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوئے جس میں شمولیت کے لئے نہ صرف مارشل لاء میں محبوس تمام قائدین کو رہا کر دیا گیا بلکہ علی برادران، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی وغیرہ جملہ نظر بندوں کو بھی اس اجتماع میں شمولیت کے لئے بروقت آزاد کر دیا گیا جن کے نہایت ہی شاندار استقبال کے لئے مجھ کو اچھی طرح سے یاد ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پر جو بندے ماترم ہال میں انعقاد پذیر ہوا تھا۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ قائدین کی تشریف آوری سے پہلے ہی ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

امرتسر کے عظیم سیاسی اجتماع میں شاہ جی کی شرکت اور اُن کی پہلی گرفتاری

سامعین میں ہمارے شاہ جی بھی لیڈران کی زیارت کے شوق میں سراپا محویت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں قائدین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور رضا کاروں کی معیت میں یکے بعد دیگرے مسلمانوں کی آرزوؤں کے مظہر اپنی جگہوں پر براجمان ہوئے۔ صدارت کی کرسی پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم فروکش تھے اور ان کے دائیں بائیں بیٹھنے والوں میں علی برادران، ڈاکٹر مختار انصاری مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال میاں فضل حسین، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد داؤد غزنوی

ملک برکت علی، پیر تاج الدین اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد حضرت علامہ اقبالؒ نے علی برادران کو مخاطب کر کے وہ قطعہ پڑھا جو "اسیری" کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ اسی اجلاس میں جب چیمسفورڈ اصلاحات کو رد کرنے کی قرارداد تحریک و تائید وغیرہ کی منازل طے کر چکی تو رئیس الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی نے ووٹ شماری سے پہلے ذیل کے شعر میں انگریزوں سے بیزاری کا اعلان کیا۔

تو جو جلنے پہ ہو راضی تو ترے سر کی قسم
کر کے چندہ ابھی لے دوں تجھے لندن کا ٹکٹ

اس پر ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا جس میں ہمارے شاہ جی کی پرمسرت داد بھی کسی سے کم نہ تھی۔ واضح رہے کہ اس وقت شاہ صاحب صرف اصلاح رسوم پر ہی وعظ کہتے تھے یا دوستوں کی محفلوں میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی تک ہی اپنے اوقات کو محدود کئے ہوئے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ اوّل تو شاہ جی مذہبی و ادبی لٹریچر سے بہت زیادہ شغف رکھنے کی وجہ سے اخبار بینی کی طرف بہت کم راغب تھے۔ دوسرے واعظ و خطیب کی حیثیت میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سوئے اتفاق یا سوچی سمجھی سکیم کے تحت آپ کا تعلق ایک تھانیدار سے اس قدر زیادہ ہو گیا اور باہمی اعتمادی کیفیت یہاں تک بڑھی کہ نوجوان شاہ جی اس کو اپنا مخلص دوست اور بہی خواہ سمجھتے ہوئے اس کی پسند و ناپسند کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ شاید ایک لمبے عرصے تک جاری رہتا۔ لیکن درمیان میں مولانا محمد داؤد غزنوی اور دوسرے سیاسی ذہن رکھنے والے دوستوں سے تبادلۂ خیالات نے اپنا اثر چھوڑنا شروع کیا، جس کے نتیجہ میں شاہ جی یکایک خلافت کمیٹی کے سٹیج سے مسلمانوں کی آواز بن کر سیاسی و مذہبی افق پر چمکنا شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۱ء میں مسجد خیر الدین کی ایک تقریر کی پاداش میں تین سال کے لئے میانوالی جیل میں بھیج دیئے گئے۔ جس کے بعد جیل سے ریل اور ریل سے جیل کا وہ لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو مسلسل چالیس سال تک جاری رہا۔ میرے خیال میں شاہ صاحب وہ منفرد زعیم تھے جو امراء کی کوٹھیوں میں بہت کم اور غرباء کی جھونپڑیوں میں بہت زیادہ قیام میں راحت محسوس کرتے اور شاید اس خصوصیت میں اپنا کوئی مدمقابل نہیں

رکھتے تھے۔ ان سے زیادہ کسی قومی کارکن یا قائد نے سفر نہیں کیا۔ اور اگر کیا ہے تو یقیناً اس کے تجربے میں وہ تمام نئے اور پرانے طریقہ ہائے سفر شامل نہیں تھے۔ پیدل سے لے کر اونٹ۔ گدھا۔ گھوڑا۔ موٹر کار۔ موٹر بس۔ ریل۔ بیل گاڑی اور موٹر چھکڑے سب کے سب آپ کے مشن کی تکمیل میں استعمال کیے گئے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ شاہ صاحب نے عام طور پر تھرڈ کلاس کے سفر کو پسند کیا۔ سکنڈ یا فسٹ کلاس میں کبھی سفر اختیار نہ کیا۔ نہ ہی آپ نے کبھی ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کو ترجیح دی۔ بلکہ عام طور پر دوستوں کو یہ کہہ کر اس سفر سے روکتے رہے "کہ میاں یہ تو صریح ہلاکت ہے۔ بھلا اس کو بھی موت کہا جا سکتا ہے۔ جہاں گور و کفن تو ایک طرف سرے سے لاش کا ہی پتہ نہ ہو"۔ اس قسم کے جفاکش، مخلص اور اپنی دُھن کے پکے خادم اب کہاں ملیں گے۔ بقول حضرت اقبال ؎

آئے عُشّاق، گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

رولٹ ایکٹ

یہاں پر یہ عرض کر دینا غالباً غیر ضروری نہ ہو گا کہ پہلی جنگِ عظیم کی بنا پر ہندوستانیوں کی ایک خاصی تعداد کو مختلف حیثیتوں میں بیرونِ ملک جنگی خدمات کے سلسلہ میں باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ جس کی وجہ سے ان کو دوسرے ملکوں کے سیاسی و سماجی تقاضوں اور ان سے وابستہ فکر و نظر سے نہ صرف واقفیت ہوئی بلکہ خاطر خواہ طور پر متاثر بھی ہوئے۔ جو برطانوی نوکر شاہی نظام کے مقتضیات کے لئے بہت حد تک ناخوشگوار اور ناپسندیدہ تھا۔ اس لئے وائسرائے اور ان کی کونسل نے برطانوی استعمار کو آنے والے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لئے وزیرِ ہند کی وساطت سے رولٹ کمیشن کے نام پر ایک ایسے انتقامی ڈھانچے کی تیاری کی داغ بیل ڈالی جو اگرچہ بدلے ہوئے حالات کے مقابلہ میں قطعی طور پر قدامت پسند نہ تھی۔ پھر بھی رولٹ ایکٹ کا نام دے کر اس کو ہندوستان کے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی۔ اور تحریر و تقریر پر اس قسم کی ناقابلِ برداشت پابندیاں

عائد کی گئیں، جن کی مخالفت کو قومی مطالبہ کی حیثیت دے کر گاندھی جی نے ملک گیر عوامی تحریک کی بنیادیں استوار کیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سب سے پہلی عام ہڑتال کی گئی اور ہندو مسلم اتحاد کو عام صورت دینے کے لئے عام طور پر مساجد میں مشترکہ جلسے کئے گئے۔ جن میں ممتاز غیر مسلم لیڈروں نے بھی تقریریں کیں۔ جن میں آزادیٔ ملک کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مظالم کی تلافی، رولٹ ایکٹ کی تنسیخ اور مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کے مطالبات کی تائید وغیرہ معاملات متفقہ ملکی مطالبات کی حیثیت میں پیش کیا گیا، ملک کی سیاسی فضا میں یکایک ایک گونہ ارتعاش اور گرمی پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر مسلمانانِ ہندوستان نے ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے بعد پہلی دفعہ اپنے بہترین دل و دماغ، مفکر، کارکن اور رضاکار پروانہ وار اس میں دھکیل دیئے، یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں عوامی تحریک محلات اور کوٹھیوں سے نکل کر غریبوں کی جھونپڑیوں، مساجد، پاٹھ شالاؤں اور گوردواروں تک پہنچ گئی۔ ایسے ہمہ گیر جذباتی دور سے ناممکن تھا۔ کہ ہمارے شاہ جی متاثر ہونے سے بچتے رہتے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء — ۱۹۱۹ء کا خطیب اور واعظ تمام آسائشوں اور آسودگیوں کو تیاگ کر دیوانہ وار میدانِ عمل میں اس بے جگری کے ساتھ کودا کہ سلف کے بزرگانِ عزیمت و استقلال کی قربانیوں کی تاریخ کو ایک نعرۂ مستانہ سے اجاگر اور روشن کر دیا۔

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

حضرت شاہ صاحب کی حیاتِ طیبہ کے کن کن محاسن کو قارئین کے سامنے پیش کیا جائے سیاسی اور مغربی مدوجزر میں وہ کون سا مقام آیا جہاں قلبِ صادق کے لئے کلمۂ حق کو اونچی سے اونچی آواز میں بلند کرنے کی ضرورت ہوئی اور ہمارا شیر نتائج سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کے فرعونوں اور نمرودوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سب سے اونچے مقام پہ نہ دیکھا گیا ہو۔ آزادی کی جنگ ہو یا انگریزوں کی اسلام دشمنی کے خلاف جہاد، سردارِ دو جہاں کے ناموس پر حملوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی ہو یا بانیٔ مذاہب کی عزت کا تحفظ قانونی اعتبار سے ممکن بنایا جا سکے شاہ جی کا حصّہ سرخروئی کے لباس میں معاصرین میں سب سے زیادہ افضل اور روشن تر نظر

آتا ہے۔ راج گوپال تحریک ہو یا مظلپورہ ایجی ٹیشن۔ کوئٹہ کے مفلوک الحال زخمی انسانوں کی خدمت اور امداد ہو یا بیکس مظلوم مسلمانان کشمیر پر ڈوگرہ شاہی مظالم، انتخاب کی ریل پیل ہو یا تحفظِ ختم نبوت کے لئے جان کی بازی غرضیکہ ہر مقام اور ہر منزل پر حضرت شاہ صاحب قافلہ سالار کی حیثیت میں رجز خوانی کرتے ہوئے ملے اور ساتھیوں اور جانبازوں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ سزا کو ہنستے ہوئے قبول کرتے نظر آئے۔ چنانچہ جانبازی اور سرفروشی کے ایک ایسے ہی تاریخی موقع پر ایک شاعر کا یہ شعر کس قدر موزوں اور برجستہ نظر آتا ہے۔

این است کہ خوں خوردہ و دل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر نیست کسے را

شاہ جی کی وفات ایک دور کی وفات ہے

میں محسوس کرتا ہوں کہ میں حضرت شاہصاحب کی سوانح حیات کے مختلف گوشوں کو اس مضمون میں پیش کرنے سے بُری طرح قاصر رہا ہوں۔ لیکن ابھی ایک ہی گوشے سے پردہ اٹھانے کی ہلکی سی کوشش کی تھی کہ مضمون کی طوالت دامن گیر ہوئی اور مجبوراً اسے تشنہ ہی چھوڑنا پڑا۔ لیکن ختم کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت شاہصاحبؒ کے وصال کو ایک فرد کی دائمی جدائی تک محمول نہ سمجھا جائے۔ بلکہ شاہصاحب کی موت ایک ایسے مقدس دور کی صدائے بازگشت تھی جس نے ۱۷۵۷ء پلاسی (بنگال) کے میدان میں نواب سراج الدولہ کی جوانی کی قربانی وصول کی پھر دولتِ خداداد میسور میں امیر حیدر علی اور سلطان ٹیپو کو خاک و خون میں تڑپتے ہوئے دیکھا، دونوں تاریخی حادثات میں انگریزی اقتدار کی تلوار کبھی کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکتی۔ اگر میر جعفر اور میر صادق علی خاں بنگال اور دکن میں مسلمانوں کے ارفع مقاصد و مقتضیات کے خلاف ذاتی جلبِ منفعت کے لئے دشمن اسلام انگریز سے مل کر غداری کے مرتکب نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمانِ اسلام اس واقعہ کو فراموش نہ کر سکے اور ذیل کا شعر کہہ کر غداران ملت کو ابدی لعنت کا مستوجب ٹھہرایا۔

جعفر از بنگال، صادق از دکن ۔ ننگِ ملت ننگِ دیں ننگِ وطن

یہی آگ پھیلتی پھیلتی مغل خانوادے کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر کے نابالغ شہزادوں کے سروں کو ناشتہ خواں میں باپ کے سامنے کھینچ کر لائی جو ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جاں بازیوں اور سرفروشیوں کی المناک تاریخ بن چکی تھی. علمائے اسلام کو بے دریغ پھانسیاں نصیب ہوئیں اور جب پھانسیوں پر چڑھنے والوں کی تعداد میں کوئی کمی نظر نہ آئی تو فرنگی استعمار نے سزاؤں کا رخ بدل کر جائیدادوں کی ضبطیوں اور کالا پانی کے جزیرے میں عمر قید کے احکام صادر کر کے انسانیت دشمنی پر مہر ثبت کی. پھر یہی آگ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کی برگزیدہ اولاد کی دعوت و تدریس کے ذریعے سلگتی ہوئی حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی ہجرت اور جہاد کی تحریک کی شکل میں نمایاں ہوئی. پھر کچھ عرصہ کے بعد مولانا قاسم نانوتوی و مولانا گنگوہیؒ کے توسل سے مدرسۂ دیوبند کے روپ میں اس آگ کو زندگی ملتی رہی، یہاں تک کہ حضرت مولانا محمود الحسن اور ان کے محترم رفقاءؒ کو اسیرِ مالٹا کی حیثیت نصیب ہوئی. جس کے بعد یہ آگ پورے ملک کو لپیٹ میں لے آئی اور حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری. مولانا احمد سعید، علی برادران، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محل، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا فاخر الہ آبادی مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی. مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری. چوہدری افضل حق. تصدق حسین شیروانی. رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا محی الدین اجمیری. ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ اہم اکابرین علمائے زعماء سب کے سب پروانہ وار اس شان و تمکنت کے ساتھ میدانِ عمل میں اترے کہ برطانوی سامراج اپنے تمام تر مادی وسائل کی فراوانی کے باوجود اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا. اس اعتبار سے یقیناً شاہ جی اس قافلے کے آخری سالار تھے. جن کی موت کو ایک

پورے دور کی موت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

بشکریہ
"امیر شریعت نمبر"
روزنامہ "مشرق"

مولانا مظہر علی اظہر

شاہ جی اور تحریکِ خلافت و ہجرت

جنگِ عظیم کے دوران سیاسی جلسوں اور سرگرمیوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لالہ راجپت رائے کے مانڈلے میں نظر بند کئے جانے کے بعد ۱۹۰۷ء کے زمانے میں ہی سیاسی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ سردار اجیت سنگھ جیسے لوگ ملک سے باہر پناہ لے چکے تھے۔ حیدر رضا جیسوی جیسے معززین کی آواز کبھی سنائی نہ دیتی تھی۔

یکایک ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے برطانوی اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جس سے اسلامیانِ ہند کے دلوں پر ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور یہ ہیجان اور زور پکڑ گیا جب برطانیہ نے لڑائی میں امداد لینے کے لئے مسلمانوں سے جو وعدے کئے تھے ان کی خلاف ورزی علی الاعلان ہونے لگی۔ مسلمانوں سے برطانیہ کا صاف اور صریح وعدہ تھا کہ ترکی سے کوئی مذہبی لڑائی نہیں ہے۔ جنگ میں فتح پانے کے بعد برطانیہ اور اس کے اتحادی ترکی سے کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔ اس کے ملک کا کوئی حصہ اس سے علیحدہ نہیں کریں گے بلکہ اس کے علاقوں کو جوں کا توں رہنے دیں گے۔ اُدھر عربوں سے اندرونی وعدہ یہ تھا کہ لڑائی میں ترکی کے خلاف مدد کریں گے۔ تو ترکوں کی شکست کے بعد عرب کی ایک علیحدہ ریاست بنا کر شریف مکہ کو اس کا بادشاہ بنائیں گے۔ اسی بنا پر شریف مکہ اور اس کے بیٹوں نے عربوں کے لشکروں سے برطانیہ کی امداد کی تھی۔ لیکن جب ترکوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تو برطانیہ نے نہ عام مسلمانوں سے کئے گئے وعدہ کا کچھ خیال کیا اور نہ عربوں سے کئے گئے وعدوں کو قابلِ اس بات سمجھا۔ عرب کے مختلف ٹکڑے کر دیئے گئے (عراق۔ شام۔ فلسطین، اُردن، حجاز)

عراق اور اردن میں شریف مکہ کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو علی الترتیب بادشاہ بنا دیا گیا اور ان پر برطانیہ کا انتداب قائم ہوا۔ شام پر فرانس کا انتداب قائم ہوا فلسطینی علاقوں میں بعد میں آگر آہستہ آہستہ وطنِ یہود بنانے کے لئے زمین خرید خرید کر یہودیوں کو آباد کیا جانے لگا۔ کیونکہ یہودیوں سے بھی وعدہ کیا جا چکا تھا کہ جنگ جیتنے کے بعد ان کے صلے میں یہودیوں کی علیحدہ ریاست بنائی جائے گی۔ یہ سلطنت ۱۹۴۸ء میں آخر کار بین الاقوامی سیاست کی جولاں گاہ بن کر قائم ہوئی۔

لیکن مجھے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء کے زمانے کے حالات عرض کر کے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء تک پہنچنا ہے تاکہ میرے محترم رفیق سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی سیاسی زندگی کا تذکرہ شروع کیا جا سکے۔

جشنِ فتح

۱۹۱۸ء میں ترکی کو شکست کے بعد کرسمس کے دنوں میں جشنِ فتح منانے کے لئے انگریزی حکومت کی طرف سے اعلان ہوا۔ حکومتِ ہند نے جشن منانے کا فیصلہ کیا اور ہر شہر میں جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کی فتح سے جو دبدبہ قائم ہو چکا ہے اس کو اور زیادہ لوگوں کے دلوں پر بٹھایا جائے اور ان پر فاتحانہ ہیبت طاری کی جائے۔ چونکہ سرکار پرست طبقہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کافی صاحبِ اثر تھا۔ اس لئے انکے شمول سے عوام بھی جشنِ فتح میں شامل ہوں گے۔ اس طرح عوام اور خواص متاثر ہوں گے اور برطانیہ کی وعدہ خلافیوں کے باوجود اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکے گی۔

مولانا محمد علی جوہرؒ کی گرفتاری

ہندوستان میں مقتدر آوازیں ایسی تھیں جو ابتدائے جنگ میں ہی ترکوں کے حق میں اٹھ چکی تھیں۔ سب میں مقتدر آواز مولانا محمد علی جوہرؒ کی تھی۔ جنہوں نے اپنے انگریزی اخبار کامریڈ میں VOICE OF TURKY کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر ۱۹۱۴ء میں ہی کہا تھا

کہ ترکوں کے لئے برطانیہ کا سابق رویہ جو ۱۳-۱۲۔۱۹ء کی جنگ بلقان اور ۱۴-۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس میں اختیار کیا گیا تھا اس کے سوا اور کوئی راہ ہی نہیں چھوڑتا تھا کہ وہ جرمنی کے ساتھ مل کر قسمت آزمائی کرتے۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی صاحب کو اس مضمون کی بنا پر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں اور ۱۹۱۹ء میں بھی نظر بند رہے۔

جشنِ فتح کا بائیکاٹ، علمائے دہلی کی اپیل :-

دسمبر ۱۹۱۸ء میں حکومتِ ہند کی منشا کے خلاف آواز اٹھانا ایک کٹھن کام تھا۔ لیکن دہلی میں علماء نے آواز اٹھائی اور گو اس وقت تک کوئی جمعیت قائم نہ ہوئی تھی، تاہم مختلف علماء کے نام سے اس اپیل کا شائع ہونا ہی ایک دلیرانہ قدم تھا۔ کہ مسلمانانِ ہند جشن میں شامل نہ ہوں، کیونکہ ترکی کی فتح پر جشن منانا مسلمانوں کو زیبا نہیں ہے۔ اس اپیل کا غیر متوقع اثر ہوا۔ اور جگہ جگہ مسلمانوں نے جلسے کر کے لوگوں کو علماء کے اعلان سے روشناس کرایا اور ان کو تاکید کرائی کہ وہ جشنِ فتح میں شریک نہ ہوں۔ یہ برطانیہ اور ان کے ساتھیوں کے لئے فتح کا دن ہے لیکن ترکوں کی شکست کے باعث مسلمانوں کے لئے رنج و غم کا دن ہے۔

مجھے تو دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہی بٹالہ کی جامع مسجد کے جلسہ میں لوگوں کے سامنے ایک مقالہ پڑھ کر علماء کے اعلان کی تشہیر و تائید کا موقع ملا اور میری سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ ان دنوں ابھی تعلیم دینیات میں مصروف تھے اور مذہبی اور اصلاحی تقاریر کی ابتدا کر چکے تھے۔ لیکن سیاست کی طرف متوجہ نہ تھے

رولٹ بل پر کانگریس کا احتجاج :-

ہندوؤں نے ۱۹۱۸ء میں کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سوائے اس کے کہ جب مرکزی اسمبلی میں رولٹ بل پیش ہوا تو انہوں نے مخالفانہ تقریریں کیں۔ اس قانون کے تحت نظر بندیوں کے اختیارات بھی حاصل کئے جا رہے تھے اور مقدمات چلاتے وقت ملزموں کو وکیل کرنے یا اپیل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے اس قانون کے خلاف نہ صرف منتخب نمائندوں

نے بھی اعتراض کیا بلکہ نامزد ہندو نمائندوں نے بلکہ سر سنکری نائیر نے جو گورنمنٹ آف انڈیا میں وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کے ایک رکن تھے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا ان تقاریروں کے اخبارات میں چھپنے سے ملک کے کونے کونے میں پراپیگنڈہ ہوا اور لوگوں میں حکومت کے خلاف جذبہ ابھرا۔

گاندھی جی افریقہ میں وہاں کی حکومت سے ٹکر لے کر ہندوستان واپس آ گئے۔ وہاں امتیازی توانین کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ خود جیل میں گئے اور ورکروں کو بھی قانون کی پرامن مخالفت پر آمادہ کیا وہ جنوبی افریقہ کی کارکردگیوں کے باعث ہندوستان میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے رولٹ بل کے خلاف احتجاج کے طور پر ۳۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو ہڑتال منانے کا اعلان کیا۔ آل کانگریس نے ان کی تائید کی۔ جگہ جگہ کانگریس کمیٹیاں بن کر ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ہڑتال کر کے جلسے کرنے اور ان میں رولٹ بل کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ قصہ مختصر ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال امرتسر میں سرگرم کارکن پیدا ہوئے۔ حکومت نے ان دونوں کو ۶ اپریل سے پہلے ہی گرفتار کر لیا۔ لوگوں میں ہیجان برپا ہوا۔ ہندو مسلمان اکٹھے ہو کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں پل تھا جس سے گزر کر کوٹھی کی طرف جانا تھا۔ یہاں پولیس نے راستہ روکا اور حسب ہدایت ان کو سول لائنز کی طرف جانے نہ دیا لوگ اپنے سر دالعزیز لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کرنے جا رہے تھے۔ مگر پل پر ہی گولی چل گئی۔ کئی لوگ مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے۔ لوگ لاشوں اور زخمیوں کو لے کر ہال بازار میں داخل ہوئے۔ جوش خروش بڑھ چکا تھا۔ گرم جوش لوگ تشدد پر اتر آئے سرکاری عمارتوں اور بینکوں وغیرہ کو جلانا شروع کر دیا۔ کوئی انگریز مل گیا تو اس پر بھی حملہ کیا بعض قتل بھی ہوئے۔

امرتسر کی خبروں نے دوسری جگہوں پر بھی اثر کیا۔ قصور۔ لاہور، گوجرانوالہ اور لائلپور وغیرہ میں بھی تشدد ہوا۔ ان سب جگہوں پر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جس کے تحت بعد میں کئی جگہوں پر معزز کارکنوں پر مارشل لاء کی عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے۔

واقعہ جلیانوالہ باغ :-

لیکن سب سے زیادہ اشتعال انگیز حادثہ جلیانوالہ باغ امرتسر میں ہوا۔ یہ باغ شہر کے درمیان واقع تھا۔ کوتوالی سے جنوب کی طرف کچھ فاصلہ پر اس کا آمدورفت کا تنگ مگر مستقل راستہ تھا جنوب مشرق میں ایک اور راستہ بھی تھا۔ مگر ادھر زیادہ آمدورفت کا علاقہ نہیں تھا۔ اس باغ میں جلسے ہوا کرتے تھے۔ مارشل لاء ہوجانے کے باوجود ایک ہفتہ تک شہر میں حکومت اپنا نظام قائم نہ کرسکی۔ باغ میں ہر روز جلسے ہوتے تھے اور لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کیا جاتا تھا اور پُرامن رہنے کو بھی کہا جاتا۔ کیونکہ کارکن حضرات تشدد کو درست نہیں سمجھتے تھے اور گاندھی جی نے پرامن رہنے کی ہدایت کی تھی۔ ۱۳ اپریل اتوار کے روز بیساکھی کے دن امرتسر میں خاص ہجوم تھا۔ لوگ دیہات سے بھی بڑی تعداد میں آئے تھے۔ جلیانوالہ باغ میں جلسہ ہو رہا تھا۔ حاضری معمولاً بھی غیر معمولی ہوتی تھی۔ لیکن بیساکھی کے دن غیر معمولی ریکارڈ بھی مات ہوگیا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر لارڈ ڈوائر کی ہدایت کے مطابق جنرل ڈائر فوج کا ایک دستہ لے کر شہر میں آیا۔ اس نے کوتوالی کی طرف بڑھ کر عام آمدورفت کا راستہ روکا اور آگے بڑھ کر کوئی تنبیہہ کیے بغیر فوج کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جب تک گولیاں ختم نہ ہوگئیں فائر ہوتے رہے۔ ہزاروں زخمی اور سینکڑوں قتل ہوئے۔ بھاگ دوڑ میں نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا لوگ مکانوں کی دیواروں کو پھاند کر بھاگنے لگے۔ لیکن وہ سب سے زیادہ تختۂ مشقِ ستم ہوئے۔ ڈائر اور اس کے فوجی واپس چلے گئے۔ اور لوگ بھی ہراساں ہوکر جدھر رُخ ہوا بھاگ گئے۔

اس حادثہ کا ردِ عمل سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری پر :-

اس قتل عام نے نہ صرف امرتسر کے شہر اور ضلع میں آگ لگادی بلکہ قرب وجوار کے لوگوں میں بھی اپنے مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کی خبر سُن کر غم وغصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ اخبارات میں جب اس قتلِ عام کی خبر چھپی تو سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں انگریزی تشدّد کے خلاف گہرا جذبہ پیدا ہوا۔ نوجوان سیّد عطاء اللہ بخاری کی رہائش گاہ بھی کوتوالی اور جلیانوالہ باغ کے قریب

ہی تھی۔ اس سانحۂ جانکاہ سے طبیعت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ ترکوں کی شکست کے بعد خود اپنے گھر میں انگریزی مظالم کی داستان ایک چشم دید واقعہ بن کر سامنے، جوشیلی طبیعت، تڑپنے والا دل، تڑپانے والی زبان (جو کربلا کے واقعات سنایا کرتی تھی) کب تک خاموشی اختیار کرتی۔ جمعیت نے پہلے ہی کرسمس کے دنوں میں کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں کرانے کا فیصلہ کر چھوڑا تھا۔ اب انگریزی حکومت کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہونے دیا جائے یا کہ نہ؟ اجلاس کا فیصلہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہو چکا تھا۔ اس لئے اسے خود ساختہ فتنہ سے تعبیر نہ کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کے چپہ چپہ میں جلیانوالہ باغ کے مظالم کی داستان پہنچ چکی تھی۔ دنیا کی رائے عامہ بھی برطانیہ کے خلاف تھی۔ اس لئے اس اجلاس کو روکا نہ جا سکا۔ اور وزیر ہند نے اعلان کر ہی دیا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہونے دیا جائے گا۔ اور اسے روکا نہیں جائے گا۔

کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کا مشترکہ اجلاس:

آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے کے لئے لوگ راس کماری اور ہمالیہ تک کے علاقوں سے آئے، مرد، عورتیں اور بچے خون کے نشانات دیکھتے پھرتے تھے جو آٹھ ماہ گزرنے کے باوجود دیواروں پر مل جاتے تھے اور انہیں جو سرخی مائل مٹی نظر آتی اسے اٹھا کر ساتھ لے جاتے تاکہ ظلم وستم کی داستان کا یہ نشان ان کی اپنی یاترا کی یاد دلاتا رہے اور آنے والی نسلوں کو بھی گرماتا رہے۔

کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کا اجلاس بھی امرتسر میں ہوا حکیم اجمل خاںؒ صاحب صدارت فرما رہے تھے لیکن اس اجلاس کی رونق میں اس وقت گراں قدر اضافہ ہوا جب یہ خبر آئی کہ چھندواڑہ جیل سے رہا ہو کر علی برادران امرتسر میں آ گئے ہیں اور وہ اجلاس میں شامل ہوں گے دو گرانڈیل ہستیاں آئیں جن کے قد بلند و بالا سے مقابلہ کرنے والا کوئی سرو بھی نظر نہ آیا۔ غلغلہ ہائے تکبیر سے ایوان گونج اٹھا۔ تحفظِ خلافت کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لیکن ابھی تک خلافت کمیٹی کی باقاعدہ تشکیل نہ ہوئی تھی۔ انہی دنوں ہمارے شاہ جی بھی ان بڑے بڑے

اجتماعات میں شامل ہو کر درس سیاست اور اپنے مستقبل کی بنیاد استوار کرنے لگے۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جمعیت العلمائے ہند نے بھی اور کانگریس نے بھی اعلان کیا کہ قومی کام کی ترقی کے لئے سرکاری ملازموں کو اپنی ملازمتیں، وکیلوں کو وکالتیں طالب علموں کو مدرسے اور دیگر کاروبار والوں کو اپنے کاروبار چھوڑ کر قومی تحریک کا کام کرنا چاہیئے۔

ہندوؤں نے آزادیٔ ہند کا نام اس لئے لیا کہ ہندوستان آزاد ہو۔ انگریزوں نے ان کو مسلمانوں کے خلاف اٹھا کر اپنے بعد دوسرے نمبر پر سیاسی اقتدار دے دیا تھا اور ان کو ۱۸۵۷ء کی سیاسی رہنمائی اور جنگ آزادی کی سرکردگی کی سزا میں سب سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ مگر یہ قدرت کا انتقام تھا کہ وہی ہندو اب سیاسی طور پر بالغ ہو کر انگریز سے آزادی کا خواہاں اور اس سے جنگ لڑنے پر آمادہ ہوا۔ مسلمانوں کے دل کی بات اپنائی۔ اس نے بھی تحفظ خلافت اور حکومت ترکی کی تائید و حمایت کو اپنا ورد زبان بنایا۔ دوسری طرف مسلمان تحفظ خلافت ترکیہ اور العرب کی آزادی کے لئے بے قرار تھا۔ لیکن اس کے لئے براہ راست کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ یہ کام کر سکتا۔ داناؤں نے یہی راہ سوچی کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جہاں سے انگریز کو سب سے زیادہ سامان جنگ اور فوج و رسد ملتا ہے تب تک ترک سلامت نہیں رہ سکتے اور نہ عرب اور نہ دیگر ممالک اسلامی۔ اس لئے انہیں بھی خلافت اور حفاظت ممالکِ اسلامی کے ساتھ آزادیٔ ہند کو اپنا فریبی مسلک بنانا پڑا۔

تحریک ہجرت

لیکن ان دنوں ایک اور تحریک شمالی ہند میں نمایاں ہوئی۔ وہ تحریک ہجرت تھی۔ امیر امان اللہ خان والیٔ افغانستان نے مئی ۱۹۱۹ء میں مارشل لا کے دنوں میں ہی سرحد ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اور انگریزی حکومت نے زیادہ لڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ بلکہ افغانستان کے ساتھ نرم شرائط پر صلح کر لی تاکہ ہندوستان کو اندرونی انتشار اور افغانستان کی بیرونی یلغار مل کر زیادہ مشکلات نہ پیدا کریں۔

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور تحریک ہجرت

کچھ علماء اور کارکنوں نے جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی شامل تھے۔ تحریک ہجرت کی تائید کی۔ سرحد اور پنجاب میں اس تحریک کو بہت رسوخ حاصل ہوا۔ اس تحریک کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کی تقریر دلی دروازہ کے باغ لاہور میں ہوئی جس میں انہوں نے ہجرت پر تقریر کی۔ جوانی کا عالم تھا۔ زبان ہر حرف کو اس کے مخرج سے نکالتی تھی۔ قرأت پر قاری وجد کرتے تھے۔ ترجمہ کرتے تو عالم سر دھنتے تھے اور تفسیر فرماتے تو عالم بھی جھوم اٹھتے تھے۔ ترکوں پر انگریزوں کے مظالم کا ذکر کیا۔ عرب کے حصے بخرے جلیانوالہ باغ قید و بند کی صعوبتیں، پھر ہجرت کے متعلق آیات کی تلاوت کی

"بے شک وہ لوگ جن کا خاتمہ فرشتے اس حالت میں کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ستم توڑنے والے ہوں، تو ان سے کہتے کہ تم کس حال میں تھے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اس زمین میں کمزور کر دیئے گئے تھے تو فرشتے دریافت کرتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین لمبی چوڑی نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے پس ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری بازگشت ہے۔ سوائے ان کے جو مردوں عورتوں اور بچوں میں سے بے بس ہوں کہ وہ کوئی حیلہ نہ کر سکیں اور نہ کوئی راستہ پائیں۔ پس قریب ہے کہ خدا ایسے لوگوں سے درگزر کرے اور خدا بڑا درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے"۔

اور جب شاہ صاحب ایک طرف ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ظلم و تشدد اور دوسری طرف ترکوں اور عربوں سے اس کی بے انصافیاں، وعدہ خلافیاں اور ستم آرائیاں اور تیسری طرف امان اللہ خاں کی اسلام دوستی اور مہاجرین کے لئے خوش آمدید اور ان کی آبادکاری کے لئے اراضی اور کاروبار کے مہیا کرنے کے اعلانوں کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہوئے کہا

"اور جو شخص راہِ خدا میں ہجرت کرے گا تو وہ زمین میں بڑی آسائش اور کشائش

پائے گا۔ اور جو شخص خدا اور رسول کے لئے اپنے گھر سے ہجرت کر کے نکلے گا پھر اسے موت آ ئے گی تو یقیناً اس کا اجر خدا کے ذمے ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"۔ تو دنیا کے ان حالات اور اللہ کے ارشادات کو سن کر کتنوں کے دل نہ چاہیں گے کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر امان اللہ کے دارالسلطنت کابل کی طرف ہجرت کریں۔ ایمان والوں نے ہجرت کی۔ لیکن ان کے ہمراہ سرکاری کارندے بھی کثیر تعداد میں تھے۔ انہوں نے کابل پہنچ کر مہاجرین کو امان اللہ خاں کے پروگرام پر نہ چلنے دیا بلکہ فوری جہاد کا پروگرام پیش کر کے حکومتِ انگریزی کی خدمت کی اور امان اللہ خاں اور مہاجرین کی حقیقی آرزوؤں کو پورا نہ ہونے دیا۔

انہی دنوں جب سرکاری ملازم ملازمتوں کو چھوڑ کر نکلے۔ وکیلوں نے وکالت چھوڑ دی سرکاری مدرسوں میں پڑھنے والوں نے مدرسے چھوڑے اور اپنے مستقبل کو جواب دے کر تحریک آزادی میں شامل ہو کر مصائب جھیلنے پر آمادہ ہوئے تو دینیات کے مدرسوں میں پڑھنے والے جاری و ساری تحریک سے کس طرح بے پرواہ ہو سکتے تھے اور جب لوگ ہر طرح کا کام چھوڑ کر ہجرت کر رہے ہوں حتیٰ کہ بیویوں کو طلاقیں دے کر آزاد کر رہے ہوں تاکہ خود آزادی کی جنگ بالکل آزاد ہو کر لڑ سکیں۔ تو شاہ صاحبؒ اپنی طالب علمی کے دور کو کس طرح جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ "مشکوٰۃ" شریف کا سبق پڑھتے پڑھتے طالب علمی کو طلاق دینے کی نوبت آئی۔ ان کے نقص مرتب کرنے والوں نے بعض اوقات ان کے غیر مستند عالم ہونے پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن جس نے مشکوٰۃ شریف کا سبق باقاعدہ بھی لے لیا ہو۔ وہ ایسا کوئی ان پڑھ تو نہیں رہ سکتا کہ اس پر انگشت نمائی کی جا سکے۔ جنگ آزادی کے دور میں فرصت کا وقت جیل ہی میں ملتا تھا یا ریل گاڑی میں۔ لیکن شاہ صاحبؒ کے لئے جیل ہی میں وقت ہو سکتا تھا۔ جہاں ان کے حجۃ البالغہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ، صاحبِ حدیث و تفسیر کا مطالعہ کرتے رہے اور ان کی بیقاعدہ تعلیم اور بزرگوں سے خلوت اور جلوت میں اور برسر اجلاس وعظ و ارشاد سن کر جو کچھ حاصل کیا۔ اس کا خلاصہ قاری محمد طیب صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"جہاں تک ان کے بیانات سے مجھے استفادہ کا موقع ملا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ قرآن ان کے سامنے کھلا ہے اور وہ اس کے بلیغ اور موجز جملوں کی مجسم شرح و تفسیر بنے ہوئے ہیں۔ نیز ان کے الفاظ میں:۔

"ان کی خطابت محض واعظانہ رنگ کی
خطابت نہیں بلکہ ان میں عالمانہ انداز بھی
شامل ہوتا ہے"۔

مولانا محمد داؤد غزنوی

شاہ جیؒ میدان سیاست میں

واعظ سے سیاسی لیڈر تک

۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے بعد میں نے امرتسر میں پبلک جلسوں کا انتظام کیا۔ جلیانوالہ باغ میں انگریز کے ظلم و تشدد کی وجہ سے تمام پنجاب اور امرتسر میں خوف و ہراس تھا۔ میں نے اس خوف و ہراس کو ختم کرنے اور اس کی جگہ عوام میں آزادی کی تحریک کو پھر سے زندہ کرنے اور برطانیہ کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرنے کے لئے مسئلہ خلافت کو سامنے رکھ کر شہر کے مختلف مقامات پر جلسوں کا انتظام کیا۔

اس وقت میری عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ حکومت کے تشدد سے بے نیاز ہو کر جب میں نے تقریریں شروع کیں تو عوام میں ہر وقت میری گرفتاری کا چرچا تھا۔ لیکن میں نے اللہ کے نام پر اپنے مشن کو جاری رکھا۔ جو قلبی سکون مجھے اس وقت حاصل تھا میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔

سید عطاء اللہ شاہؒ اس وقت مدرسہ نعمانیہ مسجد خیرالدین میں مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے خوش بیان ہونے کی وجہ سے بطور ایک واعظ امرتسر میں مشہور تھے۔

میری ایک تقریر چوک کٹڑہ سعید میں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد ہر دوست کا خیال تھا کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ اور ساتھ ہی مجھے دوستوں نے نصیحت کرنی شروع کی کہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ آپ اس قسم کی تقریریں نہ کریں۔ دوسرے دن اسی جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے تقریر کی اور کہا

کل اسی جگہ مولوی داؤد غزنوی جو آگ لگا گیا ہے ۔ میں اس پر پانی ڈالنے آیا ہوں، شاہ صاحبؒ کی اس تقریر سے عوام میں غلط فہمی پیدا ہوئی ۔ مجھے جب اس تقریر کا علم ہوا تو میں نے سمجھا کہ شاہ صاحبؒ کو واقعات کا علم نہیں اور ان سے یہ تقریر کرائی گئی ہے ۔ لہٰذا میں نے دوسرے دن شاہ صاحبؒ کو اپنے مکان پر بلوایا اور اخبارات کے تمام گوشتہ فائل ان کے سامنے رکھے اور ان سے عرض کیا کہ اس وقت عالم اسلام کے خلاف برطانیہ کیسا سلوک کر رہا ہے اور خاص کر ترکی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ عالم اسلام کے لئے تباہی کا باعث ہے ۔

یہ حالات سن کر شاہ جیؒ نے فرمایا کہ میں نہ تو اخبارات پڑھتا ہوں اور نہ میں نے سیاست میں کبھی حصہ لیا ہے ۔ اس لئے مجھے حالات کا کوئی علم نہیں ۔

میں نے عرض کیا اگر آپ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد میرے ساتھ مل کر کام کریں تو اس وقت مسلمانوں کی اور عالم اسلام کی بہتر خدمت ہو سکتی ہے ۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "میں تو ایک طالب علم ہوں ان حالات میں کیسے تقریر کر سکتا ہوں"

میں نے کہا آپ دو تین مہینے میرے ساتھ جلسوں میں شرکت کریں ،

شاہ صاحب میں جذبات کی کمی نہ تھی ۔ تقریر کی قابلیت ان میں قدرت نے ودیعت کر رکھی تھی ۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں شاہ صاحبؒ خلافت کے موضوع اور حالات حاضرہ کے بہترین مقرر بن گئے ۔ پھر تو ان کی تقریر کا یہ عالم ہو گیا کہ نہ صرف امرتسر بلکہ پنجاب سے باہر سارے ہندوستان میں وہ اپنی ایمان پرور تقریروں سے لوگوں کے جذبۂ حریت اور ایمان کو گرماتے رہے ۔

یہ اُن کی خاندانی شرافت یا عالی نسبی سمجھئے کہ اس مقام پہ پہنچ کر بھی وہ مجھے اپنا بڑا بھائی اور استاد تسلیم کرتے رہے ۔

تحریک خلافت ۱۹۲۱ء میں جب عوام کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور شاہ صاحبؒ بھی اپنی ایک تقریر کی بنا پہ جو انہوں نے مسجد خیر الدین امرتسر میں کی تھی گرفتار کر لئے گئے ۔ اس مرتبہ انہیں تین برس تک کی سزا ہوئی ۔ یہ شاہ صاحبؒ کی پہلی گرفتاری اور سزا یابی تھی ۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد سول نافرمانی کی عام تحریک شروع ہو گئی اور ہم سب گرفتار ہو کر جیلوں میں چلے گئے۔

میانوالی جیل میں

پنجاب کے تمام کارکن میانوالی جیل میں تھے۔ وہاں شروع میں تو سخت پابندی تھی ہم ایک دوسرے سے مل بھی نہ سکتے تھے۔ جب امرتسر کے کچھ کارکن وہاں پہنچے تو ہماری ایک طاقت بن گئی۔ شروع میں ہم گیہوں کی روٹی کھاتے تھے لیکن ہم نے یہ روٹی ترک کر دی اور مطالبہ کیا کہ ہم سب کو ایک ساتھ رکھا جائے۔ چھ دن بعد ہماری بات مان لی گئی اور ہم نے بھوک ہڑتال ترک کر دی۔ اس کے بعد ہمارا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ سیاسی اور اخلاقی قیدیوں کے لنگر الگ الگ ہوں اور اس کا تمام نظام ہمارے ہاتھ میں ہو۔ ہمارا یہ مطالبہ بغیر بھوک ہڑتال کے مان لیا گیا اور سیاسی قیدیوں کے لنگر کا انتظام ہمارے سپرد کر دیا گیا۔ مجھے لنگر کا منیجر مقرر کیا گیا۔ اس بنا پر مجھے تمام جیل میں آنے جانے کی آزادی مل گئی۔ اس کے بعد ہماری آہستہ آہستہ پابندیاں کم ہوتی چلی گئیں اور ہم سب ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے۔

ہنگاموں کے ختم ہونے کے بعد شاہ صاحبؒ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے شاہ ولی اللہؒ صاحب کی حجۃ البالغہ پڑھا دیجئے۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کی کہ جیل کی ہنگامہ خیز زندگی کی بنا پر سال بھر سے میرا ذہن بالکل تھکا ہوا ہے۔ پھر کب جانے یہ موقعہ کب میسّر آئے۔ بہتر ہے کہ ہم آرام کریں۔ مگر ان کا اصرار شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ آخر وہ میرے انکار پر غالب آئے اور میں نے کتاب کا سبق شروع کرایا۔ مگر دو ماہ نہ گزرنے پائے تھے کہ ہماری جمعیت کو منتشر کرنے کے لئے ہمیں مختلف جیلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ چنانچہ مجھے رہتک بھیجا گیا۔

اس کے بعد میں نے شاہ صاحبؒ سے کہا کہ مولانا احمد سعید مرحوم سے اپنا سبق جاری رکھیں۔ لیکن میانوالی جیل میں جہاں مولانا احمد سعید، مولانا عبدالمجید سالک، صوفی ذکا اللہ ایسے باذاق لوگوں کا اجتماع ہو، وہاں درس و تدریس کا سلسلہ کیسے قائم رہ سکتا ہے

حجاز میں انقلاب

تحریک خلافت کے قیدیوں کے رہا ہونے کے بعد حجاز میں ایک انقلاب آیا اور شریف حسین وہاں سے بھاگ گئے اور سرزمینِ حجاز ابن سعود کے قبضہ میں آ گئی۔

غط غط قبیلے کے معززین جن کا حجاز میں بہت بڑا دخل تھا انقلاب کا باعث ہوئے تھے۔ قبے گرانے کا یہ الزام غط غط کے سرداروں نے انگریز کے اکسانے پر شاہ سعود کے فوجیوں پر عائد کیا حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ چنانچہ جیسے ہی قبے گرنے اور قبریں مسمار کرنے کی اطلاع پاک و ہند میں پہنچی لوگ بیقرار ہو گئے اور انہوں نے ابن سعود کے خلاف الزام لگایا کہ قبے ابن سعود کی حکومت نے گرائے تھے۔

خلافت کمیٹی جن میں شیعہ سنی اہل حدیث شامل تھے۔ مل کر ان حالات کا مقابلہ کیا بالخصوص شاہ صاحبؒ نے ان دنوں میں جس جوانمردی کے ساتھ مخالفین اور حکومت کا مقابلہ کیا۔ یہ ان کی خداداد ہمت کا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ آج تک بڑی ہمت سے اور ایمانی قوت سے ملک کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتے چلے آتے تھے۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

شاہ جی اور فتنۂ راجپال

جماعتِ احرار اور اُس کی مشکلات :-

آریہ سماجیوں کی طرف سے توہینِ رسول کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور مجلسِ احرار بھی ناموسِ رسول کی حفاظت کے لئے سرقربانی دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لاہور میں "رنگیلا رسول" ناپاک کتاب کے خلاف غم و غصہ کے طوفان ابھر رہے تھے اور ساری قوم مسلم لیگ کی بے عملی سے اکتا کر مجلسِ احرار کے دامن سے عمل کی توقع وابستہ کر چکی تھی اور خواص سے بیزار عوام میں سے ہر ایک کی زبان سے "احرار کہاں ہیں" "احرار کہاں ہیں" کی بے تاب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اب وہ دن آ گیا جب لوگ جوق در جوق دہلی دروازہ کے باہر مجلس احرار کے دفتر کی طرف ہجوم کرتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ بارہ بجے تک شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے ارد گرد سارے باغات انسانی کھوپڑیوں کے گھنے جنگل بن گئے تھے۔

مجلس احرار بھی عجیب قسم کی جماعت تھی۔ بڑی خوش قسمت مگر بڑی بد قسمت۔ اس نے قبولِ عام کی ایسی بہاریں دیکھیں کہ کسی دوسری جماعت نے کم دیکھی ہوں گی۔ مگر اس نے پسپائی اور زوال کی خزاں کے منظر بھی ایسے خوفناک دیکھنے پڑے کہ کیا کہوں۔

بات کیا تھی ۔۔؟

بات یہ تھی کہ اس جماعت کا فکری رہنما اس جماعت کو ایسے انداز سے چلانا چاہتا تھا جس سے احساسِ مقامی کی بھی تسکین ہو جائے اور آزادیٔ وطن کے اہم تقاضے بھی پورے

ہو جائیں ۔ بس اس دو عملی امتزاج میں مجلسِ احرار میں کبھی تو بہار آجاتی رہی اور کبھی ایسے بھیانک خزاں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسلمان عوام بڑے سادے اور مخلص لوگ ہیں۔ پیچاپیچی ان کی سمجھ سے باہر ہے ۔ وہ تو سیدھی سپاٹ بات کو سمجھتے ہیں ۔ احرار کی یہ مشکل رہی ہے کہ انگریزوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ انہیں ان فتنوں کو بھی سنبھالنا پڑتا تھا۔ جو پوری تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا ۔ فرقوں کے حقوق کے پردے میں انگریزوں کے ہی ابھارے ہوئے ہوتے تھے اور ان فرقوں کے حقوق سے زیادہ افتراق انگیزی معلوم ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شاطر اپنے مہروں کو آگے بڑھانے میں بڑی چابک دستی سے کام لیتا تھا۔ اس کے یہ مہرے مسلمانوں میں بھی تھے اور ہندوؤں میں بھی اور سب سے اچھے مہرے وہ ہوتے تھے جن کی چال کا دھوکہ ہی نہ ہو سکے ۔ ایسے موقعوں پر شاطر مخلص لوگوں سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور ایسی باتیں اٹھاتے تھے جن سے الگ ہونا ناممکن ہوتا تھا۔ ہندوؤں کی بڑی کمزوری رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے نام سے بدکتے تھے —— اور یہ منصوبہ بھی ایک سو سال سے ان کے پیشِ نظر تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی احساس کو بار بار کے تصادم سے کمزور کیا جائے ۔ اس میں انگریز اندر سے اس کا ہمنوا تھا۔ گو ظاہر میں ثالث بن جاتا تھا اور لطف یہ کہ مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم بھی رکھتا تھا۔

احرار کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ ہندو اور انگریز دونوں سے لڑائی لڑی جائے مگر شاطر کچھ اس طرح سے چال چلتا تھا کہ ہندو سے ان کی لڑائی اچھی طرح سے گتھ جاتی تھی۔ مگر انگریز سے لڑائی کے وقت سارا ہجوم ان سے اس طرح ہٹ جاتا تھا۔ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ احرار دونوں محاذوں پر لڑتے رہے اگرچہ میری دانست میں ان کی لڑائی سے سیاست کا یا مسلمانوں کی سیاست کا کوئی سا عقدہ کبھی حل نہ ہوا۔

دفتر احرار میں احراری راہنماؤں کا اجتماع :-

بات کہیں سے کہیں نکل گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ توہینِ رسولؐ کے خلاف احتجاج سے بھرا ہوا ایک ہجوم بے پناہ شاہ محمد غوثؒ والی سڑک اور باغات میں جمع ہوگیا۔ گویا ایک تقاضائے عام تھا

کہ احرار اس احتجاج کو عملی شکل دینے میں قوم کی رہنمائی کریں۔ اس صورت حال میں مجلس احرار کے دفتر کی بالائی منزل پر احرار کے بڑے بڑے راہنما سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں جمع ہوئے اور مسلمانوں کے جذبات کو کم کرنے اور منظم کرنے کے وسائل پر غور کرنے لگے۔ اس موقعہ پر میری یاد کے مطابق منجملہ دیگر اصحاب کے چوہدری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا مظہر علی مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا غلام غوث سرحدی اور سب سے اہم اور ممتاز سید عطاء اللہ شاہؒ موجود تھے۔ بحث کے دو نقاط تھے۔

اوّل :۔ کہ توہین رسولؐ کے مسئلہ کو عدالت میں لایا جائے۔

دوم :۔ آریہ سماجیوں کی سرکوبی کے لئے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی جائے۔

یہ بحث بڑے معرکے کی بحث تھی۔ ایک طرف وضع احتیاط کا انداز تھا اور دوسری طرف جرأت غازیانہ کا مظاہرہ تھا۔ اندرون خانہ کی اس بحث میں ہر قسم کی باتیں ہوئیں اور یہ خصوصیت احراریوں میں ہی دیکھی گئی تھی کہ سخت سے سخت بحث کے باوجود احراری برادری کا احساس کبھی کمزور نہیں ہوتا تھا۔

امیر شریعتؒ کی اہل لاہور کو یقین دہانی :۔

شاہ محمد غوثؒ والی سڑک پر ہجوم اور زیادہ ہوتا گیا اور اب شائد مخالف جماعتوں کے لوگ ہجوم میں شامل ہو گئے تھے اور نعروں کا انداز کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ گویا اگر کوئی جلد فیصلہ نہ ہوا تو دفتر احرار اور رہنمایان احرار کی بھی خیر نہیں۔

اس شور و شغب کے عالم میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے بالکونی سے اپنا چہرہ دکھایا اور کہا

"اے باشندگان لاہور! معاملہ عزت رسولؐ کا ہے اور اس کے لئے ہماری جماعت ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس مقدس جہاد میں وہ لوگ شریک نہیں

جن کو اپنے دعوے کے مطابق اب تک میدان میں آجکنا چاہیئے تھا۔ ہم عزت رسولؐ کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مگر جاؤ ان رہنماؤں کو بھی لے آؤ جو ہم سے الگ مسلک رکھتے ہیں تاکہ یہ جہاد آخری جہاد ہو اور اس میں پوری قوم کی قوم شریک ہو۔

سول نافرمانی کی تجویز:۔

سید عالی مقام کی اس تجویز سے دو اثر مرتب ہوئے۔ بعضوں نے کہا کہ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ بعضوں نے کہا دیکھا آخرکار احرار ہی قوم کے کام آئی، یہ خان بہادر، سر اور نواب اب کہیں نظر نہیں آتے۔

احرار کی میٹنگ پھر شروع ہوئی۔ شاطروں کی پہلی چال ذرا سی ناکام رہی۔ مگر شاطروں کی قوم حوصلے والی قوم ہوتی ہے۔ ہجوم پھر مشتعل کر دیا گیا۔ میٹنگ کے اندر اب بحث اس نکتے پر آکر رک گئی کہ عدالت میں چارہ جوئی اب بہانہ جوئی کے مترادف سمجھی جائیگی اس لئے سول نافرمانی کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ ایسی سول نافرمانی میں پوری قوم کو شریک کیوں نہ کیا جائے۔ مگر اس کے لئے پھر التوا ضروری تھا اس لئے یہاں بحث بند ہو جاتی تھی۔

چوہدری افضل حق کی رائے:۔

چوہدری افضل حق کا خیال تھا کہ سول نافرمانی کا مسئلہ طے شدہ ہے۔ مگر شہر کے دوسرے رہنماؤں سے بھی اشتراک کی درخواست ضروری ہے۔ تاکہ نقصان کی صورت میں یہی دوسرے رہنما قوم کو یہ کہہ کر نہ بھڑکائیں کہ دیکھا ہم عدالت کے ذریعے سارے مسائل حل کرا لیتے۔ یونہی مسلمانوں کا خون کرا دیا اور بات بھی ٹھیک تھی۔ مگر شاطر کہہ یہ تھا کہ باہر کے ہجوم کو کسی طرح مطمئن کیا جائے۔ عالی مقام سید عطاء اللہ شاہ بخاری بڑے راست پسند آدمی تھے مگر سیاست میں باہر کے شاطروں کی ماریں کھا کر یہ ضرور ماننے لگے تھے کہ شاطروں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنا نہیں چاہیئے۔ تاہم مسئلہ کے حل کی جو صورت بھی سامنے آتی

وہ خطرناک اور نازک ہی معلوم ہوتی تھی۔

امیرِ شریعتؒ کا فیصلہ اور بحث کا خاتمہ:۔

اب سہ پہر ہو چکی ہے اور چار بجا چاہتے ہیں۔ اور ہجوم اور بھی بڑھتا جا رہا ہے الغرض کی آوازیں اتنی بلند اور گونج دار ہوتی جا رہی ہیں کہ مجلسِ بحث میں لوگ ایک دوسرے کی بحث کو سن بھی نہیں سکتے۔ دفعتاً سید صاحبؒ اٹھ کھڑے ہوئے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور دیر تک سجدے میں رہے۔ اور جب سجدے سے اٹھے تو ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور زبان پر یہ الفاظ

اللھم صلی علی محمد و آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم

کہتے ہوئے پھر مجلس میں داخل ہوئے اور فرمایا۔ آج ہمارا طریق کار صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ شہر کے سرکاری رہنماؤں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اور ہر مصلحت سے آنکھ بند کر کے ناموس رسولؐ کے لئے ہر وہ اقدام کیا جائے جس کی ضرورت ہو۔ یہ فرمانے کے بعد فرمایا۔ بس میری یہی رائے ہے فقط۔

جلسۂ عام کا اعلان اور دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ:۔

حضرت سیّد صاحبؒ کے اس نعرۂ حق کے بعد بحث و استدلال کا چراغ گل ہو گیا اور ساری جماعت نے سیّد عالی مقام کی پیروی کرنے کا اعلان کیا اور فیصلہ ہوا کہ دہلی دروازے کے باہر جلسہ عام کی فوری منادی کرا دی جائے۔ جہر علم دین دجن کی اسیری کی مدت میری دانست میں بالقساط پندرہ برس سے کم نہ ہو گی) کی آنکھیں چمک اٹھیں اور چہرہ غیرتِ دینی سے تمتما اٹھا۔ ڈھنڈورا پیٹنے والے اطراف شہر میں پھیل گئے۔

اب ہجوم شہر کی کوتوالی سے لے کر اکبری دروازے تک پھیل گیا اور احرار کے رضاکار باغ میں پلیٹ فارم جمانے میں مصروف ہو گئے۔ اب لوگ کوتوالی سے سرک سرک کر باغ میں پلیٹ فارم کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ اس اثنا میں شاطرانِ شہر نے حکام سے مل کر

ان پر اثر ڈالا کہ فرقہ وارانہ فساد کا سخت خطرہ ہے۔ جلسہ رد کیا جائے ورنہ بڑا خون خرابہ ہو گا احرار ابھی اپنے انتظامات درست کر ہی رہے تھے کہ پولیس کی ایک مسلح گارد (انگریز) کے سمیت اور شاہد سٹر فیلبوس سٹی مجسٹریٹ کی معیت میں دفتر احرار کے سامنے پہنچی اور اپنے خاص ایلچی کے ذریعے احرار رہنماؤں کو مطلع کیا کہ حکومت کے نزدیک مجوزہ جلسہ عام نقضِ امن کا باعث ہو گا۔ اس لئے جلسہ ممنوع قرار دیا جاتا ہے اور اس تاریخ سے ایک ماہ تک کے لئے دفعہ ۱۴۴ نافذ کی جاتی ہے۔

عزم امیر شریعتؒ:-

اب احراری رہنماؤں کو ایک نئی مشکل پیش آئی۔ موضوع بحث یہ تھا کہ اگر اس حکم کے باوجود جلسہ کیا جائے تو فائرنگ کا ہونا یقینی ہے اور اس صورت میں نقصانِ جان کی ذمہ داری کا سوال ہے۔ ایک تجویز یہ ہوئی کہ سارے احراری لیڈر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں۔ مگر سوال پیدا ہوا کہ ہجوم کی تسکین کے علاوہ اس سے اصل مسئلہ کا حل کس طرح نکلے گا۔ بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ تھا۔ مگر اب سید عالی مقام فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے فرمایا آج جلسہ ہو گا اور ضرور ہو گا۔ البتہ چوہدری افضل حق کی تجویز پر یہ فیصلہ ہوا کہ کھلی جگہ جلسہ کرنے کی بجائے وطن بلڈنگ کے احاطے میں جلسہ کیا جائے اور حکومت کے رویہ کے خلاف احتجاج کے علاوہ توہینِ رسولؐ کے مسئلہ پر مسلمان قوم کی کسی متحدہ روش کی تجویز پر غور کیا جائے۔

چوہدری افضل اور مجسٹریٹ کے درمیان گفتگو:-

احراری رضا کار اس فیصلہ کو لے کر ہجوم میں پھیل گئے اور اب لوگوں کا اجتماع وطن بلڈنگ میں ہوتا گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ احراری رہنماؤں نے مسجد شاہ محمد غوثؒ میں نماز ادا کی اور بعد از نماز معمولی سی کھلی مشاورت کے بعد جلسہ گاہ کا رخ کیا۔ یہ راہنما احاطہ کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ سٹی مجسٹریٹ نے احاطے کے اندر کے جلسہ کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ اس پر ان کے اور چوہدری افضل حق کے درمیان دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ ہجوم سے

بات کرنے کا موقع ضرور دیا جائے تاکہ لوگ پرامن طریق سے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ مگر مجسٹریٹ نے ضد کی۔

سول نافرمانی کا فیصلہ اور شاہ صاحبؒ کی تقریر:-

اس صورتِ حال کو دیکھ کر سید عالی مقامؒ نے احراری رہنماؤں کو مشورہ دیا کہ اب حکومت سے ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا گیا اور بشرطِ ضرورت جلسہ شروع ہو گیا جس کی صدارت چوہدری افضل حق ایم، ایل۔ اے نے کی۔

میں نے مرحوم سید عطا اللہ شاہ بخاری کی بیسیوں تقریریں سنی ہیں مگر اس رات کی تقریر کچھ ایسی تھی جس کا نقش کبھی مٹ نہ سکے گا۔ مگر تقریر سے زیادہ سید صاحب کی تدبیر کا بھی اسی روز قائل ہوا۔ احاطہ مختصر تھا اور ہجوم زیادہ اور خطرہ یہ تھا کہ باہر کا ہجوم کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جس سے پولیس کو فائرنگ کا بہانہ مل جائے۔ میں نے دیکھا کہ اکثر احراری رہنما (ہر چند کہ وہ بھی شعلہ بیان تھے) بے بسی کے عالم میں تھے۔ اس لئے صدر جلسہ نے اغراض اور صورتِ حال پر معمولی سی روشنی ڈالنے کے بعد فرمایا کہ آج ہماری باگ ڈور سید عالی مقامؒ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے آپ انہی کے احکام سماعت کیجئے۔ سید صاحبؒ نے سب سے پہلے باہر کے ہجوم سے خطاب کیا "اے شمع رسالت کے پروانو! میں جانتا ہوں کہ آج تم شوقِ شہادت میں یہاں بے تابانہ آئے ہو۔ مگر حفاظتِ رسولؐ کی لڑائی تم سے نظم و ضبط کا تقاضا کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شہر لاہور بلکہ مسلمانانِ ہندوستان کا بچہ بچہ اپنی اپنی باری سے قربانی پیش کرے۔ لہٰذا جو لوگ دروازے سے باہر کھڑے ہیں، دو دو چار چار کی ٹولیاں بن کر اور بکھر کر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں۔ ان کی باری کل آئے گی اور جو لوگ احاطے کے اندر ہیں وہ پولیس یا فائرنگ کے خوف سے اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور ایک نظم اور قاعدہ کے تحت اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دیں۔

شاہ جی کی تقریر:۔

دروازے پر غُل ہوا، معلوم ہوا کہ شاطران شہر کے کچھ کارندے لوگوں کو سید صاحبؒ کی تقریر کے خلاف مشتعل کر رہے تھے اور اس پر ملک لال دین قیصر اٹھے اور دروازے پر کھڑے ہو گئے اور باہر کے ہجوم کو سید صاحب کے اعلان سے باخبر کیا، ملک لال دین قیصر موقعہ پر گرفتار ہو گئے مگر باہر کا ہجوم منتشر ہو گیا۔ اب سید صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ تقریر کیا تھی آنسوؤں اور شعلوں کا اجتماع تھا۔ جوش کی انتہا تھی اور آہ و کراہ کی آوازیں ہر طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے سید صاحب کی تقریر کے الفاظ یاد نہیں رہے مگر ایک دو فقرے ابھی تک دماغ میں کھنچے ہوئے ہیں

"اے مسلمانانِ لاہور آج جناب رسول صلعم کی آبرو تمہارے شہر کے ہر ہر دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اے امتِ رسول صلعم آج ناموس محمدی کی حفاظت کا سوال درپیش ہے اور یہ سانحہ سقوط بغداد سے بھی زیادہ غمناک ہے۔ زوالِ بغداد سے ایک سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تھی مگر توہین رسولؐ کے سانحہ سے آسمانوں کی بادشاہت متزلزل ہو رہی ہے"

تقریر سید صاحبؒ کی تھی۔ مگر اس روز سید صاحبؒ اپنی معمول کی تقریر کے موڈ میں نہ تھے اور یہ معلوم ہے کہ سید صاحبؒ کی عام تقریروں میں ظرافت اور بذلہ سنجی کا عنصر اصل موضوع کے برابر ہوا کرتا تھا۔ مگر اس روز پانی اور آگ کی ترکیب سے یعنی سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے ملاپ سے ان کی تقریر ڈھل رہی تھی۔ یہ اور ہی طرح کی تقریر تھی

شاہ جی کا پولیس سے خطاب:۔

احاطے کے اندر تقریر ہو رہی تھی اور باہر پولیس کی جمعیت زیادہ سے زیادہ صف آرا ہوتی جاتی تھی۔ رات گذری جا رہی تھی اور پولیس والوں کا دل قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ آخر سید صاحب نے پولیس والوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اے پولیس والو

ہم یہاں صرف ماتم کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو۔ اگر تم ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہو تو ہم حاضر ہیں اور اگر ہمارے ساتھ وہ سلوک مطلوب ہے جو ایک سیّد زادے کو وراثت میں ملا ہے تو ہمارے سینے اس کے لئے بھی حاضر ہیں۔ اس پر جلسہ میں شدید زور کی لہر اٹھی اور لوگوں نے کہا ہماری جانیں بھی حاضر ہیں۔ شہر کا کوتوال زیرک آدمی تھا۔ اس نے جلسہ گاہ کے قریب آ کر سید صاحبؒ سے کہا آپ جلسہ جاری رکھئیے۔ دفعہ ۱۴۴، صرف باغ کی حدود تک ہے۔ مگر اب پبلک کا جوش بہت بڑھ چکا تھا۔ سینکڑوں آدمی شہادت کے شوق میں بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر چوہدری افضل حق نے کہا (جو آئینی حدود کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے) صاحبو! وہ وقت بھی آنے والا ہے جب ہمیں تمہاری جانوں کی ضرورت ہوگی۔ مگر ابھی وہ وقت آیا نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہم اس قانون کے پرخچے اڑا دیں جو ہمیں توہین رسولؐ پر اظہار غم سے روکتا ہے۔ چنانچہ عام سول نافرمانی کا اعلان ہوگیا۔

شاہ جیؒ کی گرفتاری:۔

دس دس اور پھر پانچ پانچ آدمیوں کے دستے پلیٹ فارم کے پاس جاتے تھے اور سیّد صاحبؒ کی قدم بوسی کر کے باغ کی طرف جا کر گرفتار ہو جاتے تھے۔ ہزاروں آدمی اس شب گرفتار ہوئے۔ میرے پاس میرا دوست مولوی خدا بخش کھڑا تھا۔ اُس کا بھائی اور اس کے بھانجے سب گرفتار ہو چکے تھے۔ میں نے اس کو روک رکھا تھا کہ تمہارے لوگ جا چکے ہیں۔ تم سب لوگوں کے گھروں میں ایک مرد بھی اب باقی نہیں جو خبر گیری کرے۔ تمہارا جانا مناسب نہیں۔ مگر وہ دیوانہ وار اٹھا اور سیّد محترمؒ کے قدموں میں جا گرا اور پھر چار پانچ آدمیوں کے ہمراہ باہر چلا گیا اور گورے کا ڈنڈا کھانے کے بعد گرفتار ہو گیا اور میں (اس وقت بھی صید لاغر کی طرح بے مصرف ہی رہا)

نے خون ہو آنکھوں سے بہا تک نہ ہوا داغ
اے خون شدہ دل تو کسی کام نہ آیا!

جب سول نافرمانی کرنے والوں کی آخری ٹولی بھی چلی گئی تو احرار لیڈروں کی جماعت

سید صاحبؒ مرحوم کی سرکردگی میں باہر نکلی اور سید صاحبؒ کے پُر درد طریق سلام و صلوات کی گونج میں باغ کے قریب جا پہنچی اور وہیں گرفتار ہوگئی اور اس طرح یہ شب ختم ہوگئی اور میرے ذہن پر سید عالی مقام کا اَن مٹ نقش چھوڑ گئی۔

احرار کے بڑے بڑے لیڈر تو گرفتار ہوگئے، مگر سول نافرمانی اضلاع میں پھیل گئی اور آخر میں یہ اثر ہُوا کہ آنحضرتؐ کے خلاف زبان کشائی کرنے والوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

عبداللہ ملک

شاہ جی اور

احرار کانفرنس قادیان

پچیس ۲۵ برس پہلے کی بات:۔

یہ دلفریب موسم تھا سورج کی کرنوں کی چبھن کم ہو رہی تھی۔ شاموں کا حسن نکھر رہا تھا۔ ان ملگجی شاموں کو باغوں اور پارکوں میں ہجوم بڑھنے لگا تھا، سبزہ پھوٹ رہا تھا۔ ہریالی آرہی تھی، ٹنڈ منڈ درختوں پر پتے پھر سے نمودار ہو رہے تھے، باغوں اور میدانوں میں خوشبوئیں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں۔ مجھے آج ایک ایسے ہی موسم اور ایسے ہی دنوں کی بات کرنی ہے۔

آج بھی یہ موسم آتا ہے، آج بھی کونپلیں پھوٹتی ہیں، ہریالی آتی ہے۔ باغوں اور پارکوں میں سرشام لوگوں کے ہجوم جمع ہوتے ہیں تاکہ وہ اس حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن جو بات میں بتانا چاہتا ہوں وہ بات اب نہیں ہوتی۔

ان نئی بہاروں پر، ان نئے نظاروں پر
ایک رند ہی کے رو رہے ہیں میخانے

یہ پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ اُن دنوں کی یاد کو سینے سے دبائے ایک مدت گزر گئی ہے۔ اب بھی جب یہ دن یاد آتے ہیں تو جذبات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ماضی کی ان یادوں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے۔

قادیان میں احرار کانفرنس

ایسے ہی موسم میں جب شاموں کا حسن نکھر آیا تھا اور راتیں خنک ہونی شروع ہو گئی تھیں تو قادیان میں احرار نے کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا تھا۔ صرف انعقاد کا اعلان اور وہ بھی مجلسِ احرار کی طرف سے ایک زبردست ہنگامے کی دعوت تھی۔ آج پچیس برس گزرنے کے بعد شاید نئی پود ان ہنگاموں کو سمجھ ہی نہ سکے اور نہ ہی کوئی مورخ بیان کرنے کے لئے تیار ہو لیکن اس کے باوجود خطابت کی تاریخ اور شعلہ نوائیوں کی داستان میں یہ کانفرنس اپنا عنوان ڈھونڈ کر رہے گی۔ ہاں تو جن دنوں اس کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا اس وقت پنجاب میں مجلس احرار کا طوطی بول رہا تھا۔ اس شعلہ بیان خطیبوں کی جماعت نے غیر مسلمانانِ پنجاب کو بہت حد تک متاثر کر لیا تھا، یہ کشمیر جیسی تحریک کا معرکہ سر کر چکے تھے۔ سر فضل حسین کی پوری کامیابیوں اور کامرانیوں کے باوجود مسلمانوں کے درمیانی طبقے میں مجلس احرار ان کی ساکھ پر ایک گہری چوٹ لگا چکی تھی۔ غرضیکہ چاروں طرف ——— شہر اور قریہ میں ان شعلہ نواؤں کے چرچے تھے۔ میں بھی ان چرچوں سے متاثر تھا۔ نویں جماعت کا طالب علم ——— مولانا داؤد غزنویؒ کے خطبوں سے شدید طور پر متاثر۔ احرار کے جلسوں کا رسیا۔ اب یہ موقع کیسے کھو سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ بزرگ دوستوں کے ساتھ قادیان روانہ ہو گیا۔

عاشقانِ رسولؐ کی قادیان میں آمد

اب پچیس برس بعد یہ یادیں دھندلا گئی ہیں۔ صرف امیر شریعتؒ کے الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں کہ قادیان میں ایک ہجوم تھا جس کو یہ قریہ جس نے "نبوت" کو تو سنبھال لیا تھا لیکن وہ امیر شریعت کے چاہنے والوں کو سمیٹنے سے قاصر تھا، کوئی گاڑی، کوئی بس، کوئی بیل گاڑی کوئی ٹم ٹم، کوئی تانگہ، کوئی سائیکل ایسی نہ تھی ——— جو قادیان کی طرف نہ آ رہی ہو اور رضاکار دنوں پہلے پیدل چل دیئے تھے۔ جیسے جیسے یہ مختلف دیہات میں گزرتے دیہات والے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے اور قادیان پہنچتے پہنچتے یہ خود ایک جلسہ بھی بن جاتا اور ایک جلوس بھی، یہ پہلی

تحریک تھی جس نے یہاں کے مسلمانوں کے دونوں جذبوں کو بیک وقت متاثر کیا۔ ان کے نعرے ان کے جذبہ عشقِ رسول کو بھی متاثر کرتے تھے اور ان کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی کے جذبے کی بھی ان نعروں سے تشفی ہوتی تھی۔

اہل قادیان کی کانفرنس میں گڑبڑ ڈالنے کی کوشش

اور

حکومت کی احتیاطی تدابیر

اس کانفرنس کا انعقاد اکتوبر ۱۹۳۴ء کے تیسرے ہفتے میں ہوا اور اس کانفرنس کیلئے ۲۱، ۲۲ اور ۲۳ اکتوبر کی تاریخوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے لئے ایک سکھ زمیندار کی اراضی حاصل کی گئی تھی۔ اس زمیندار کا نام ایشر سنگھ تھا۔ اس اراضی پر پنڈال بھی تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن مرزائیوں نے اس اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اب احراریوں کے لئے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا تو وہ اس اراضی کے لئے لڑتے یا شہر سے دور کانفرنس منعقد کرتے۔ احرار نے جھگڑا کرنے سے گریز کیا۔ کیونکہ اس وقت مرزائیوں کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ فساد کرایا جائے اور اس بنا پر کانفرنس کو امن عامہ کے خلاف ثابت کر کے بند کروا دیا جائے۔ مجلس احرار مرزائیوں کے ان ارادوں کو بھانپتی تھی۔ چنانچہ اس اشتعال کے باوجود مجلس احرار نے ایشر سنگھ کی اراضی پر کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے بعد قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ڈی۔ اے۔ وی سکول کے پہلو میں پنڈال تیار کیا گیا۔

کانفرنس سے دو دن پہلے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار نے قادیان سے یہ خبر بھیجی تھی کہ جس میں اس کانفرنس کے خدوخال اور اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا

"مجلس احرار ۲۱، ۲۲ اور ۲۳ اکتوبر کو ایک تبلیغی کانفرنس قادیان میں منعقد کر رہی ہے۔ اس کانفرنس کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مرزائیوں کی طرف سے مسلسل یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ اس کانفرنس سے ان کا جان و مال خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ مرزائیوں

نے اپنی حفاظت کے لئے لاتعداد دیہاتیوں کو اور اپنے مریدوں کو قادیان میں جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اِدھر احرار کی اس کانفرنس میں ۲۰ سے لے کر ۵۰ ہزار کا ہجوم ہے۔ مزید برآں کانفرنس کے منتظمین کا مطالبہ ہے کہ ان کو کانفرنس کے صدر کا جلوس نکالنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اور یہ جلوس قادیان شہر میں سے گزرے۔

اس کانفرنس کے پیشِ نظر آج صبح پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس خود بہ نفسِ نفیس قادیان آئے۔ ان کے ہمراہ پولیس کی بھی ایک بھاری جمعیت تھی۔ چنانچہ انسپکٹر جنرل پولیس نے کانفرنس وغیرہ کا موقعہ دیکھا اور احکام جاری کر دیئے کہ اگر اس کانفرنس کے دوران قادیانیوں نے کوئی اجتماع منعقد کرنے کی کوشش کی تو یہ اجتماع خلافِ قانون تصوّر ہو گا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے احراریوں اور ان کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو بھی متنبہ کیا کہ وہ کانفرنس میں کسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ لاٹھیوں کو ساتھ لانے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ مزید برآں کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے لوگوں کے لئے ایک خاص راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ نیز اگر کسی قسم کا جلوس نکالا جائے تو اُسے شہر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔

یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ آج تک قادیان میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے چار سو پولیس کے سپاہی پہنچ جائیں گے۔ احراری ہر حالت میں کسی قسم کے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہتے ہیں۔ اس کانفرنس کا پنڈال ڈی۔ اے۔ وی سکول میں بننا شروع ہو گیا ہے اور ارد گرد کے تمام علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ مزید لاٹھیاں ساتھ نہ لانے کی بھی منادی کرا دی گئی ہے۔"

امیر شریعتؒ کی کانفرنس میں آمد اور تقریر

اس اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے پنجاب میں اس کانفرنس کے کس قدر چرچے تھے اور کتنے گوشوں سے اس کانفرنس کی کامیابی اور ناکامی کی خبروں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اس فضا میں یہ کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے۔ چنانچہ

رات جب اپنا پورا سایہ ڈال چکی لوگ عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے تو اس کانفرنس کے صدر سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ تشریف لائے۔ ہزارہا انسانوں کا ہجوم اور امیر شریعتؒ کی پنڈال میں آمد۔ اور کون سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ ملتان کی سرزمین میں دفن ہونے والا سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ نہیں۔ وہ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ نہیں جس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ جس کے چہرے کا جھریوں نے احاطہ کر لیا تھا جس کے بالوں میں بڑھاپے کی سفیدی آ گئی تھی۔ یہ وہ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ تھا۔ جس کا شباب اور شعلہ بیانی دونوں اپنے عروج پہ تھے جو لاؤڈ اسپیکر کے بغیر لاکھوں کے مجمعے کو مسحور کر سکتا تھا جس کا حسن اور بیان دونوں الگ الگ جادو جگاتے تھے سچاس ہزار کا مجمع، رات کی خاموشی، قمقموں کی روشنی اور اتنے میں حسن و نور کے پیکر، شعلہ بیان خطیب اور شریعت کے امیر کی آمد ؎

"تم آ گئے تو از سرِ نو زندگی ہوئی"

بس پھر کیا تھا۔ مجمع میں کہاں ایک خاموشی اور ہُو کا عالم تھا اور اب وارفتگی اور دیدارِ یار کی بے تابی نے سب کو آن گھیرا ہے۔ اور اس بے تابی اور وارفتگی کا اظہار نعروں کی گونج میں ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ ہیں کہ مسکراتے ہوئے۔ مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اسٹیج پہ پہنچے، چاروں طرف نگاہ مست انداز سے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا، نعروں کا ایک اور سیل ٹوٹ پڑا —— اور امیر شریعت فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ مجمع خاموش ہوا، تلاوت ہوئی نظم ہوئی۔ اب سے پچیس برس پہلے کی تفصیلوں کو دہرایئے اور انہی تفصیلوں کو جن پر شاہ صاحبؒ کی تاریخی تقریر کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے بھی کوئی ساڑھے نو بجے تقریر شروع کی ہوگی اور رات تھی کہ وہ بھی دم بخود گزرے جا رہی تھی۔ لیکن شاہ صاحبؒ کی شعلہ بیانی بڑھتی جا رہی تھی اور اس شعلہ بیانی اور آتش نوائی کو قدم قدم پر نعروں، قہقہوں اور آنسوؤں کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش ہو رہا تھا۔ یہی وہ تقریر ہے جس میں شاہ صاحب نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا

"وہ (مرزا محمود) نبی کا بیٹا ہے اور میں نبیؐ کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے اور مجھ سے اردو، پنجابی، فارسی، ہر زبان میں بحث کرے۔ یہ جھگڑا آج ہی طے پا جاتا ہے

وہ پردے سے باہر نکلے، نقاب اٹھائے۔ کشتی لڑے، مولا علی کے جوہر دیکھے ہر رنگ میں آئے، میں ننگے پاؤں آؤں وہ ہریرہ و پرنیاں پہن کر آئے۔ میں موٹا جھوٹا پہن کر آؤں وہ مزعفر کباب یا توتیاں اور اپنے آبا کی سنت کیمطابق پلو مرٹانک وائن پی کر آئے۔ میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں یہیں میدان یہیں گو۔"

یہ تقریر جو رات کی خاموشی میں شروع ہوئی تھی۔ جو عشاء کی نماز کے بعد جب ابھی رات کا آغاز تھا لوگوں نے سننی شروع کی تھی۔ یہ تقریر پوری رات ہوتی رہی اور مجمع بیٹھا رہا۔ ایک بھی ذی نفس ایسا نہیں تھا جس نے تھکن کا اظہار کیا ہو۔ جس کے چہرے سے اکتاہٹ کی غمازی ہوئی ہو۔ اتنے میں صبح کا نور پھیلنا شروع ہو گیا اور مؤذن نے اذان دے دی، تقریر تھی کہ اس وقت بھی اپنے عروج پر تھی۔ لیکن مؤذن نے اس سیلِ رواں کو روک دیا اور خطابت کے دریا کو بند مار دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں بہت کم خطیب اور مقرر ایسے گذرے ہیں جنہوں نے رات رات بھر تقریر کی ہو، جنہوں نے لوگوں کو اس قدر مسحور کیا ہو۔ جیسا کہ امیر شریعت نے کیا ہے۔

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن
کیا کریں گر نہ انتظار کریں

اور غالباً اسی موضوع کو حسرت موہانی نے کہا ہے

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں
خرابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں

مؤرخین کے لئے لمحۂ فکریہ

آج ربع صدی گذرنے کے بعد جب ہم اس عظیم ہستی کی یادیں سمیٹ رہے ہیں۔ تو کچھ حلقوں میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے۔ کہ آخر یہ ہستی اتنی اہم کہاں تھی۔ کہ اس کی یاد میں آنسو بہائے جائیں صفحات سیاہ کئے جائیں۔ اخبارات اور رسالوں کے نمبر نکالے جائیں۔ آخر احراری یا شبخاری نے کون سے

کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ کہ ان کے کارناموں کی فہرست جو افتراق وانتشار انگیز تحریکوں سے بھری پڑی ہے اس لئے ان کو دوبارہ ہوا دینی کہاں کی خدمت اور کہاں کی نیکی ہے۔

یہ سب سوالات آج کل بہت سے حلقوں میں اٹھائے جارہے ہیں۔ آج ضروری ہے کہ ان سوالات کے جوابات دیئے جائیں، تاکہ تاریخ کی گرہیں کھل سکیں۔ اور جن تحریکوں کو افتراق و انتشار کا مظہر بتایا جاتا رہا۔ یا آج بنایا جارہا ہے۔ اس کے متعلق مؤرخ کو مواد مل سکے۔

مجھے اس سلسلہ میں صرف ایک مختصر سے سوال کا جواب دینا ہے۔ یہ سوال پچھلے چالیس پچاس سال سے اٹھایا جاتا رہا ہے کہ قادیانیوں اور احمدیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں میں افتراق پھیلانے کے مترادف نہیں ہے؟ ایک اور طبقے کی طرف سے بھی یہ سوال اٹھایا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی سیاست کو مذہب کو تابع بنایا جارہا ہے اور اس طرح غلط اقدار اور رجعت پسند نظریات کو شہ دی جارہی ہے؟ ان سوالوں کا جواب تفصیل چاہتا ہے اور ان کا جواب پچھلے ۵۰ برس کی تحریکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک بات واضح ہے کہ قادیانیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں کی ایک بہت اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بڑی سامراج دشمن تحریک تھی اور پنجاب میں سامراج اور اس کے مسلمان خلیفوں کو شکست دینی اس وقت تک ممکن نہیں تھی —— جب تک قادیانیوں کا طلسم نہ توڑا جاتا اور عوام کو ان کی اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا جاتا۔ باقی دوسرے سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ سامراج اور رجعت پسند طاقتیں اکثر و بیشتر غلط مذہب اور لوگوں کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے اثر کو عوام میں پھیلاتے ہیں، اس لئے سامراج دشمن تحریکوں اور جماعتوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سامراج کی ان سازشوں کو بھی بے نقاب کریں اور آج یہ حقیقت ہے کہ پنجاب میں اس وقت میں مجلس احرار نے سامراج کی اس سازش کو بے نقاب کیا تھا۔ اس سلسلے میں تاریخ کے لکھنے والوں کو بہر حال توجہ کرنی چاہیئے۔

شاہ جی کی گرفتاری اور سزا

امیر شریعت کی اسی تقریر کی بنا پر ۱۵۳ الف کے تحت ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور

ان پر مقدمہ چلا اور ان کو ماتحت عدالت نے سزا سنا دی۔ لیکن جی۔ ڈی کھوسلہ جو ان دنوں گورداسپور میں سیشن جج تھے نے امیر شریعت کی سزا کو گھٹا کر تا برخاست عدالت تک رہنے دیا اور اپنے فیصلے میں احمدیت کے متعلق بہت ہی سخت تجزیہ کیا ——— اور احمدیوں نے قادیان میں اپنے مخالفین پر مظالم کو تسلیم کیا۔ اس فیصلے پر زبردست لے دے ہوئی۔ اور احمدیوں نے بالآخر ان ریمارکس کو حذف کروانے کے لئے ہائیکورٹ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ مقدمہ بذاتِ خود ایک داستان ہے۔ اسے کسی اور وقت مرتب کرنے کا ارادہ ہے۔

شاہ جیؒ کی

انجینئرنگ کالج لاہور پر یلغار

یہ ایک رات کا واقعہ ہے۔ تیس اکتیس برس پہلے کی ایک رات کا! نصف شب کو جب چاروں طرف خاموشی تھی تو تقریباً دس بارہ ہزار افراد کا ہجوم نعرۂ اللہ اکبر اور نعرۂ رسالت یا رسول اللہ دہرا کر باغبانپورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس سے آگے آگے سرخ و سفید نورانی چہرے، ملگجی داڑھی اور لمبے بالوں والا چالیس برس کا ایک بزرگ قدم بڑھا رہا تھا، یہ قائد سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے۔ اس رات وہ اپنی شعلہ بیانی کا ادنیٰ کرشمہ دکھا رہے تھے۔ وہ موچی دروازہ کے باغ سے پورے جلسے کو مغلپورہ انجینئرنگ کالج کی طرف لے نکلے تھے۔

اُس زمانے میں مغلپورہ انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل کے خلاف تحریک زوروں پر تھی آج اس تحریک اور اس نہج کی دوسری تحریکوں پر کوئی قلم نہیں اٹھاتا اور ان تحریکوں کے

پس پردہ ہاتھوں کی نشاندہی کرنے والے اب بھی خاموش ہیں۔ ورنہ کئی پرلطف داستانیں سننے میں آئیں اور کئی ایک دلچسپ محرکات کا پتہ چل سکے۔ بہرحال یہ تحریک مغلپورہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کے خلاف تھی۔ یہ پرنسپل انگریز تھا اور اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے حضور اکرم کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اس پر مسلمان طلبہ میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ تحریک چل نکلی۔ شہر کے کئی ایک علماء نے آگے بڑھ کر اس تحریک کی قیادت سنبھالی اور گرفتار کر لئے گئے۔ ان میں مولانا احمد علیؒ، مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا مخدوم مرشد بھی تھے۔ ان گرفتاریوں کے بعد موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ عشاء کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا اور تقریباً نو بجے کے قریب شاہ صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ ان کی آمد نے پورے جلسہ گاہ میں ہیجان بپا کر دیا۔ ابھی لاؤڈ اسپیکر عام نہیں ہوا تھا اور مقرر کو اپنے گلے اور پھیپھڑوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ جلسہ گاہ میں بلا کی خاموشی تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ صاحبؒ نے اپنی تقریر کا آغاز کیا، یہ خاموشی یہ ہجوم اور ناموس رسولؐ کا موضوع، پھر کیا تھا۔ شاہ صاحبؒ کی شعلہ نوائی انتہا پر تھی۔ ایک ایک لفظ سحر البیان بنتا چلا گیا اور جب تین چار گھنٹے گذر گئے تو دس بارہ ہزار کا یہ ہجوم سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ رات کے ایک بجے وہ مسحور مجمع کو اپنے ساتھ لئے مغلپورہ انجینئرنگ کالج کی طرف بڑھنے لگا۔ تاکہ جب مؤذن فجر کی نماز کے لئے دعوت دے تو یہ ہجوم مغلپورہ کالج کے سامنے ہی نماز ادا کرے اور وہیں ناموسِ رسولؐ کی حفاظت کے لئے پکٹنگ شروع کر دے۔ اس ہجوم میں ایک ذی نفس بھی ایسا نہ تھا جس نے شاہ صاحبؒ کی آواز پر لبیک نہ کہی ہو۔ یا اس کے قدم مغلپورہ کالج کی طرف اٹھنے کی بجائے گھر کی طرف اٹھے ہوں۔

نئی پود شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے جولیس سیزر میں انتونی کی تقریر پر تو عمر بھر سر دھنتی رہے گی کہ سیزر کی نعش پر جو ہجوم جمع ہوا تھا اسے اپنے زورِ خطابت سے اس نے کس طرح مشتعل کر دیا اور بروٹس کی ساری منطق اور تمام دلائل دھرے کے دھرے رہ گئے۔ معلوم نہیں انتونی کی تقریر نے یہ اثر کیا تھا یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ امیر شریعتؒ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریروں سے بارہا

یہ جادو جگایا ہے۔ انہوں نے تحریکوں کے رُخ پلٹ دیئے۔ عوام کے غم و غصّہ کو نعرۂ تحسین میں بدل دیا اور جو لوگ عطا اللہؒ کے لئے جوتے لے کر آئے تھے وہ اپنی جیب کی آخری پائی تک اس کے قدموں میں اس کی تحریک کے لئے نچھاور کر کے اٹھے۔ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کے پائے کا خطیب اور مقرر اس برصغیر میں پچھلے چالیس برس میں پیدا نہیں ہوا۔ شاہ صاحب نے اپنی سیاسی زندگی اور خطابت کا آغاز ۱۹۲۰ء کے ہنگامہ خیز دور میں کیا۔ ۱۹۲۰ء کا ہنگامہ خیز دور اس پر سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی شخصیت کا سحر اور زبان کا جادو ـــــ انہوں نے پورے ملک میں ایک آگ لگا دی ہے اور سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ نے اس زمانے میں اپنی خطابت کا لوہا منوایا۔ جب مولانا ابو الکلام آزاد بھی اپنے شباب پر تھے۔ جب مولانا محمد علی کا ستارہ بھی عروج پر تھا۔ مگر شاہ صاحبؒ چالیس برس تک اقلیم خطابت کے واحد سلطان تسلیم ہوتے رہے۔

شاہ صاحبؒ کی تقریروں کی داستانیں پاک و ہند کے اکثر شہروں میں بکھری پڑی ہیں مگر امرتسر اور لاہور کے گلی کوچوں اور باغوں اور میدانوں کو ان کا بیشتر حصّہ ملا ہے اور کوئی انہیں یکجا کر دے تو یہ بھی ایک کارنامہ ہوگا۔ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ غالباً پہلے ہی خطیب ہیں جو نماز عشاء کے بعد تقریر کے لئے کھڑے ہوتے اور نماز فجر تک سلسلۂ کلام جاری رکھتے۔ شاہ صاحبؒ کی مشہور تقریر جس کی وجہ سے ان پر مقدمہ بھی چلا تھا وہ قادیان میں ہوئی۔ یہ غالباً ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ اجلاس کے صدر سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ تھے انہوں نے اپنی صدارتی تقریر کا آغاز عشاء کی نماز کے بعد کوئی نو اور دس بجے کے درمیان کیا تھا اور فجر کی نماز بھی شاہ صاحبؒ ہی نے اپنی تقریر کے اختتام پر پڑھائی تھی۔ اسی تقریر کی بنیاد پر ان کے خلاف "ملک معظم" کی رعایا کے مختلف فرقوں میں منافرت پھیلانے کے الزام میں چلایا گیا تھا۔

امیر شریعت کا خطاب

۱۹۲۰ء میں لاہور کے شیرانوالہ دروازے کے باہر باغ میں انجمن خدام الدین کا پہلا اجلاس

ہوا۔ یہ تین روزہ کانفرنس تھی۔ اور اس میں برصغیر کے سرکردہ علماؒ شریک تھے اور ایک جلسے کے صدر شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کاشمیری تھے۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ کا رتبہ علمائے دیوبند اور اس کے باہر بھی بہت بلند تھا۔ ہر مکتب خیال کے علماؒ ان کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی موجودگی میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ تقریر میں وہ کیف اور جوش تھا کہ صرف سامعین ہی نہیں بلکہ خود حضرت انور شاہ صاحبؒ بھی مسحور ہو گئے۔ تقریر کے اختتام پر انہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ صحیح معنوں میں امیر شریعت کہلانے کے مستحق ہیں اور یہ کہہ کر اپنا ہاتھ بیعت کیلئے امیر شریعت کی طرف بڑھا دیا۔ یہ ہاتھ بڑھنا تھا کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ پر رقت طاری ہو گئی اور کہا کہ نہیں مجھے آپ اپنے ہاتھ پر بیعت ہونے کی سعادت عطا فرمائیں۔ مگر انور شاہ صاحبؒ نے اپنا ہاتھ شاہ جیؒ کے ہاتھ میں دے دیا۔ بس پھر کیا تھا، پورا مجمع امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ چھبیس چھبیس سال پہلے حضرت انور شاہ صاحبؒ نے جو خطاب ان کو بخشا وہ مخالفتوں، دشمنیوں اور الزام تراشیوں کی مہم بھی ان سے نہ چھین سکی اور دوست دشمن سبھی ان کو امیر شریعت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے اور آج امیر شریعت چالیس برس کی سلطانی کے بعد خاموش ہو گئے۔

ہر حال میں ہر دور میں تابندہ رہوں گا
میں زندہ و جاوید ہوں پائندہ رہوں گا
ابھروں گا سدا پردۂ آفاق سے بے روک
خورشید جہاں تاب ہوں درخشندہ رہوں گا
تاریخ میرے نام کی تعظیم کرے گی
تاریخ کے اوراق میں زندہ ہوں گا۔

مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی

تحریک نمکین ستیہ گرہ

(۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء)

میں

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا حصہ

مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی خلف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے باپ کے متعلقہ اپنی کتاب رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی" میں حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

"کانگریس تحریک کے سلسلہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے طوفانی دورہ لاہور سے شروع کیا۔ وہ لاہور امرتسر میں تقریریں کرتے ہوئے جالندھر پہنچے، تو میں نے اپنے لڑکے مولانا خلیل الرحمٰن اور اپنے خاص رازدار والنٹیر عبدالرحمٰن غازی عرف ماما کے ذریعے شاہ صاحبؒ کو کہلا بھیجا کہ وہ لدھیانہ جیل میں مجھ سے مل کر امروہہ کے اجلاس جمعیت العلماء ہند میں شرکت کریں۔ جس میں کانگریس تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ تشریف لائے۔ اس موقعہ پر پنڈت من موہن سپرنٹنڈنٹ لدھیانہ جیل کی نے ملاقات کا موقعہ دیا۔ شاہ صاحبؒ پر ہر طرف سی۔ آئی۔ ڈی تھی۔ ہر قدم پر شاہ صاحبؒ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پنڈت موہن نے سکیم کے مطابق شاہ صاحبؒ کو اپنے مکان پر ٹھہرایا اور جالندھر سے آنے والی موٹر کار کو گیرج میں بند کر کے چھپا دیا۔ رات کو جیل میں خاموشی سے ملاقات ہوئی اور دو گھنٹے تک جمعیت العلماء کے اجلاس میں کانگریس کی

شرکت کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ جمعیت کے اجلاس میں ایسے لوگ بھی آئیں گے جو مسلمانوں کے دستوری تحفظ کا دروازہ کھول کر جمعیت العلمائے ہند کو کانگریس کی تحریک میں شرکت کرنے سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن آپ یہ کوشش کیجئے گا کہ دستوری تحفظ کی بحث کا دروازہ نہ کھل سکے۔ اور جمعیت العلمائے ہند غیر مشروط طور پر ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہو جائے شاہ صاحبؒ اس گفتگو کے بعد پنڈت من موہن کی کار میں بیٹھ کر انبالہ چلے گئے۔ انبالہ سے سیدھے سہارنپور ہوتے ہوئے ۲ مئی ۱۹۳۰ء کو جمعیت العلمائے اجلاس امروہہ میں پہنچ گئے۔ جمعیۃ العلمائ نوجوان پارٹی کے لیڈر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تجویز کہ جمعیت العلمائے ہند کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں شریک ہو جائے۔ پر شاہ صاحبؒ نے مجلس مضامین میں سرگرم حصّہ لیا اور کانگریس میں شرکت کے مخالفین کو آخرکار شاہ صاحب کے دلائل کے سامنے جھکنا پڑا اور متفقہ طور پر مولانا حفظ الرحمٰن کی تجویز شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تائید سے منظور ہوگئی رات کو جمعیت کے کھلے اجلاس میں حضرت مولانا شاہ معین الدین اجمیریؒ کی صدارت میں شاہ صاحبؒ نے سات گھنٹے تک تقریر کی۔ اس اجلاس میں ایک ہزار علمائ شامل تھے۔ ۵۰ ہزار سے زیادہ عوام کا مجمع تھا۔ اجلاس امروہہ کی کامیابی کا سہرا مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے سر بندھا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ امروہہ کے بعد یو۔ پی۔ بہار کا دورہ کرتے ہوئے بنگال جا پہنچے اور دیناج پور میں جاکر گرفتار ہوگئے۔ اس دورہ میں ایک لاکھ آدمی شاہ صاحبؒ کی تقریروں سے متاثر ہوکر گرفتار ہوگئے۔ گرفتار ہونے والوں میں ۳۰ ہزار مسلمان تھے۔ پنڈت موتی لعل نہرو شاہ صاحبؒ کی سحر بیانی کے عاشق تھے۔ انہیں کے پروگرام کے مطابق شاہ صاحب کام کر رہے تھے۔ الہ آباد میں جب شاہ صاحب پہنچے تو پنڈت موتی لعل کے ہاں ٹھہرے۔ پنڈت جی نے خود شاہ صاحبؒ کے کھانے کا انتظام کیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں وقت چائے بنا کر پلائی۔ پنڈت جی بار بار شاہ صاحبؒ سے کہتے کہ کانگریس ستیہ گرہ کی کامیابی صرف آپ ہی سے وابستہ ہے

کانگریس تحریک میں پنجاب کے احرار رہنماؤں کی شرکت اور شاہ صاحبؒ کے دورہ کا یہ اثر ہوا کہ گاندھی اِرون پیکٹ کے بعد جب بھی احرار رہنما گاندھی جی سے ملنے گئے تو گاندھی جی اٹھ کر

خود دروازے تک چھوڑنے آتے۔ یہ امتیازی بات تھی جو زندگی میں گاندھی جی صرف احرار رہنماؤں کی عزت و تکریم میں کی۔"

اس واقعہ سے حضرت قبلہ شاہ صاحبؒ کا جذبہ آزادی اور انگریز کے خلاف نفرت و حقارت کا ولولہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح وہ ملک کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک تحریک نمک کے حق میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے دیناج پور میں گرفتار ہو گئے۔ لاہور سے چل کر یہ مردِ مجاہد امرتسر، جالندھر۔ لدھیانہ، سہارنپور، امروہہ اور پھر ساری یو۔پی، سی۔پی، بہار، اور بنگال کو روندتا ہوا دیناج پور جا پہنچا اور کس طرح انہوں نے اپنے فنِ خطابت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک لاکھ انسانوں کے جذبات کو انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ کر لیا ان میں ۷۰ ہزار کے قریب ہندو اور غیر مسلم بھی شامل تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ آپ کی صلاحیتوں کا شکار عقیدت مندوں میں ہندو اور دوسرے غیر مسلم بھی برابر کے شامل تھے۔ یہی کام کرنے کا صلہ اور انگریزی کی مخالفت کا جنون تھا کہ پنڈت موتی لعل نہرو۔ گاندھی جی اور خود تمام کانگریس جماعت حضرت شاہ صاحبؒ کے محتاج تھے اور ان کی دل و جان سے قدر کرتے تھے اور شاہ صاحبؒ کی خدمت کرنا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ جیسا کہ پنڈت موتی لعل نے کہا کہ:۔

"شاہ صاحبؒ کانگریس میں
ستیہ گرہ کی کامیابی صرف
آپ ہی سے وابستہ ہے"

یہ تھا حضرت شاہ صاحبؒ کے کام کرنے کا طریقہ۔ جس کے آگے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے طول و عرض سکڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ تھا جذبۂ حریت کہ جس کی دھاک بڑے بڑے ہندو

لیڈروں پر پوری سطوت و شوکت کے ساتھ مسلّط تھی۔ اللہ اللہ حضرت شاہ صاحب کا تحریکِ آزادی میں جو حصّہ ہے اس پر زمانہ فخر و ناز کرے گا اور تاریخ اپنی جبینِ ناز حضرت شاہ صاحبؒ کے اسی جذبہ کے آگے خم کرتی ہوئی فخر محسوس کرے گی۔

زندہ باد　　امیر شریعتؒ　　زندہ باد

مجاہد الحسینیؒ

حضرت شاہ صاحبؒ

کی

آخری قید

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں گرفتار ہونے والے رہنما مختلف جیل خانوں میں بند تھے اور فسادات پنجاب کی عدالتی تحقیقات کا آغاز ہو چکا تھا۔ تحقیقاتی کمیشن کی طرف تحریک کے سلسلہ میں مختلف دینی جماعتوں کو اپنا اپنا مؤقف بیان کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ لاہور سنٹرل جیل میں محبوس زعمائے احرار نے کمشنر کی وساطت سے حکومت مغربی پاکستان سے مطالبہ کیا کہ ہماری جماعت کے ممتاز رہنما چونکہ مختلف جیل خانوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں اور ان سے ضروری مشاورت کے حصول میں سخت الجھنیں پیش آ رہی ہیں۔ اس لئے ان سب حضرات کو لاہور سنٹرل جیل میں یکجا کر دینا ازبس ضروری ہے تاکہ ہم بھی تحقیقاتی کمیشن کے رُوبرو اپنا مؤقف اجتماعی حیثیت میں پیش کر سکیں۔ تحقیقاتی کمیشن نے حکومت پر زور دیا کہ جس قدر ممکن ہو سکے ان رہنماؤں کو اکٹھا کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں —— ادھر کراچی میں گرفتار ہونے والے جلیل القدر رہنما ارباب اختیار کی "مصلحتوں" کے پیش نظر چونکہ حیدر آباد سکھر اور دوسری جیلوں میں الگ الگ کئے جا چکے تھے۔ اس لئے انہیں یکجا کرنے میں تاخیر سے کام لیا گیا۔ ادھر تحقیقاتی کمیشن کا تقاضا شدت اختیار کر رہا تھا کہ تحریک کے روحِ رواں حضرات کی غیر حاضری سے تحقیقات میں چونکہ رکاوٹ کا باعث بن رہی ہے۔ اس لئے وہ لوگ

بلاتاخیر لاہور پہنچ جانے چاہیئں۔

ایک ——— دن لاہور سنٹرل جیل کے ایک افسر نے صبح سویرے آکر ہمیں اطلاع دی کہ آج سکھر جیل کے قیدی یہاں پہنچ رہے ہیں ان سب میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا ابوالحسناتؒ کے اسمائے گرامی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ اس افسر نے اپنی بات کی تکمیل کرتے ہوئے دوسری مسرت افزا خبر یہ سنائی کہ ان حضرات کے لئے بھی آپ کے اسی "دیوانی احاطہ" میں قیام کا انتظام کیا جا رہا ہے اور غالباً دوپہر تک وہ حضرات یہاں پر تشریف لے آئیں گے۔ لاہور سنٹرل جیل کے دیوانی احاطہ میں اس وقت شیخ حسام الدینؒ، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات، سید سبط حسن، ملک عبدالغفور انوری، عطاء اللہ جہانیاں اور راقم الحروف محبوس تھے۔ ہم نے جب ان بزرگوں اور بالخصوص شاہ جیؒ کی آمد کا مژدہ جانفزا سنا تو سب کے چہرے مسرت و بشاشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ان سب کی آنکھیں روزنِ در پر لگی ہوئی تھیں کہ ان اولوالعزم اور جلیل القدر شخصیات کی زیارت کا شرف کب حاصل ہوتا ہے؟

لاہور سنٹرل جیل میں شاہ جی کی آمد

۲۵ جولائی کو دن کے گیارہ بجے گرفتار ہونے والے حضرات کا ایک گروہ جن میں حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا سید ابوالحسنات، جناب مظفر علی شمسی اور دیگر حضرات شامل تھے سنٹرل جیل میں پہنچ گیا۔ باقی حضرات تو دیوانی احاطہ میں آ گئے۔ لیکن شاہ جیؒ ابھی ڈیوڑھی میں ہی تھے۔ آپ کے استقبال کے لئے ہمارے علاوہ دوسری بارکوں کے سیاسی اور اخلاقی قیدی اپنے اپنے احاطوں میں سراپا انتظار بنے کھڑے تھے کہ سامنے سے جیل کے ارباب اختیار اور چند دوسرے قیدیوں کے جلو میں شاہ جیؒ تشریف لاتے دکھائی دیئے جونہی لوگوں کی نگاہیں آپ پر پڑیں امیر شریعت زندہ باد! کے فلک شگاف نعروں سے جیل کے در و دیوار گونج اٹھے۔ شاہ جیؒ کی آمد اور لوگوں کے نعروں کا انداز ایسا ہی تھا۔ جیسا شاہ جیؒ اپنی زندگی میں کسی اجتماع عام سے خطاب کرنے کے لئے جلسہ گاہ میں پہنچا کرتے تھے۔ دیوانی احاطہ میں شاہ جیؒ سب سے آخر میں پہنچے، ضعف اور نقاہت کے باعث آپ بے حد پژمردہ تھے۔ آپ

کا لیسم شہیم جسم اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا گالوں اور تابناک چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور جسم پر جگہ جگہ پھوڑے پھنسیوں کے داغ دھبے نمایاں تھے۔ دیوانی احاطہ کے بڑے کمرہ میں شاہ جی اور مولانا ابو الحسنات کے لئے رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ ان کی آمد سے قبل چونکہ جیل کے اکثر قیدی چارپائیوں کی بجائے زمین پر اپنا بستر بچھا کر ایام اسیری گذار رہے تھے اور صرف ہمارے احاطہ کے چند نظر بندوں کے پاس جو چارپائیاں تھیں وہ ان بزرگوں کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ جیل کے افسروں نے بعد میں اکثر سیاسی قیدیوں کے لئے چارپائیوں کا انتظام کر دیا گیا۔

حکام سکھر جیل کا افسوسناک سلوک

شاہ جیؒ چونکہ بیماری اور سفر کی طوالت کے سبب بے حد نڈھال تھے اس لئے ہم نے اپنی بات چیت صرف علیک سلیک تک ہی محدود رکھی۔ ظہر کی نماز کے بعد جب ارباب سخن نے شاہ جیؒ سے اُن کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے پہلے کراچی کے ارباب اختیار کی کرم بخشیوں کی داستان سنائی کہ اُن لوگوں نے ہم بڈھوں (مولانا ابو الحسنات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ پھر سکھر جیل کے افسروں کی اخلاقی بادخلقی اور اُن کی سرد مہری کے واقعات سنائے تو سامعین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

شاہ جی نے فرمایا کہ موسم گرما، جون، جولائی کی ہلاکت خیزیاں، سکھر جیل اور پھر اس کے "رحم دل اور ذرہ نواز" ارباب اختیار! بس یہ تو میرے اللہ میاں کا فضل و کرم ہوا کہ ہم وہاں سے زندہ و سلامت آ گئے۔ ورنہ ان لوگوں نے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

آپ نے سکھر جیل کی خوراک کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ چاول اور نامعلوم اشیاء کے امتزاج سے جو سخت سے سخت روٹی تیار ہو سکتی ہو وہ ہمارے لئے مہیا کی جاتی۔ ساگ پات کی جگہ گھاس پھونس اور مسلسل مسور کی دال۔ یہ ہمارے لئے سب سے اچھی "صحت افزا" غذا تجویز کی گئی تھی۔ تپتے ہوئے مختصر سے قبر نما کمرے ہمارے لئے مسکن اور قیام گاہیں تھیں۔ جن سے معمولی

ہوا کا بھی مشکل سے گزر ہوتا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تکلیف دہ اور دلگداز حالات میں میری صحت کا ستیاناس ہو گیا جسم پر پہلے گرمی دانے نمودار ہوئے۔ پھر وہ سخت پھوڑے بن گئے جنہوں نے میرے بدن میں اس طرح آگ لگادی جس طرح دہکتے ہوئے انگارے جسم پر رکھ دیئے گئے ہوں۔

شاہ جیؒ نے فرمایا، متحدہ ہندوستان میں ہم نے سخت سے سخت جیل خانے بھی دیکھے ہیں اور سفاک سے سفاک اور ظالم سے ظالم جیل کے انگریز افسروں سے واسطہ پڑا ہے اور بعض افسروں سے ایسی گھمٹی کہ رہائی تک اکھاڑہ بنا رہا لیکن سکھر جیل میں ہمارے ساتھ نرالا ہی سلوک ہوا۔ میں قید و بند کے مصائب بیان کرنے کا عادی نہیں ہوں بلکہ ان کا تذکرہ معیوب سمجھتا ہوں۔ جو لوگ حوالات میں ایک رات کاٹ آئیں تو باہر آ کر اخبارات کے نمبر نکالتے ہیں اور زندان کی ساعتیں منٹوں میں حساب لگا کر بیان کی جاتی ہیں" بابو! یہ پراپیگنڈے کی دنیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ہمارے لئے جیل خانہ گلشن بنا دیا تھا جیسے وہاں عطر بیز پھولوں تک رسائی کانٹوں سے الجھنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی گلشن زندگی میں تلخیوں اور تنگیوں کے بعد ہی ثمر مراد پا سکتے ہیں"۔

شاہ جیؒ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر جاری رکھتے ہوئے فرمایا

"سبحان اللہ! انہوں نے کتنی بلند بات کی ہے رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ ۚ اے میرے پروردگار! یہ قید خانہ مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے جدھر وہ مجھے بلا رہے ہیں"۔ آپ نے فرمایا "یوسف علیہ السلام کے ذکر سے مجھے ڈم ڈم جیل یاد آ گئی۔ ۱۹۳۰ء کے ایام اسیری میں ایک رات سورہ یوسف علیہ السلام کی تلاوت کر رہا تھا چودھویں رات کی چاندنی، رات کا سناٹا، فضا خاموش اور ماحول دم بخود، تلاوتِ قرآن میں کچھ وقت گزر گیا۔ اتنے میں پنڈت رانجھی لال سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے پیچھے سے پکارا، دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"شاہ جی! خدا کے لئے بس کرو! میرا دل قابو سے باہر ہو رہا ہے اور اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں رہی"

بھائی! قرآن پڑھا جائے تو آج بھی اس کے اعجاز دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا" یہاں ذکر سکھر جیل کا ہو رہا ہے۔ میری تو خیر کوئی بات نہ تھی میں تو سرد گرم کشیدہ ہوں اور پوری زندگی جیل یا ریل کی نذر ہوئی ہے۔ یہ بڑے میاں بو (ابو الحسنات) بیچارے اس وادیٔ پر خار میں پہلی ہی بار قدم رنجاں ہوئے تھے۔ مجھے ان کا بڑا احساس رہا لیکن ماشاء اللہ ان کو تو میں نے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ صابر و شاکر پایا۔ راقم الحروف نے استفہاماً" شاہ جی کی خدمت میں عرض کی۔" آپ حضرات کے ساتھ اس قسم کے افسوسناک سلوک کا محرک کہیں الیکشن جیل خانہ جات کا انتقامی جذبہ تو نہیں" اس پر شاہ جی نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئے۔!

شاہ جیؒ کا موقف

۲۷ فروری کو تحریک ختم نبوت کے دوران کراچی میں گرفتار ہونے والے دوسرے مرکزی رہنما جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری۔ مولانا عبدالحامد بدایونی اور دوسرے حضرات شامل تھے، حیدر آباد جیل سے لاہور سنٹرل جیل منتقل کر دیئے گئے۔ ان حضرات کی آمد پر تحقیقاتی عدالت کے سامنے مجلس احرار کا موقف پیش کرنے کا مسئلہ آیا۔ چنانچہ مجلس احرار اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مختلف حضرات نے اپنا اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے اور اس کے سامنے اپنا موقف پیش کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ سے کام نہ لینا چاہیئے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری نے اپنے رفقائے جماعت اور ارباب سخن کے خیالات سُن کر ایک آہ سرد بھری اور فرمایا۔

"تم دوست جو فیصلہ کرو مجھے اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ آپ حضرات نے اپنی مدلل باتوں سے میرے دماغ کو متاثر کیا ہے۔ لیکن ـــــ (اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اسے کیا کروں، یہ ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ کمیشن ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرے گا بلکہ میری نگاہ میں تو

ہمیں رسوا کرنے کے لئے ارباب حکومت کی یہ ایک دلربا چال ہے (شاہ جیؒ نے یہاں پر اس وقت کے ارباب اقتدار کی ایمانی کمزوری اور باطل پرستی کا بھی ذکر کیا) ہمیں کمیشن سے عدم تعاون کا اعلان کر دینا چاہیئے، پھر جو ہوگا دیکھا جائیگا ویسے تم لوگوں نے شہید گنج اور ۴۶ء کے انتخابات کے موقع پر بھی میری بات نہ مانی اور اب بھی نہ مانو گے۔ اور آخر کار وہی ہو کر رہا جس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا!

شاہ جیؒ کے اس انداز نے حاضرین اجلاس پر ایک سکوت طاری کر دیا۔ ساتھیوں نے جب مختلف کمشنوں کے ساتھ تعاون کی سابقہ مثالیں پیش کیں اور اس سلسلہ میں عدم تعاون کو نامناسب قرار دیا تو آپ نے فرمایا۔

"اگر آپ لوگ اسی پر مصر ہیں تو ہمیں مشروط تعاون پر ہمیں آمادگی ظاہر کرنی چاہیئے کہ ہمارا اصل فریق مخالف چونکہ قید و بند سے باہر ہے اس لئے یا تو اسے بھی ہمارے ساتھ یہاں لایا جائے تاکہ مقدمہ کی پیروی کے لئے ہم دونوں کے وسائل و ذرائع یکساں ہو جائیں اور یا پھر ہمیں آزاد کر دیا جائے تاکہ باہر جا کر ہم بھی اپنا موقف آزادانہ ماحول میں واضح کر سکیں۔ ایک فریق کو آزاد اور دوسرے کو سلاخوں میں بند کرنے کی عملی صورت ہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ارباب حکومت و اختیار اپنا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں۔ میری مانو تو اپنی زندگی کا بقیہ حصہ قید و بند کی نذر کر دو اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ وہ بہتر کارساز ہے —— لیکن اگر آپ حضرات اس کے لئے آمادہ نہ ہو سکیں تو آپ کے فیصلہ کا پورا پابند رہوں گا اور انشاء اللہ پھر اسی پر عمل ہوگا۔ ہمارے ہاں تو جماعت نام ہے چند دوستوں اور ساتھیوں کی رفاقت کا۔"

الغرض اس اجلاس میں یہ فیصلہ ہو گیا کہ مجلس احرار کو متوقع نتائج سے بے پرواہ ہو کر من حیث الجماعت تحقیقاتی کمیشن کے سامنے اپنا موقف پیش کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ بعد میں احرار کا تحریری بیان تحقیقاتی عدالت کے روبرو پیش بھی کر دیا گیا۔ باوجود کوشش کے جس کی

اشاعت کی اجازت نہ مل سکی۔

مارشل لاء کے قیدیوں سے ملاقات

لاہور سنٹرل جیل میں شاہ جیؒ کی آمد کی اطلاع جب مارشل لاء کے قیدیوں کو ملی تو انہوں نے حکام جیل کی اجازت سے شاہ جیؒ سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ ایک دن صبح سویرے ہم اسیران قفس ناشتہ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دیوانی احاطہ کے انچارج نے آکر شاہ جیؒ سے درخواست کی کہ مارشل لاء کے چند قیدی باہر کھڑے ہیں اور وہ آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ اگر اجازت ہو تو انہیں اندر بلالوں۔ ابھی اس کی بات مکمل نہ ہو پائی تھی کہ شاہ جیؒ ننگے سر اور ننگے پاؤں ان قیدیوں کے استقبال کے لئے دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل گئے، دیوانی احاطہ کے دروازے پہ قیدی خراماں خراماں آرہے تھے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیوں کی جھنکار اور شاہ جی کا استقبال، ایک عجیب پرکیف منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ شاہ جیؒ نے سب کو گلے لگایا۔ ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو بوسہ دیا

پھر آپ نے اشکبار آنکھوں اور غمناک لہجے میں فرمایا۔

تم لوگ میرا سرمایۂ نجات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی اور پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے لئے بھی بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں میں نے تو اپنے نانا حضرت خاتم النبیینؐ کی عزت و ناموس کے تحفظ کی دعوت دی ہے اور تم لوگ صرف اور صرف اسی مقدس مقصد کے لئے قید و بند اور طوق و سلاسل کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہو۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے، سیاسی شہرت یا ذاتی وجاہت جس کا مقصود ہو۔ تم یہاں جیل میں بھی غیر معروف ہو اور جب تم اس دیوار زنداں سے پرے جاؤ گے تو باہر تمہارا استقبال کرنے والا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر

نعرہ لگانے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ نیّت اور ارادے کے اعتبار سے جس کی آمد اس مقصد کے لئے ہوتی ہے، وہ یہی مقصد لے کر واپس چلا جائے گا۔ میرے لئے اس سے بڑا سرمایۂ افتخار اور کیا ہو سکتا ہے؟"

شاہ جیؒ یہ چند جملے فرما چکے تو کسی نے ایک قیدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ تحریک میں اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن چکا ہے اس کے لئے دعا فرمایئں، شاہ جیؒ نے تحریک کے دوران متشددانہ کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا

"بھائی! ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت یا عوام تشدد پر اتر آئیں، اور کوئی ناخوشگوار صورت نمودار ہو جائے، میں نے کراچی جیل میں جب لاہور اور دوسرے مقامات پر گولی چلنے کے واقعات سُنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے باپوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئیں ہیں، ماؤں کے چراغ گل ہو گئے ہیں اور کئی سہاگ اجڑ گئے ہیں تو مجھے اس کا بڑا صدمہ پہنچا۔ میں نے وہاں کہا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لیجائے یا اربابِ اقتدار تک میری یہ آرزو پہنچا دی جاتے کہ تحفظ ناموسِ رسولؐ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا ضروری ہو تو گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دیجاتے اور کاش اس سلسلہ میں اب تک جتنی گولیاں چلائی گئی ہیں وہ مجھے ٹکٹکی پہ باندھ کر میرے سینے میں پیوست کر دی جاتیں"۔

مارشل لاء کے ان قیدیوں کے علاوہ جو حضرات شاہ جیؒ سے ملنے کے لیے آئے ان میں سے سید ابو الاعلیٰ مودودی، شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل سلفی، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا اختر علی خاں، مولانا عبدالستار خاں نیازی، اور مولانا امین احسن اصلاحی کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

جیل میں شاہ جیؒ کے مشاغل

لاہور سنٹرل جیل میں امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے مشاغل کا عنوان ایسا ہے جس پر کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ یہاں پر اخباری صفحات کی تنگیٔ داماں کا تقاضہ یہ ہے کہ صرف چند ضروری واقعات پر اکتفا کیا جائے جن لوگوں کو شاہ جیؒ کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ وہ اس حقیقت سے باخوبی آگاہ ہیں کہ عبادات کے علاوہ شاہ جیؒ کے روزمرہ کے مشاغل بظاہر کسی منظم پروگرام کے تحت نہیں ہوا کرتے تھے۔ یعنی مطالعہ کتب، تحریر ملاقات اور سیر و سیاحت کے لئے کوئی باقاعدہ نظم اوقات مرتب ہو۔ شاہ جیؒ کی زندگی میں اس انداز کا نظم اگر دکھائی دیتا ہے تو وہ صرف عبادات کا ہے۔ آپ نماز سے فارغ ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے یا پھر درود و وظائف میں اور ذکر الٰہی میں منہمک رہتے۔ تہجّد کے وقت جب کبھی آپ اللہ۔ اللہ کا ذکر بالجہر کرتے یا دوسرے اوقات میں تلاوتِ قرآن مجید کرتے تو وجد میں آجاتے اور اپنا روایتی لب و لہجہ اختیار کرتے تو سکوتِ زنداں میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا اور ایک عجیب سماں بندھ جاتا۔ شاہ جیؒ کے مشاغل میں سب سے زیادہ جس بات کو اہمیت دی جاسکتی ہے اور وہ ان کا تذکرۂ ماضی ہے۔ شاہ جیؒ اپنے زمانۂ حیات میں جب احباب و رفقاء کی محفل آراستہ کرتے تو اکثر اپنے ماضی کے عظیم الشان واقعات اور اپنے مثالی کارناموں کا بے تکلف ذکر اس طرح کرتے جیسے تاریخ کے اوراقِ پارینہ پڑھے جا رہے ہوں۔ شاہ جیؒ نے اپنی مجلسی زندگی میں تاریخ آزادیٔ وطن کے بڑے سنہری باب پڑھ کر سناتے ہیں۔ کاش! ہمارے ہاں کوئی ایسا ادارہ ہوتا جو حیاتِ امیرِ شریعت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرکے آئندہ نسل کے لئے کوئی قابلِ ستائش مواد فراہم کرنے کا اہتمام کرتا۔

ایک دن چائے سے فارغ ہو کر ابھی دستر خوان پر ہی بیٹھے تھے کہ فتح دین نامی باورچی کا ذکر چھڑ گیا۔ اس باورچی نے اگرچہ پکانے میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ لیکن مولانا ابوالحسنات (جنہیں شاہ جیؒ ہر دن مولا کے نام سے یاد کرتے تھے) اس کی ایک نہ چلنے دیتے اور ضرور کوئی نئی ہدایت جاری فرما دیتے۔ الغرض شاہ جیؒ نے مختلف باورچیوں کا ذکر کرتے

ہوئے فرمایا کہ میں نے ایک بار انگریزوں کے خلاف خانساموں کو تحریک عدم تعاون بھی چلائی مجھے جہاں کہیں سے اطلاع ملتی کہ اس انگریز افسر کے ہاں کوئی مسلمان ملازم خانساماں کی خدمات سر انجام دے رہا ہے تو اسے عدم تعاون پر آمادہ کرتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک خانساماں کانفرنس منعقد کی گئی، جس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

جسمانی ورزش

شاہ جیؒ کے مشاغل کے ساتھ ہی یہاں پر اگر آپ کی جسمانی ورزش کے باب کا ایک حصّہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنمائی کو ہمارے احاطہ میں تشریف لائے ابھی چند دن ہوئے تھے کہ راقم الحروف نے ازراہِ تفنن طبع شاہ جیؒ، مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی، شیخ حسام الدین، مولانا محمد علی جالندھری، اور ماسٹر تاج الدین انصاری کی خدمت میں عرض کیا۔ "اے بابا حضرات ہمیں یہ ایام اسیری بیمار بن کر نہیں گذارنے جسمانی ورزش کا بھی کوئی پروگرام مرتب ہونا چاہیئے۔ اٹھیئے اور میدانِ کارزار میں ہمارا مقابلہ کیجئے۔" مولانا ابوالحسنات تو مسکرا دیئے، شاہ جیؒ نے مجھے ڈانٹ پلا دی "جاؤ اپنا کام کرو۔" میں نے عرض کیا شاہ جی سیفٹی ایکٹ پر مزید سیفٹی ایکٹ نافذ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تو والی بال کھلانے کے لئے آپ کو لے جاؤں گا اس اثناء میں مولانا محمد شریف جالندھری اور ملک عبدالغفور انوری میرے ساتھی بن گئے، چنانچہ شاہ جیؒ ہماری درخواست پر کھیلنے کے لئے باہر گراؤنڈ میں چلے گئے۔ اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ والی بال کہاں سے حاصل کیا جائے۔ یا پھر اس کی جگہ پر متبادل کھیل کونسا کھیلا جائے میں نے اپنا تولیہ گول کر کے گیند بنا لیا اور شاہ جیؒ کی جانب پھینک کر کھیل کا آغاز کر دیا اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ بس پھر کیا تھا مولانا ابوالحسنات کے علاوہ دوسرے حضرات بھی ہمارے ساتھی بن گئے، شیخ صاحب اپنے گھٹنے میں تکلیف کے باعث چونکہ کھیل سے معذور تھے اس لئے انہیں کھیل کا منصف ٹھہرایا گیا۔ ایک دو روز تو ہم اس طرح کھیلتے رہے چند دن بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل مہر محمد حیات صاحب عین اس موقعہ پر دیوانی احاطہ میں آئے

جب ہم کپڑے کی گیند کے ساتھ اپنے کھیل میں خوب مصروف تھے۔ مہر صاحب ہمیں دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور آتے ہی بولے۔ آپ حضرات نے اس سلسلہ میں ہمیں کیوں نہ مطلع کیا۔ ہم آپ کے لئے کھیل کا سارا سامان فراہم کر دیتے اور وہ تو قانونی طور پر آپ کا حق بھی ہے۔ خیر دوسرے دن والی بال نیٹ اور بیڈمنٹن کھیلنے کا سامان ہمارے احاطہ میں پہنچ گیا سامان دیکھ کر اب دوسرے رہنماؤں نے بھی کھیل کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ اچھی خاصی ٹیم مرتب ہو گئی۔ اب ذرا کھلاڑیوں کی اس ٹیم کے اسمائے گرامی بھی سن لیجئے امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا عبدالحامد بدایونی، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات فاتح قادیان، مولانا لال حسین اختر، صاحبزادہ فیض الحسن، سید سبط حسن سابق مدیر لیل و نہار، مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، ملک عبدالغفور انوری۔ مولانا محمد شریف جالندھری، سائیں محمد حیات پسروری، مولانا ابوالحسنات اپنے پاؤں میں سخت تکلیف کے باعث کھیل پر آمادہ نہ ہو سکے تھے۔ ویسے گراؤنڈ میں باہر بیٹھ کر کھیل میں خوب دلچسپی لیتے رہے اور اس بات کا تذکرہ تو آپ حضرات کے لئے یقیناً معلومات افزا ہوگا کہ ہر جمعہ کو ہماری اس ٹیم کا بم کیس کے محبوس نظر بندوں کے ساتھ میچ ہوتا۔ بم کیس میں بھی اس تحریک کے قیدی جمع تھے۔ اس میں اکثریت چونکہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں کی تھی اس لئے بم کیس ٹیم کا نام جماعت اسلامی اور دیوانی احاطہ کی ٹیم کا نام احرار رکھا گیا۔ میچ کے دوران جو ٹیم کامیاب و کامران ہوتی رہی ہے بم کیس ٹیم کو اس کا بخوبی علم ہے۔

کھیل کا یہ تذکرہ اگرچہ طوالت اختیار کر گیا ہے اور ممکن ہے کہ قارئین حضرات کے ذوقِ سلیم پر کچھ شاق گذرے مگر چونکہ مقصود شاہ جیؒ کی زندگی کا ایک ایسا پہلو بیان کرنا ہے جس کا انضمام صحت کے ساتھ گہرا تعلق اور وابستگی ہے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ حضرات قارئین اسے گوارا ہی کریں گے۔ شاہ جیؒ نے اپنی جسمانی ورزش کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار یہ بھی بتایا کہ وہ جوانی کے عالم میں جبکہ امرتسر کی ایک مسجد میں خطیب تھے، اکثر مروجہ ورزشی امور میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اور ان کے جسمانی حسن میں ورزش کو خاصا دخل رہا ہے

تاثرات

ایک دن میں نے شاہ جیؒ سے دریافت کیا کہ آپ ایام اسیری میں کس شخصیت سے اور اس کے کس کارنامہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ میرا یہ سوال سن کر پہلے تو حسب معمول ٹالنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب میں نے ذرا اصرار کے ساتھ معروضات پیش کیں تو فرمانے لگے "مجھ سے کیا پوچھتے ہو بھائی۔ میں تو ایک گنہگار انسان ہوں اور گنہگار کسی گنہگار ہی سے متاثر ہو سکتا ہے۔ قید و بند کے دوران جب بعض اخلاقی قیدی چوری یا ڈکیتی کے جرم میں آتے اور ایام اسیری گزارنے بعد جب واپس لوٹنے لگتے تو ان میں سے پختہ کار مجرم جیل کے برتن چٹائی اور کمبل وغیرہ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی تحویل میں دے جاتے کہ انہیں ڈیوڑھی میں جمع نہ کرانا۔ ہم بہت جلد واپس آ کر یہ وصول کر لیں گے۔ ان گنہگاروں کے عزائم کی بلندی اور اپنی دھن کی پختگی نے مجھ کو بڑا متاثر کیا۔ یہ لوگ گناہ میں اس قدر پختہ ہیں اور ہم سراسر نیکیوں اور محاسن میں کمزوری کا اظہار کریں۔

اور بھائی! یہ کفر میں پختگی تو کبھی کبھی انبیائے کرام کی خصوصی توجہ اور دعاؤں کا مرکز بن جایا کرتی ہے جبھی تو حضرت خاتم النبیینؐ علیہ السلام نے اللہ میاں سے حضرت عمرؓ کو مانگا اور پھر اسلام میں انہوں نے استقلال اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ وہ تحریک اسلام کے ایک سنہری باب کی حیثیت سے ہمیشہ درخشندہ اور تابناک رہے گا۔

شاہ جیؒ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا" بات یہ ہے تو طنز و مزاح کی — لیکن خدا بھلا کرے علامہ حسین میر کا وہ مزاح میں بھی کمال کی بات بتلا گئے۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں ایک بار علامہ حسین کاشمیری گرفتار ہو کر غالباً کیمبل پور جیل میں چلے گئے۔ جماعتی دوستوں میں سے خصوصاً چوہدری افضل حقؒ نے جماعتی احباب کا اہم اجلاس دفتر مرکزیہ مجلس احرار لاہور میں طلب کیا۔ چنانچہ اجلاس میں یہ فیصلہ طے پا گیا کہ علامہ صاحب سے جیل میں ملاقات کے لئے ان حضرات پر مشتمل ایک وفد بھیجا جائے اور اس قدر رقم ان کے اخراجات کے لئے مخصوص کر دی جاتے تو لیکایک باہر سے کسی نے بند کمرے کا دروازہ خوب زور سے کھٹکھٹانا

شروع کر دیا۔ پہلے تو ہمیں اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ مگر جب دوسری بار اسی انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو چوہدری افضل حق صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا، دیکھتے ہیں علامہ حسین میر اپنے کندھوں پر بستر اٹھائے کھڑے ہیں۔ چوہدری صاحب نے دیکھتے ہی اظہارِ حیرت کے طور پر فرمایا "اے! علامہ تم کیسے"۔ علامہ حسین میر نے اتنے میں اپنا بستر اجلاس کے عین وسط میں لاکر زور سے پٹک دیا۔ اور دوسری طرف متوجہ ہو کر بولے۔ شاہ جی! میں تو انگریز اور انگریز کی جیل پر لعنت بھیج کر آ گیا ہوں۔ میں نے پوچھا علامہ! لعنت کے معنی! جھٹ بولے لعنت! یعنی ملکہ کر دے آیا ہوں۔ ہمارا مقصد انگریز سے عدم تعاون ہے جب جیل سے باہر ہوتے ہیں تو انگریزوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم جیل کے اندر جائیں اور جب جیل کے اندر چلے جاتے ہیں تو ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جیل سے باہر نہ جائیں۔ میں نے یہی سمجھا کہ جیل میں بھی عدم تعاون کرنا چاہیئے۔ علامہ حسین میر کی یہ نرالی منطق سن کر محفل زعفران زار بن گئی۔

مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی ایم۔ پی۔ اے

داستانِ غم

مرض کا پہلا حملہ

چند سال پیشتر یہ اندوہناک خبر ملک میں پھیل گئی کہ حضرت امیر شریعتؒ پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔ حملہ آور کے خلاف سہام اللیل کی بارش شروع ہو گئی۔ اہل ملک نے عموماً، اہل اللہ نے خصوصاً رب العزت ہی دعائیں کیں۔ بشہور و معروف حکماً ملتان جناب عطاء اللہ خاں صاحب و جناب حنیف اللہ صاحب ہر دو باپ بیٹوں نے اپنی خدمات امیر شریعت بلکہ حفاظتِ شریعت کے لئے وقف کر دیں۔ اللہ تعالے نے شرف قبولیت بخشا اور شاہ صاحبؒ کو افاقہ ہو گیا۔ عوام نے آپ کو صحت یاب سمجھا مگر خواص جو آپ کی رفتار و گفتار کے واقف اور عادات و اطوار کے راز دار تھے۔ جانتے تھے کہ یہ صحت نہیں ہے۔ افاقہ ہے۔ حضرت کے اعضا خاص طور پر زبان پر مرض کا خاصا اثر باقی تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اس کو پیغام رحیل سمجھا۔ چنانچہ آپ نے رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ دوروں پر جانا بند کر دیا اور دولت خانہ میں بھی خدام و زائرین کی صبح و شام زیارت کم نصیب ہونے لگی۔ اب حضرت شاہ صاحبؒ

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ؎

کے مقام پر تھے۔ یا تو حضرت شاہ صاحب نماز تہجد کے وقت بھی قرآن پاک سنا کرتے تھے

یا اب عبادت ہی عبادت (ذکر و فکر) بن کر رہ گئے۔ صرف دن کو تھوڑا سا وقت عقیدت مندوں کے سکونِ خاطر کے لئے دیتے۔

فالج کے ساتھ ہی اس سے پہلے کی مرض ذیابیطس بھی آپ کو چمٹ گیا تھا چنانچہ آپ میٹھا کھانے میں احتیاط برتنے لگے تھے۔

مرض کا دوسرا دور

لیکن اب غیر محسوس طریقے سے کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی حضرت شاہ صاحبؒ خود ہی حکیم صاحب کے پاس تشریف لے آتے جو آپ کے پاس ہی قیام فرما تھے۔ ان سے آپ کو انس تھا اور پرانی محبت بھی تھی۔ مہمانوں کو ابھی تک شاہ صاحبؒ اپنے دستِ مبارک سے چائے اندر سے لا کر پلاتے اور اپنے مخصوص اقوال کے ٹکڑ پاروں سے ان کی تواضع فرماتے۔ اب حضرت شاہ صاحبؒ نے دوستوں کے پاس جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر پشاور سے کراچی تک کے دوست غلام اور عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا۔ نزدیک اور دور سے آ کر وہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کے سکون کا سامان مہیا کرتے۔ مگر میں یہ محسوس کرتا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ گو شفقتِ اخلاق کی وجہ سے ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتے مگر وہ اب مخلوق سے تبتل اختیار کر کے خالق سے لَو دگا بیٹھے ہیں۔ بیماری کے اس دور میں جب کہ ابھی وہ مغلوب تھے حضرت شاہ صاحبؒ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ رائے پوری مدظلہ، کی خدمت میں بھی لاہور آ کر چند روز قیام فرما رہے۔ اللہ تعالےٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ان نورانی صحبتوں میں مرشدِ کامل اور مریدِ قابل کے درمیان ربط و نسبت اور سیر و سلوک کی کتنی منازل طے ہوتی رہیں۔

مرض کا تیسرا دور

آج سے چند ماہ پہلے اچانک یہ افسوسناک خبر پہنچی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی بیماری شدت اختیار کر گئی ہے۔ میں حاضرِ خدمت ہوا، محترم بھائی حافظ عطا المحسن صاحب مجھے اندر لے گئے، دیکھ کر مضطرب ہوا۔ آپ کو بولنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی اور چہرے پر

مایوسی کے آثار تھے۔ میں ضبط نہ کر سکا اور مصافحہ کر کے رخصت ہوا۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کو نشتر ہسپتال لے جایا گیا۔ چند دن کے بعد میں وہاں حاضر ہوا، ہوش و حواس قائم تھے، زبان اور حلق میں تکلیف تھی، نماز کے لئے تیمم فرماتے جب وہاں افاقے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو چند دن کے بعد آپ کو پھر گھر لے آئے، اسی دن میں، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدرس قاسم العلوم ملتان کی معیت میں دولت خانہ پر حاضر ہوا، وہاں چند اور خدام بھی تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ، حافظ عطاء المحسن صاحب کے سہارے سے اندر سے چل کر دروازے تک تشریف لائے بمشکل سے دست مبارک مصافحہ کے لئے بڑھایا، ہم یاس و حسرت کے ساتھ رخصت ہوئے، مشورہ کے بعد آپ کو لاہور لایا گیا، سلطان فونڈری کے مالک مولوی محمد اکرم صاحب اور مولوی محمد افضل صاحب کی کوٹھی (واقعہ ماڈل ٹاؤن) میں کرنل ضیاء اللہ نے علاج شروع کیا۔ چوٹی کے حکماء حضرات نے بھی معائنہ فرمایا، حضرت شاہ صاحبؒ تعارف کے بعد ہر ایک کو پہچان لیتے اور جب حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ قدس سرہٗ کے فرزند عیادت کے لئے تشریف لائے، جن کی وفات کی خبر شاہ صاحبؒ کو مل چکی تھی تو آپ ان کو دیکھ کر بہت روئے اور جب بول نہ سکے تو لکھنے کی سعی کی جس سے یہ اندازہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحب میرے استاد مکرم تھے۔ لاہور میں ہر چند بہترین علاج جاری رہا اور مولوی اکرم صاحبؒ موصوف نے آپ کو اور مہمانوں کو ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کی۔ تمام رفقاء کار اور مشتاقانِ دید کو زیارت نصیب ہوتی رہی۔ مگر مرض میں کیونکر تخفیف ہوتی۔ یہاں تو یہ حال تھا ؎

از سر بالین ما برخیز اے ناداں طبیب
دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

مرض کا چوتھا دور

۱۴؍اگست ۱۹۶۱ء کو اس خبر نے پریشان کر دیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو غشی کے دورے پڑتے ہیں، اس کے بعد طاقت مضمحل اور قوت سلب ہونی شروع ہوگئی۔ یہاں

تک کہ ۲۰ ؍ اگست تک آپ کے خویش و اقارب کو بلا لیا گیا۔ ۲۱ ؍ اگست کو آپ پر غنودگی ہی طاری رہی اور تیسرے پہر سے دم بدم یہ خبریں لاہور پہنچنے لگیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی حالت نازک ہے۔ عجیب تماشا تھا کہ پاؤں مبارک سرد ہو چکے ہیں مگر بخار پورے زوروں پر ہے اصولاً اتنے شدید بخار سے فالج کی کیفیت بدل جانی چاہیئے تھی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا، مرض شاخِ گل کاٹنے میں مصروف اور طائرِ روح اس سے پرواز کے لئے بے چین تھے، مرض کالبدِ خاکی کے درپے اور روح عالمِ ملکوت کے لئے بیقرار تھی۔

آخر کار وہ گھڑی آ ہی پہنچی جس میں مرض اور جسم کا مقابلہ ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی روح اگر طیب ہے تو ہر طرح کی کوفت و کلفت سے ہمیشہ کے لئے نجات پا جاتی ہے، حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَاءَہٗ

ترجمہ (جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لئے بے چین ہو۔ اللہ تعالیٰ بھی اُس کی ملاقات کو چاہتے اور محبوب رکھتے ہیں)

اس حدیث شریف کا مفہوم طالب علمی کے زمانہ میں اس وقت سمجھ میں آیا جب کہ دارالعلوم دیوبند کے مدرسین کے استاد حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ مرحوم انفلوئنزا سے بیمار ہو کر قریب المرگ ہو گئے۔ آپ کو سرسام بھی ہو گیا تھا۔ آخری وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی آپ کی عیادت کو آئے، آپ بے ہوش تھے، شیخ الاسلام نے فرمایا کہ دم ذاکر ہے (یعنی سانس آمد و شد میں ذکر کر رہا ہے) بیماری کی حالت میں حضرت مولانا موصوف کا حال یہ تھا جیسے کہ کسی پر پہاڑ ٹوٹ چکا ہو، مگر جونہی آخری وقت آیا، روح پرواز کرنے لگی، چہرہ بشاش ہو گیا، مرض کی تکلیف کفارہ ذنوب اور رفع درجات کا سبب بنتی ہے۔ مگر جب فرشتے آجاتے ہیں، مومن کی روح شدت اشتیاق سے ان کے پاس چلی جاتی ہے۔

ہاں تو عرض کر رہا تھا کہ آخر کار وہ گھڑی آ پہنچی، اس وقت حضرتِ شاہ صاحبؒ کے پاس چند دوست، چند اہل اللہ اور چند عزیز و اقارب تھے۔ بعض نیک آدمیوں نے یہ بھی

بتلایا کہ سانس میں ذکر کی کیفیت تھی۔ بہرحال میں دفتر ترجمان اسلام میں بیٹھا تھا اور اخبار میں حضرت شاہ صاحبؒ کے نزاکت حال کی خبر لکھ دی گئی تھی کہ ساڑھے چھ بجے شب کے قریب محترم مخدوم ماسٹر تاج دین انصاری نے پاکستان ٹائمز کے دفتر کے حوالہ سے خبر دی کہ شاہ صاحبؒ وفات پاچکے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وانّا الیہِ راجِعُون،

صبر و شکر کی انتہا

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طویل بیماری اور مختلف امراض اور جسمانی تکالیف میں کسی وقت اُف تک نہیں کیا۔ اور نہ کبھی زبان پر حرفِ شکایت آیا ہمت و استقلال سے وقت گزارا اور صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

عالمگیر اضطراب

یہ خبر شہر لاہور کیا تمام ملک میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ ہر طرف اضطراب ہی اضطراب تھا۔ جن حضرات کو حضرت شاہ صاحبؒ کی طویل نازک بیماری کا علم اور صحت کی مایوسی تھی ان کو تو اس صدمہ کو برداشت کرنا آسان ہو چکا تھا۔ مگر جن کو یہ علم نہ تھا ان کو اس صدمے سے ناقابل برداشت پریشانی ہوئی۔ جس جس کو خبر ہوئی کوئی بسوں کی طرف دوڑا۔ کسی نے سٹیشن کا رُخ کیا۔ مگر دونوں چیزیں اپنے قابو میں نہ تھی۔ میں لاہور سے باہر بغیر ایس۔ ایس۔ پی کی اجازت کے نہیں جا سکتا تھا۔ اس دن تو دفاتر بند ہو چکے تھے۔ ۲۲ راگست کو ۹ بجے ریل پر جانے کے لئے بروقت اجازت کی امید نہ تھی۔ پہلے تو یونہی امید نہ ہوتی، اگر دیتے بھی تو اجازت بعد از وقت ہوتی۔ میں منٹگمری کی تاریخ بھگتنے کے لئے اجازت لینے جاتا ہوں۔ یہاں مستقل طور پر ایک تاریخ بھگتنی پڑتی ہے۔ ایس۔ ایس۔ پی جب میٹنگ سے آتے ہیں تب دستخط فرماتے ہیں پھر ٹائپ کر کے تحریری اجازت نامہ عنایت کرتے ہیں۔ مقدر یہی تھا کہ دوسری مصیبت اٹھاؤں

اِنّمَا اَشکُو بثی وحزنی الی اللہ

۲۱ اور ۲۲ راگست کو ملتان لائن پر آنے والے تمام اسٹیشن سوگوار تھے اور جب لائلپور اور

لاہور کی ٹرینیں ملتان پہنچیں تو آہ و بکا اور دلدوز چیخ و پکار سے اسٹیشن ماتم کدہ بن گیا۔

ٹبی شیر خاں

اعلان ہو چکا تھا کہ جنازہ کل چار بجے ہو گا۔ مگر مخلوق خدا راتوں رات پہنچتی اور روتی ہی ۲۲ر اگست کو صبح سویرے محلہ ٹبی شیر خاں میں آدمی ہی آدمی تھے۔ کھانے پینے سے بے نیاز پریشانی کے عالم میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مکان سے مدرسہ قاسم العلوم تک پھیلے ہوئے تھے۔ نو بجے تک آنے والوں کی تعداد ۱۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

مدرسہ قاسم العلوم

مدرسہ قاسم العلوم اسی علاقہ میں ہے، یہ عربی مدرسہ تفسیر و حدیث کا مدرسہ ہے۔ جو انقلاب سے پہلے کا قائم شدہ ہے۔ اس کی وسیع عمارت، کھلی مسجد اور جاذب نظر درسگاہ اسلامی فیوض و انوار کی جلوہ گاہیں، پھر طالب علموں کے اخلاق اور جذبۂ خدمتِ خلق سونے پہ سہاگہ ہے۔ اس کے صدر مدرس مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ناظم اعلیٰ وفاق المدارس ہیں، جن پر مولانا قاری حافظ عطاء المنعم نے خاص احسان فرما کر آخری وقت میں شاہ صاحب کے دیدار کے لئے اطلاع دے کر بلا لیا تھا۔ جس کے لئے وہ خود مدت العمر ممنون رہیں گے۔ اس کا صحن اس کا دالان، تمام درس گاہیں، دار الحدیث مسجد اور کمرے مسلمانوں سے بھر چکے تھے۔ جن کو آرام پہنچانے کی کوشش طالب علم اور اساتذہ ہر طرح کرتے رہے۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی آخری خدمت تھی۔ جو مدرسہ قاسم العلوم نے کی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

جانشینی

مدرسہ قاسم العلوم میں کم و بیش دہ ہزار علماء صلحاء مشائخ و عوام و خواص کی موجودگی میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بڑے فرزند حضرت مولانا قاری حافظ عطاء المنعم شاہ صاحبؒ کو حضرت شاہ صاحبؒ کا جانشین تجویز کیا گیا، اس مبارک تجویز میں حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب درخواستی

اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب خلیفہ اعظم حضرت تھانوی، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب، حضرت محمد شفیع صاحب مہتمم قاسم العلوم، حضرت مولانا محمد علی جالندھری۔ وہ اکابرین احرار اور دوسرے سینکڑوں علماء و مشائخ شریک تھے۔ جس کے بعد دستار بندی ہوئی۔ ہم اس جانشینی پر جو ملت کے تمام ذمہ دار حضرات اور سابق احرار و مجلس ختم نبوت کے تمام بزرگوں کے مشورے سے ہوئی۔ محترم حافظ صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ آپ کو حضرت شاہ صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی اور احیاء و فلاح کے فرائض باحسن وجوہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اجتماع

ملتان کے گرد و نواح سے تو لاتعداد آدمی دوپہر تک ملتان پہنچ گئے مگر سابق صوبہ سرحد اور کراچی تک کے لوگوں نے شمولیت جنازہ کے لئے پہنچ کر بڑی ہمت سے کام لیا۔ غرضیکہ ملک کے دور دراز حصوں سے شرکت جنازہ اور دیدار کی سعادت حاصل کرنے کے لئے مخلوق آئی مگر بے پناہ ہجوم میں جہاں جنازے کا پتہ بھی سب کو نہ لگ سکے کہ کہاں ہے، وہاں دیدار کیسے ہو سکتا ہے۔ آنے والوں کی تعداد اب کم و بیش لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔

نماز جنازہ

نماز ظہر کے بعد شاہ جی کے گھر سے جنازہ اٹھا اور ایمرسن کالج گراؤنڈ کی طرف بڑھا جنازے کی چارپائی کے ساتھ سولہ لمبے لمبے بانس بندھے تھے تاکہ جنازہ اٹھانے والے لاتعداد انسانوں کو آسانی ہو مگر مشتاقین کے ہجوم میں کوئی انتظام باقی نہ رہ سکا، ملتان کی سڑکیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دو میل تک آدمی ہی آدمی تھے۔ غمزدہ تو سب ہی تھے۔ بلکہ اکثر غم کی زیادتی کی وجہ سے اپنے آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ حکیم عطا اللہ صاحب جیسے سنجیدہ بزرگ اپنے اوپر کنٹرول نہیں کر سکے، چیخیں مار مار کر روتے اور فرماتے یہ عاشق رسول کا جنازہ ہے۔ آپ کے انتقال کو پورے ۲۰ گھنٹے گذر چکے تھے لیکن آنسو تھمتے نہیں تھے کم و بیش ڈیڑھ لاکھ کے درمیان آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی۔

ملتان کی تاریخ میں ایسا دن نہ پہلے کسی نے دیکھا، نہ آئندہ اس کی امید ہے، علماء مشائخ اور سلاطین کے جنازوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

امامِ جنازہ

یہ اعلان ہو چکا تھا کہ نمازِ جنازہ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری پڑھائیں گے، خود مولانا حافظ عطاء المنعم صاحب[1] نے یہی تجویز کی تھی۔ مگر حضرت مولانا موصوف نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت شاہ صاحب[2] کے فرزند قاری حافظ سید عطاء المنعم صاحب جن کو حضرت شاہ صاحب[2] کا جانشین تجویز کیا جا چکا ہے اور دستار بندی ہو چکی تھی اب نمازِ جنازہ کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ خاص کر اس لئے کہ وہ ولی بھی ہیں چنانچہ حافظ صاحب نے اپنے قابلِ رشک باپ کا جنازہ خود ہی پڑھانے کی سعادت حاصل کی۔ ان کا صبر و حوصلہ قابلِ داد تھا غم واندوہ کے اس طوفان میں چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔

قبر

وفات کی خبر سن کر ڈپٹی کمشنر ملتان اور خیابانِ بی۔ اے قریشی کمشنر ملتان مکان پر تعزیت کے لئے آئے اور صدر مملکت کا پیغام بھی پہنچایا۔ کمشنر صاحب ملتان نے قبر کے لئے پرانے قلعہ پر جگہ کی پیشکش کی، اور صوبائی حکومت سے بھی اجازت لے لی۔ مگر علماء کرام اور اعزہ و اقارب نے حضرت شاہ صاحب[2] کے مزاج کے مطابق عام قبرستان میں دفن کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ شاہ صاحب[2] زندگی میں بھی عوام کے پاس بیٹھے تھے۔ برزخ میں کیسے ان سے جدا ہوتے۔

اہلِ ملتان کی قدردانی

حضرت شاہ صاحب[2] کے تابوت کو شمالی پنجاب کے مسلمان لاہور لے جانے کے لئے بضد تھے مگر ملتان کے دوستوں نے کہا کہ ہم اس سعادت سے کبھی اپنے آپ کو محروم نہ کریں گے۔ انہوں نے حضرت شاہ صاحب[2] کے لئے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کیں۔ آج وفات پہ سارا ملتان سوگوار ہے بلکہ

تمام بند تھے، مرزائیوں کے سوا تمام فرقوں نے اظہار ہمدردی کیا۔ صبح سے جو لاکھوں مہمان سیلاب کی طرح امڈے چلے آرہے تھے اہل ملتان کو اپنی خبر نہ تھی۔ اُن کی خبر گیری کیا کرتے اور یکا یک اتنی مخلوق کے لئے انتظام کرنا بھی مشکل ہوتا ہے نہ اس مخلوق کو شاہ صاحبؒ کے علاوہ کسی اور طرف دھیان تھا، ان کو نہ گرمی کا احساس تھا اور نہ ہی بھوک پیاس کا۔ مگر رات کے لئے دوستوں نے مل کر باہر کے مہمانوں کے لئے چاول پکانے کا انتظام کیا، شام چھ بجے سے لے کر رات گیارہ بجے تک کھانا کھلایا جاتا رہا۔

آخری منظر

ہر دو بڑے فرزندوں مولانا حافظ عطاء المنعم صاحب اور حافظ عطاء المحسن صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کو قبر میں اتارا، جہاں وہ قیامت تک کے لئے محو خواب رہیں گے۔

یہاں دل بے قرار چاہتا ہے کہ یہ شعر پڑھوں

نفسی الفداء لقبرٍ أنتَ ساکنہُ
فیہِ العفافُ وفیہِ الجودُ والکرم

(ترجمہ) میری جان اس قبر پر قربان ہو جس میں آپ آرام فرما ہیں۔ اس میں پاکی اور جود و کرم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جلسہ عام

رات کو عشاء کی نماز کے بعد ایک عظیم اجتماع کا اہتمام کیا گیا جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا گیا اور اس کے علاوہ اکابرین احرار، مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا محمد علی جالندھری اور شورش کاشمیری نے ان کے کارہائے نمایاں پر انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ نیز ان کی وفات کے بعد ان کے مشن پر قائم رہنے کا عزم بالجزم کیا۔ یہ اجتماع رات کو ایک بجے تک جاری رہا اور بالآخر امیر شریعت زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کے درمیان ختم ہوا۔

خواجہ صادق کاشمیری

امیرِ شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

کا

آخری سفر

دلخراش خبر

سوموار ۲۱ اگست کو شام کو چند دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میری بھانجی شائستہ شورش بول رہی تھی۔ اس نے بتایا، ابھی ابھی ملتان سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا انتقال ہو گیا ہے۔ خبر سن کر میری روح کانپ اٹھی، فضا میں ایک دھماکا ہوا، صبر و قرار کی کائنات برباد ہو کر رہ گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹیلیفون کا ریسیور گر گیا۔ وفورِ غم سے دل بیٹھنے لگا۔ "ہائے شاہ جی" کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا دنیا اندھیری ہوتی ہوئی نظر آنے لگی، مایوسی اور غم کے عالم میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور ملال و کرب کی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

منٹگمری ایجی ٹیشن، شہید گنج تحریک، دوسری جنگ عظیم میں بھرتی کے خلاف احرار کا محاذ، ناموسِ رسول کے لئے قادیان میں مرزا بشیر الدین محمود کو چیلنج، ختمِ نبوت تحریک، شاہ جیؒ کی طویل ترین دلپذیر تقاریر اور پھر ان کی قرآنی خوانی آنکھوں کے سامنے جھومنے لگی۔ اور وہ مبارک لمحے یاد آ گئے۔ جب مجھے اس عظیم شخصیت کے پاؤں دبانے کی سعادت حاصل ہوا کرتی تھی

عالم تصور میں بڑی دیر تک شاہ جیؒ کے پاؤں دباتا رہا کہ چوہدری عبدالرحیم صاحب کی آواز نے چونکا دیا۔

"خواجہ صاحب! کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟"

گلوگیر آواز میں انہیں بتایا کہ شاہ جیؒ ہمیں چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، چوہدری عبدالرحیم مجھے دلاسا دینا چاہتے تھے، مگر ان سے بھی صبر کا دامن چھوٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ چند منٹوں میں خبر محلہ بھر میں پھیل گئی۔ بے شمار لوگ میرے مکان پر اکٹھے ہو گئے ہر شخص حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

حاجی محمد اسحاق حنیف کا شمار صابر اور مواحد قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ کاروباری سلسلے میں روزانہ شیخ حسام الدین صاحب سے ٹیلیفون پر بات چیت کرتے ہیں اور یہ معمول گذشتہ پندرہ سال سے جاری ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں شیخ صاحب کا ٹیلیفون نمبر حفظ ہے۔ لیکن شاہ جیؒ کے انتقال کی خبر ان کے لئے بھی ناقابل برداشت تھی، وہ شیخ صاحب کو فون کرنا چاہتے تھے لیکن ہر بار غلط نمبر مل جاتا ہے۔ آخر انہوں نے مجھے فون کیا اور شیخ صاحبؒ کا نمبر پوچھا۔ اس وقت حاجی صاحب کی آواز میں بڑا دردناک کرب تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس مواحد اور مضبوط عقیدے کے بزرگ کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں

ملتان کو روانگی

شورش صاحب نے اطلاع دی کہ پونے نو بجے گاڑی سے ملتان جانے کا پروگرام ہے تیار ہو جاؤ۔ لہٰذا اسی وقت حاجی محمد حنیف کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن پہنچا، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، آغا شورش کاشمیری، مولانا مظہر علی اظہر، سالار معراج دین، حاجی محمد جہانگیر میاں سعید اقبال، حاجی حبیب اللہ اور دوسرے بیشمار عقیدتمند وہاں ملتان جانے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے، سیکنڈ کلاس کی نشستیں ختم ہو چکی تھیں، تھرڈ کلاس کے ڈبے کھچا کھچ بھر چکے تھے جسے جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا، شیخ صاحب، شورش صاحب اور ماسٹر جی فرسٹ کلاس میں تھے، مولانا مظہر علی اظہر اور لاہور کے رئیس حاجی حبیب اللہ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے تھے، حاجی

اسحٰق حنیف نے سیکنڈ کلاس کی ٹکٹیں لی تھیں۔ مگر انہیں انٹر کلاس میں جگہ ملی۔ غرضیکہ جگہ اور آرام سے بے نیاز ہر شخص امیر شریعتؒ کے آخری دیدار کی دھن میں ملتان پہنچنے کے لئے بے تاب تھا خانیوال کے اسٹیشن پر ٹوبہ ٹیک سنگھ کے سو سوا سو ساتھی اس گاڑی میں سوار ہوئے جن میں خواجہ جمال الدین بٹ۔ مولانا عبید اللہ احرار، مولانا تاج محمود۔ مسٹر محمد عالم بھی شامل تھے۔ جھنگ سے صوفی شیر محمد، مولانا غلام قادر، مولانا صادق حسین مولانا عبد الحلیم کے ہمراہ بھی ساٹھ ستر آدمی آن ملے۔ کوئٹہ ایکسپریس صبح ساڑھے پانچ بجے ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچی تو مرحوم کے مرید خاص اور شاگرد قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے آنسو بھری نگاہوں سے سوگوار ساتھیوں کا استقبال کیا۔ قاضی صاحب نصف گھنٹہ پہلے شاہ جیؒ سے ملنے کراچی سے ملتان پہنچے تھے۔ اسٹیشن پر اخبار پڑھا تو کلیجہ پھٹ گیا۔ دل تڑپ اٹھا پلیٹ فارم پر ہی بیٹھ گئے۔ اتنے میں لاہور سے گاڑی پہنچ گئی۔ قاضی صاحب نے اصرار نہ تھا اور اپنے رفقاء کار کو دیکھا تو ایک ایک سے گلے مل کر روئے اور دوسروں کو رلایا۔

سوگواروں کا یہ قافلہ صبح سویرے کوٹلہ تولے خان کی ایک تنگ و تاریک بستی میں امیر شریعت کے مکان پر پہنچا۔ اس علاقے کے تقریباً تمام مکان کچے اور شکستہ ہیں، جوہڑوں میں پانی کھڑا ہے جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے انبار لگے ہیں۔ اس علاقے کے ایک کچے اور شکستہ مکان میں شاہ جیؒ گزشتہ چودہ سال سے چالیس روپے ماہوار پر گزر کر رہے تھے۔ ان سے پہلے اس مکان میں پاکستان کے نامور سائنسدان پروفیسر عبد السلام کے والد رہا کرتے تھے۔ انہوں نے خالی کیا تو اس مکان کو دنیائے اسلام کے نامور مجاہد کا مسکن بننے کا شرف حاصل ہوا۔

زیارت

عقیدتمندوں کا اصرار تھا کہ انہیں شاہ جیؒ کی زیارت کرائی جائے۔ لیکن مرحوم کے فرزند حافظ عطا المنعم اپنی مجبوری بیان کر رہے تھے کہ مکان میں جگہ تھوڑی ہے، پردے کا انتظام نہیں ہو سکتا صبر کریں۔ تھوڑی دیر بعد میت کو کسی کھلی جگہ پہنچانے کا انتظام کیا جائے گا لیکن مرحوم کے مخلص عقیدتمند حاجی حبیب اللہ، قاضی احسان احمد اور چند دوسرے ساتھیوں کو بھی اندر آنے کی

اجازت مل گئی، خواتین پرانے ٹاٹ کے پیوند لگے پردوں میں چھپ گئیں۔

شاہ جیؒ جنہوں نے دو سال تک فالج اختلاج قلب، یرقان اور ٹائیفائیڈ سے جنگ لڑی تھی، لٹھے کے کفن میں لپٹے آخری سفر کے منتظر تھے، یرقان کی وجہ سے ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا، سرخ و سفید نورانی چہرے والے نواسۂ رسولؐ پر کمزوری کے نشان عیاں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر عجیب استقلال و اطمینان ٹپک رہا تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی طویل تقریر کے بعد تھک کر سو گئے ہیں۔ لیکن جب یہ خیال آتا کہ شاہ جیؒ اب بیدار نہ ہوں گے تو عقیدتمند بے ساختہ رو پڑتے۔ مجمع پر تو لرزہ خیز رقت طاری تھی۔ ایک طرف شاہ جیؒ کی میت اور دوسری طرف اس عظیم انسان کے گھر کا نقشہ ——— پیوند لگے ٹاٹ کے پردے، مٹی کے برتن، پھٹے پرانے بستر، شکستہ چارپائیاں۔

شاہ جیؒ کی بیماری اور اس کا علاج

جس بزرگ کے در پہ بڑے بڑے رئیس، امیر، وزیر، علماء اور صوفیا حاضری دینا باعث سعادت و فخر سمجھتے تھے، جس کی ایک تقریر انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی تھی، جو اگر چاہتا تو دولت کے انبار اکٹھے کر لیتا، عالیشان کوٹھیاں بنا لیتا، اقتدار چاہتا تو بڑا عہدہ حاصل کر لیتا، مرتے دم تک سر چھپانے کے لئے ایک مکان بھی نہ بنا سکا۔ کرائے کے مکان میں مفلسوں کی زندگی گزاری، فاقہ ہوا تو شکوہ نہ کیا، تکلیف ہوئی تو اُف تک نہیں کی، کبھی کسی کو احساس نہ ہوا کہ اس مہاجر کو سر چھپانے کے لئے جگہ ہی دے دی جائے۔

شاہ صاحبؒ یوں تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے بیمار تھے، لیکن گزشتہ رمضان میں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس کا اثر زبان اور جسم کی دائیں جانب ہوا، مرحوم پر فالج کا یہ چوتھا حملہ تھا، عید الفطر کے دوسرے روز انہیں نشتر ہسپتال داخل کرایا گیا جہاں ان کا باقاعدہ علاج شروع ہوا۔

مرحوم کی بلند پایہ دینی و ملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نشتر کالج اور ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کو ہدایت کی کہ ان کے علاج میں پوری احتیاط کی جائے

اس سلسلے میں اگر کسی ایسی دوا کی ضرورت ہو جو ملک میں نہ مل سکتی ہو تو انہیں بتایا جائے تاکہ وہ دوائی درآمد کر لی جائے، شاہ جیؒ ڈیڑھ ماہ تک ہسپتال میں رہے جہاں سے ان کے لڑکے انہیں گھر لے آئے۔ گزشتہ جون میں انہیں شیخ حسام الدین علاج کے لئے لاہور لے آئے یہاں لاہور کے مشہور حکیموں کے بورڈ نے ان کا معائنہ کیا۔ لیکن علاج کرنل ضیا الدین سے کرایا گیا یہاں ان کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو ایک ماہ پہلے انہیں واپس ملتان لے جایا گیا۔ جہاں کرنل ضیا الدین کی ادویات استعمال کرائی جاتی رہیں۔ لیکن ملتان میں حالت اور بھی خراب ہو گئی فالج کے بھرپور حملہ کے باعث قوت گویائی بالکل ختم ہو گئی۔ کبھی کبھار بڑی مشکل سے بات کرتے تھے لیکن مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا اور پھر اچانک بخار شروع ہو گیا۔ موت سے تین روز قبل یرقان کا حملہ ہوا جس سے جسم کی رنگت بدل گئی۔ رہی سہی توانائی بھی ختم ہو گئی۔ ان حالات میں ان کے ذاتی معالج حکیم عطا اللہ اور ان کے صاحبزادے حکیم حفیظ اللہ سے رجوع کیا گیا انہوں نے بتایا کہ تکلیف جگر کے ساتھ ساتھ اندرون جگر سوزش اور ورم بھی ہو گئی ہے، ضعف قلب پہلے ہی تھا۔ لیکن اب زیادہ ہے ان دنوں مرحومؒ کو ایک سو سے ایک سو چار درجے بخار رہنے لگا۔ آخر ان عوارض نے مل کر اس بلند ہمت انسان کو گرا لیا اور ۲۱، ۲۲ اگست کی منحوس شام کو ۶ بج کر پچاس منٹ پر انتقال فرما گئے۔

ملتان میں آمد

قیام پاکستان کے بعد سید عطاء اللہ شاہ بخاری امرتسر سے ہجرت کر کے اپنے دوست نوابزادہ نصر اللہ خاں کے پاس خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ چلے گئے۔ لیکن ۱۹۴۸ء کے سیلاب میں یہ بستی زیر آب آگئی تو شاہ جیؒ ملتان چلے آئے۔ کوٹلہ تولے خاں کے محلہ تھی شیر خاں میں چالیس روپیہ ماہوار کا مکان لے کر رہنے لگے۔

شاہ جیؒ کا پورا نام سید شرف الدین عطاء اللہ شاہ بخاری تھا۔ ندیم تخلص تھا اور آپ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ بمطابق ۱۸۹۱ء بروز جمعہ بوقت سحر پٹنہ صوبہ بہار میں پیدا ہوئے تھے لیکن بعد میں اپنے والدین امرتسر میں چلے گئے اور آزادی کے بعد مرحومؒ پاکستان

سے چلے آئے، شاہ جیؒ کے چار بیٹے حافظ عطا المنعم، سید عطا المحسن، عطا المومن اور عطا المہیمن اور بیٹی [illegible] کے پروفیسر سید عبد الوکیل کے ساتھ بیاہی ہوئی ہیں۔

شاہ جیؒ جس حال میں بھی رہے کبھی شکوہ نہ تھا۔ لاہور اور دیگر اضلاع کے عقیدتمندوں نے کوشش کی کہ ان کے شہر میں چل کر بہتر مکان میں رہیں مگر آپ نے انکار کر دیا۔ ایک مرتبہ گجرات کے ایک عقیدتمند نے شدید اصرار کیا تو ملتان کے خان مظہر نواز خاں نے کہا کہ ہم کٹ مریں گے۔ لیکن ملتان کو شاہ جیؒ کے قیام کی سعادت سے محروم نہ ہونے دیں گے، شاہ صاحبؒ نے مسکرا کے کہا، میاں مت گھبراؤ اس فقیر نے اپنا وجود تمہارے سپرد کر دیا ہے اب تم ہی اس کے وارث ہو، کوٹلہ تولے خاں کے تنگ و تاریک کوچہ میں مرحوم کو شاہ و گدا ملا کرتے تھے۔ وہاں رئیس و وزیر بھی جاتے اور فقیر بھی، جو سب فرش خاک پر ہی شاہ جیؒ کے روبرو بیٹھتے، عقیدتمند ان کی خدمت کر دیا کرتے تھے، اللہ کے بھروسے پر ساری زندگی گزار دی۔ کہا کرتے تھے کہ خالق حقیقی نے کبھی اس فقیر کی ضروریات کو نظرانداز نہیں کیا۔ آخر دم تک فقر و استغنا کا نمونہ تھے۔

ان کی محفلیں ایک مدت تک یاد رہیں گی۔ شاہ جیؒ جہاں ہوتے صبح سے شام تک ایک میلہ سا لگا رہتا۔ شاہ جیؒ لوگوں کے دلوں پر حکومت کیا کرتے تھے لوگ اپنا غم لے کر آتے اور شاہ جیؒ کے سامنے زانوں ملے کرتے اور غم بھول جاتے۔

جذبۂ غریب پروری

وہ ملتان میں اپنے غریب اہل محلہ کے لئے شفقت اور محبت کا خزانہ تھے۔ ان کے دولتمند عقیدتمند جو ہدیے دیتے وہ بے آسرا لوگوں کے کام آتا۔ وہ بڑی خاموشی سے ان کے گھروں میں رقم پہنچا دیا کرتے اور یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ ان کے معالج حکیم حنیف اللہ نے بتایا کہ ایک روز کہنے لگے:

"حکیم صاحب کبھی آپ نے مجھ سا صابر اور فرمانبردار مریض بھی دیکھا ہے"

اور اکثر حکیم صاحب کی کوششوں پر مسکرا دیا کرتے اور کہتے بھئی میں نے تو بہت جی! تم

اپنی سعی کر دیکھو۔ مگر میں تو اپنے خالق حقیقی سے ملنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک عقیدت مند نے کہا، شاہ جی! مجھے تعویذ لکھ دو۔ شاہ جیؒ نے جواب دیا، مجھ سے عرضی نویسی کراتے ہو۔ ایسی عرضی تو تم بھی لکھ سکتے ہو۔ وہ کبھی اپنے عقیدتمندوں کو موقعہ ہی نہیں دیا کرتے تھے کہ وہ انہیں کراماتی پیر کا درجہ دیں۔ وہ علمائے دیوبند کے مسلک سے تعلق رکھتے تھے لیکن دین کی خدمات کے معاملہ میں کبھی تعصب سے کام نہ لیا۔ انہوں نے ہر مکتب ہائے فکر کے مدارس کی امداد فرمائی، ان کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوئے۔ انہوں نے بیشمار مدرسوں کی بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھی یہی وجہ ہے آپ ہر حلقہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

عقیدتمندوں کی ملتان میں آمد

۲۱ اگست کی رات کو ریڈیو پر ان کے انتقال کی خبر نشر ہونے کے بعد ملک کے ہر گوشہ سے عقیدت مند ملتان پہنچنا شروع ہو گئے۔ کراچی سے لے کر پشاور تک کے تقریباً ہر ضلع سے لوگ ملتان پہنچے۔ جنازہ اٹھنے تک ریل کار، ہوائی جہاز، ٹرک، بس، سائیکل اور پیدل تقریباً دس ہزار لوگ باہر سے ان کے جنازے میں شرکت کے لئے ملتان پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں کے لئے شاہ جیؒ کے مکان سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر مدرسہ قاسم العلوم میں جو شامیانے لگوا دیئے گئے تھے جہاں بے شمار لوگ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے

کمشنر اور ڈپٹی کمشنر شاہ جیؒ کے مکان پر

دس بجے کے قریب کمشنر ملتان مسٹر بی۔ اے قریشی تعزیت کے لئے شاہ جیؒ کے مکان پر پہنچے۔ انہوں نے حکومتِ مغربی پاکستان کی طرف سے پیش کش کی کہ اس جلیل القدر رہنما کو ملتان کے تاریخی قلعہ میں دفن کیا جائے۔ لیکن مرحوم کے صاحبزادوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مرحوم نے زندگی بھر اپنے لئے کبھی کوئی رعایت حاصل نہیں کی مرنے کے بعد بھی سرکاری رعایت حاصل کرنا ان کے مسلک کے خلاف ہے۔ لیکن عقیدتمندوں کی

خواہش تھی کہ شاہ جیؒ کو ان کی شان کے مطابق ملتان میں دفنایا جائے۔ انھیں مرحوم کے صاحبزادوں کے انکار سے مایوسی ہوئی۔ اس موقعہ پر مولانا محمد علی جالندھری نے مدرسہ قاسم العلوم میں اکٹھے عقیدتمندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ مرحوم اکثر اپنی موت کا ذکر کرتے اور اکثر کہا کرتے تھے اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سر راہ ہو اور گزرتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں۔

شاہ جیؒ کے لڑکے کی دستار بندی۔

مولانا محمد علی نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ عقیدت اور جذبات سے مرعوب ہو کر مرحوم کے مسلک کو تبدیل نہ کریں بلکہ ان کے مشن کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں مولانا محمد علی جالندھری نے شاہ صاحبؒ کے بڑے لڑکے حافظ عطاء المنعم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عمر کے لحاظ سے وہ ہمارے عزیز ہیں لیکن سادات اور شاہ جیؒ کے بیٹے کی حیثیت سے وہ ہمارے بزرگ اور باپ ہیں۔ شاہ جیؒ کی موت کے بعد وہی ان کے جانشین ہو سکتے ہیں لہذا اسی وقت حافظ عطاء المنعم کو مرحوم کا باقاعدہ جانشین کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ مولانا خیر محمد نے ان کی دستار بندی کی رسم ادا کی۔

حافظ عطاء المنعم کا صبر اور استقلال

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا بیرون جات سے آنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا ہر طرف سے ایک ہی خواہش اور مطالبہ تھا کہ انھیں شاہ جیؒ کی زیارت کرائی جائے لیکن حافظ عطاء المنعم تنگ مکانی کے باعث معذرت کر رہے تھے انھوں نے بڑے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ عظیم و شفیق باپ کی موت کے صدمہ کے باوجود ان کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا وہ اپنے دوسرے بھائیوں سمیت ایک مرد مجاہد اور پیکر عزت کی طرح جنازہ کے انتظامات اور لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جنازہ اٹھایا گیا

ساڑھے تین بجے نماز ظہر کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ سب سے پہلے گھر سے میت کو حافظ عطاء المنعم، قاضی احسان احمد، حاجی محمد اسحٰق حنیف اور مولانا تاج محمود کندھا دے کر باہر لائے، اس وقت ٹبی شیر خاں کی تمام سڑکیں میدان اور گلیاں لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئی تھیں، ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مرحوم کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جنازہ کے چاروں طرف بڑے بڑے آٹھ بانس لگا دیئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود نصف سے زیادہ لوگ کندھا دینے سے محروم رہ گئے۔ جنازہ تک پہنچنا ایک کڑا مرحلہ تھا، ہجوم کے باعث کمزور اور ناتواں لوگ تو میت تک پہنچ ہی نہ سکتے تھے۔ جنازے کا جلوس کم از کم ایک میل لمبا تھا حد نظر تک انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔

نماز جنازہ

چار بجے جنازہ ایمرسن کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک گھنٹہ تک لوگوں کو مرحوم کی زیارت کا موقع دیا گیا لیکن اس عرصہ میں ایک چوتھائی لوگ بھی زیارت نہ کر سکے، کچھ عقیدت مند مرحوم کے پاؤں پکڑ کر رونے لگے۔ کوئی ان کا منہ چومنے لگا، حتیٰ کہ بےشمار عورتیں بھی پہنچ گئیں جس کی وجہ سے جنازہ کو ڈھانپ دیا گیا اور نماز جنازہ کے لئے صفیں بنائی گئیں۔ اس کام میں بھی پون گھنٹہ لگ گیا۔ حافظ عطاء المنعم نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں ڈپٹی کمشنر، ملک کرم داد خاں ایس پی مرزا محمد عباس، سید العلماء حسین گیلانی، سید محمود گردیزی حضرت مولانا عبداللہ درخواستی، مولانا احترام الحق تھانوی کے علاوہ متعدد اکابر، بےشمار علماء اور صوفیائے کرام شریک تھے۔

تدفین بخاریؒ

شام کو ٹھیک چھ بجے مرحومؒ کو باقری قبرستان میں بالکل سڑک کے کنارے آغوش لحد کے سپرد کر دیا گیا۔ شاہ جی ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے دب گئے، لوگ ہچکیاں مار مار کر رونے لگے اور

برصغیر ہند و پاک تحریک آزادی کا دل آویز باب ختم ہو گیا۔

تعزیتی جلسہ

مقامی حکام نے اس موقع پر تعزیتی جلسہ کرنے کی اجازت دے دی تھی رات کو قاسم باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ لائلپور کے مولانا تاج محمود کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں صاحبزادہ سید محمد سلیمان علادل، مولانا عبدالرحمٰن میانوی، مولانا محمد علی جالندھری، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور آغا شورش کاشمیری نے تقریر کرتے ہوئے مرحوم کی موت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور ان کی ملی اور دینی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

آغا شورش کشمیری نے اپنی تقریر میں کالونی ملز کے مالکان کی اس روش پر افسوس کا اظہار کیا کہ انہوں نے اس عظیم المرتبت شخصیت کی موت کے باوجود بھی ٹورنامنٹ بند نہیں کیا جو کالونی ملز کے مالکوں کی طرف سے کرایا جا رہا تھا۔

عبداللہ بٹ

ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

قائدِ احرار

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی موت ایک ایسے مجاہد کی موت ہے جس کی زندگی تاریخ جہاد حریت میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہے، اِن کی موت سے وہ شعلہ سرد ہو گیا ہے جو خرمنِ باطل پر بجلی کی طرح لپکتا تھا۔

وہ آواز خاموش ہو گئی جو ہمیشہ حق و صداقت کی طرف راہنمائی کرتی تھی۔ جو روح کو گرماتی اور سینوں میں ایمان کی کرنیں بن کر پھیل جاتی تھی۔ دنیا اس بلبلِ ہزار داستاں کی نغمہ طرازیوں اور خوش الحانیوں سے محروم ہو گئی۔ جو ایک مدت تک گلستانِ وطن کی بہاروں کو رونق بخشتا رہا اور جو چمنستانِ حریت میں مستانہ وار نغمہ زن رہا ؎

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

وہ لیلائے حریت کی تلاش میں سیاست کی پُر خار وادیوں میں دیوانہ وار مصروفِ سفر رہا۔ گاہ اپنے پاؤں کے تلوؤں سے کانٹے چنتا اور گاہ اپنے چاکِ گریباں کی دھجیاں بکھیرتا آشفتہ حریت سے سرشار منزلِ مقصود کی طرف چلا گیا، اپنوں کی لعن و تشنیع اور غیروں کی یلغار اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش پیدا نہ کر سکی۔ اس نے راستے کی مشکلات اور سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ وہ اپنی زندگی کے مشن کی تکمیل میں مصروف رہا ؏

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے

عشق میری جان ۔ آزادی میرا ایمان ہے
عشق پہ کر دوں فدا اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

اس کی آزادی اور اس کا عشق اسلام کی کھوئی ہوئی عظمت کے حصول کا وسیلہ ہے وہ حرمت ناموس رسول کو عظمت اسلام کی ضمانت سمجھتے ہوئے اس کی پاسبانی کا حق ادا کرتا رہا اور ختم نبوت کو وحدت اسلامی کا بنیادی پتھر قرار دے کر ہر اس مدا نلت کیخلاف سینہ سپر رہا۔ جو قصر ختم نبوت میں دراڑ پیدا کرنے کی غرض سے عمل میں آئی۔ وہ شمع نبوت کا پروانہ تھا اور اس موضوع پر اس کی خطابت وہ جوہر دکھاتی کہ سامعین کے دلولے قابل دید ہو جاتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ؎

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کاروانِ احرار کے سرخیل تھے، احرار آزادیٔ وطن کے نشہ سے سرشار ہونے کے باوجود کانگریس کی ہندو اکثریت سے ہم آہنگ نہ ہو سکے اور اسلام پر دل و جان سے قربان ہونے کا جذبہ رکھنے کے باوصف اپنے آپ کو مسلم لیگ کی ہیئت ترکیبی کا ہمنوا نہ بنا سکے۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا ایک درمیانی راستے کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ ملکی سیاست کی تیز رفتاری بھارت اور پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی اور احرار نے جماعتی اعتبار سے شجرِ سیاست کو ممنوع قرار دے کر اس سے پیچھا چھڑا لیا۔

شاہ صاحبؒ کی زندگی میں ایسے کئی مرحلے آئے جب انہوں نے عملی سیاست سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر رفقاء کار نے وفاداری کا واسطہ دے دے کر ان کے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہننے دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ذاتی شہرت کو بھی جماعتی سیاست کی دہلیز پہ قربان کر دیا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ احرار کی سیاست بعض مخصوص حلقوں کے موثر پروپیگنڈے کی وجہ سے "مشکوک" سمجھی جاتی ہے۔ ایک طرف ہندو کانگریس کی جانب سے آزادیٔ وطن کے سلسلہ میں ان کی قربانیوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے تو دوسری طرف اسلامی مملکت کے قیام کے بارے میں مسلم لیگ ان کے کردار کو مردود سمجھتی ہے۔ حالانکہ یہ محض

صورتیں غلط ہیں، انگریز سامراج کے خلاف احرار کی یلغار اور احراری جانبازوں کی قربانیاں کسی سے کم نہیں، دوسری طرف اسلام سے محبت اور اسلامی عظمت کے حصول کی خاطر اسلامی طرزِ ملک کو زندہ رکھنے میں احرار کا حصہ مسلم لیگ سے کہیں زیادہ ہے، احرار کی بدقسمتی یہ تھی کہ ان کی اکثریت عوام میں سے تھی، یا کچھ لوگ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے احرار کی قیادت اپنی بے خوفی اور جانبازی کے باوجود احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ وہ کانگریس کے ہندو سرمایہ دار اور مسلم لیگ کے مسلمان جاگیردار دونوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہشمند تھی چنانچہ چوہدری افضل حق مرحوم کے خطبہ کا اقتباس اس خیال کو تقویت دیتا ہے،

چوہدری صاحب مرحوم نے کہا:-

" دیکھا پاکستان کے نعرہ کی مخالفت نہ کرنا، یہ دکھے دلوں کی فریاد و فغاں ہے۔ یہ غلام اچھوتوں یعنی ہندی مسلمانوں کی دردناک صدائے بازگشت ہے جو دل کی گہرائیوں سے اول نکلی ہے اور پھر دماغ کے گنبد سے ٹکرا کر لوٹی ہے، ہندو سوسائٹی کا ماحول ایسا تنگ ہے کہ وہاں مسلمانوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہندو ذاتی حیثیت میں بہترین انسان ہے۔ لیکن عجیب بدنصیبی ہے کہ یہی مرنجان مرنج افراد جب جماعتی حیثیت میں بیٹھتے ہیں تو مسلمانوں کی جان اجیرن ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں سے علیحدہ رہ کر اور ان سے علیحدہ رہ کر سوچتے ہیں، مسلمان یہاں رہ کر بھی بے سہارا سا محسوس کرتا ہے۔ ہندو یہ کبھی قیاس ہی نہیں کرتا کہ اس کے طرزِ عمل کا کوئی رد عمل بھی ہوگا، یا ہو سکتا ہے، علیحدہ انتخاب اور علیحدہ گھر نباہ نہ ہونے کا آخری چارہ کار ہے۔ جب اکثریت اپنی تنگ دلی سے دوسرے پر عزت کی کوئی راہ باقی نہ رکھے تو بوکھلا کر بھاگ کھڑے ہونے کے سوا چارہ کار کیا ہے۔ پاکستانی غریب دراصل ہندو سرمایہ دار سوسائٹی کے طرزِ عمل سے بوکھلا کر بھاگا ہوا مسلمان اچھوت ہے، چاہتا ہے، مرنے بھرنے کے لئے کوئی نہ کوئی مل جائے۔ جہاں وہ آرام سے پڑا رہے

البتہ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ مسلمان سرمایہ دار کے ہتھے چڑھ گیا ہے
جو ہندو سود خوار سے چھڑا کر مسلمان کی جاگیرداری میں پھنسا چاہتا ہے۔ ہندو
دشمن بن کر لوٹتا تھا۔ یہ دوست بن کر گلا کاٹے گا۔ غرض الغنڈہ ہندوستان
اور پاکستان دونوں جگہ بیچارے مسلمان کا "کونڈا" ہو گا۔

مندرجہ بالا اقتباس مزید وضاحت کا محتاج نہیں ہے اگر دیانتداری کے ساتھ سیاسی حالات کا جائزہ لیا جائے تو احرار کے سیاسی کردار کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ احرار نے انگریزی سامراج سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا اور اسلامی فکر کو اوڑھنا بچھونا بنا کر قیام پاکستان میں مدد دی۔ ان کا حال ان مزدوروں کے مشابہ تھا جو سڑک بنا کر سڑک کے کنارے کھڑے ہو جائیں اور پھر اس سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی رنگا رنگی اور تیز رفتاری کو دیکھ کر ششدر رہ جائیں۔

اگر احرار کو تھوڑی سی فرصت میسر آتی تو ان میں جس رفتار سے فکری پختگی پیدا ہو رہی تھی اور ان کا ذہن جس طرح تبدیلی قبول کر رہا تھا اس کو سامنے رکھ کر یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ احرار تحریک پاکستان میں پیش پیش ہوتے، کیونکہ یہ جماعت حقیقی معنوں میں شاہ اسمٰعیل شہید کی سیاسی اور دینی جانشین قرار دی جا سکتی ہے۔ مجلس احرار کے سیاسی مسلک، کردار اور عمل کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے کبھی انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ مسلم عوام اور درمیانہ طبقہ کے مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے والی جماعت کی عدیم النظیر قربانیوں کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی رنگ دے کر ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں جب اس قسم کے سیاسی تعصب تاریخ کے دھارے کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور جب مستقبل کا مؤرخ بیسویں صدی کے نصف اول کی تاریخ مرتب کرے گا تو احرار کو حریت اور عظمتِ اسلام کا بے خوف و بے لوث علمبردار قرار دے کر انہیں خراج تحسین ادا کرے گا اور عطاء اللہ شاہ بخاری کا وجود قائد احرار کی حیثیت سے زندہ جاوید رہے گا۔ وہ حریت وطن کا جانباز سپاہی، اسلام کا عظیم فرزند اور حرمت ناموسِ رسولؐ کا پاسبان تھا۔

شاہ صاحبؒ کا مذاق سخن پاکیزہ اور بلند تھا۔ کہ اس کی نظیر ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل

ضرور ہے۔ انہوں نے اردو کے مشہور شاعر شاد عظیم آبادی مرحوم کی گود میں پرورش پائی اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے شعر و سخن کے مذاق کو چار چاند لگائے۔ شاہ صاحبؒ مرحوم و مغفور کو لاکھوں نہیں تو ہزاروں شعر یاد تھے۔ رومی، حافظ، خیام، میر، غالب اور اقبال کا کوئی اچھا شعر ایسا نہیں تھا جو انہیں یاد نہ ہو۔ بعض غیر معروف شعرا کا کلام بھی مزے لے لے کر سناتے وہ سخن شناس بھی تھے اور خود بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ ندیمؔ تخلص کرتے تھے اور فارسی اور اردو میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔

وہ جہاں بیٹھتے تھے باغ لگا دیتے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

چگونہ مستے بہ میاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بدمست اند

تقریباً چالیس سال پیشتر کی بات ہے ترک موالات یا لاتعاون کی تحریک نے پاک وہند کی بوقلموں وسعتوں کے چپے چپے میں وہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ طوفانی سمندر کی سطح کو بھی شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔ ہر ملت و قوم کی آزادی کے مختلف طبقات جوش و خروش سے تحریک میں شامل ہو رہے تھے۔ برطانوی قہرمانی بھی آخری حد تک پہنچی تھی، نظام دار و گیر کے تمام عناصر اپنے اختیارات انتہائی شدت سے استعمال کر رہے تھے تاکہ پوری فضا ہیبت و دہشت سے معمور ہو جائے۔ فداکاران ملک و ملت ہزاروں کی تعداد میں جیلوں کے اندر پہنچ چکے تھے۔ پھر بھی جدھر نظر اٹھتی تھی ہر عمر، ہر صنف، ہر پیشے اور ہر درجے کے کارکن اس زور و شور سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے فوارے سے پانی کی لہریں اٹھتی ہیں یا چشمے ابلتے ہیں، گویا قضاو قدر کی بارگاہ میں طے ہو چکا تھا کہ تمام جیل بھر جائیں گے، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ختم ہو جائیں گی گرفتار کرنے والے ہاتھ تھک جائیں گے، سزائیں تجویز کرنے والے قلم خشک ہو جائیں گے۔ مگر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے والوں کے سیل کا تموج تلاطم کم نہ ہوگا، تیز تر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ اپنی نوعیت کی بالکل یگانہ اور عجیب و غریب جنگ تھی جس نے پہلی مرتبہ اس وسیع سرزمین میں انگریزی اقتدار کی بنیادیں جڑوں تک اس طرح ہلا دیں کہ پھر انہیں جماؤ نصیب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ربع صدی کے بعد اس کی بساط ہمیشہ کے لئے سمٹ گئی۔ جس

سلطنت کے لئے فخر کا سب سے بڑا سرمایہ یہ تھا۔ کہ اس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، وہ ماضی کا ایسا ہی خیالی افسانہ بن گئی ہے، جیسے ہزاروں افسانے اس سے پیشتر موجود تھے، سلطنت کیا تھی تاش کے پتوں کا ایک گھروندا تھا کہ اس میں سے ایک پتہ کھسکا تو سارا گھروندا درہم برہم ہو گیا۔

محبت و عقیدت کا پہلا نقش

میں اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھنے کی تیاریاں کر رہا تھا، اس وقت پہلی مرتبہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا نام سنا۔ لوگ ان کے بیان و خطابت کی سحر انگیزی اور زور و تاثیر کی ستائش ایسے انداز میں کرتے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ اس حقیقت کی جگہ افسانے کا رنگ غالب ہے۔ میں نے ۱۹۲۲ء میں اخبار نویسی شروع کی تو اکثر بڑے بڑے لیڈر اور کارکن قید ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت شاہ صاحبؒ بھی شامل تھے۔ سزائے قید سنا دینے کے بعد انہیں میانوالی جیل بھیج دیا گیا جو عام گزرگاہ سے ہٹا ہوا تھا اور وہاں بالقصد جانے والے لوگوں کے سوا کسی کے پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ شاہ صاحبؒ کے بعض رفیق اور دوست پہلے سے وہاں موجود تھے بعض بعد میں وہاں پہنچ گئے۔ بہر حال اس وقت مجھے شاہ صاحب کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ سالک مرحوم ۱۹۲۱ء کے اواخر میں قید ہوئے تھے انہیں بھی میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہ نومبر ۱۹۲۲ء میں رہا ہو کر آئے تو ان کے ساتھ اخوت و رفاقت کا وہ پیمان استوار ہوا جو عملاً زندگی بھر کا پیمان بن گیا۔ وہ اکثر اپنے رفیقانِ اسیری کے احوال و وقائع و لطائف و ظرافت سناتے رہتے۔ مثلاً مولانا احمد سعید مرحوم ناظم جمعیت العلماءؒ صوفی اقبال احمد مرحوم پانی پتی، مولانا عبداللہ مرحوم دہلوی چوڑی والے، عبدالعزیز مرحوم انصاری، مولانا سید داؤد غزنویؒ، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی وغیرہم۔ رفیقوں میں سے جس شخصیت کے ذکر پر مرحوم سالک کے انداز میں محبت و الفت کی خاص شان پیدا ہو جاتی تھی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے۔ اس طرح میرے دل میں شاہ صاحبؒ کے متعلق محبت و عقیدت کے مخلصانہ جذبات پیدا ہوئے، اور اس مشہور شعر کی حقیقت

کا عملی تجربہ پہلی دفعہ ہوا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

رشتۂ ناز کی استواری

شاہ صاحبؒ قید کی مدت پوری کر کے رہا ہوئے تو کئی سال تک سیاسی دائرے میں ہم نے اکٹھے کام کیا اور خاصا وقت یکجائی میں گزرتا رہا۔ میں نے ان کی وہ تقریریں تو زیادہ نہ سنیں جن کی شہرت سے پاک و ہند کی فضا گونج رہی تھی اور خطابت میں انہیں قدرت کا ایک خاص عطیہ سمجھا جاتا تھا۔

مولانا غلام رسول کی حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت کے متعلق ذاتی رائے

تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کے متعلق جو کچھ ترکِ موالات کے آغاز سے سنتا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ واقفیت کا محض سرسری بلکہ نامکمل تجربہ تھا۔ خطابت شاہ صاحبؒ کے خداداد جوہروں میں سے صرف ایک جوہر تھا۔ اگرچہ زمانہ ان سے خطیب ہی کی حیثیت سے روشناس تھا اور اب بھی ان کا ذکر کرتے ہوئے خطابت ہی کو مرکزی وصف بنا دیا جاتا ہے، مجھے وہ اپنے دور کے بہت بڑے انسان نظر آئے، کیونکہ وہ بہت بڑے مسلمان تھے اوّل و آخر ظاہر و باطن مسلمان تھے۔ ان کے وجود کی مادیت و معنویت کا ذرہ ذرہ اسلامیت ہی کے مختلف پرتو تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ عمر بھر ہر حلقے میں مقبول و ہر دلعزیز رہے۔ چنانچہ مرحوم سالک کی گفتگوؤں سے شاہ صاحبؒ کے متعلق محبت و عقیدت سے استفادہ کے بعد وہ

"کالنقش فی الحجر"

ہو گئے۔ چالیس سال کے لیل و نہار کا طویل زمانی دور گزر جانے کے بعد آج بھی وہ نقوش پہلے یکساں تاباں و درخشاں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ مجبور کن حالات کی بے پناہ رفتار نے اُن سے قرب و یکجائی کے مواقع یک قلم ختم کر دیئے تھے، بلکہ لقاء و زیارت کی دولت بھی صرف

اتفاق پر موقوف رہ گئی تھی، سیاسی دائرے میں بارہا ان سے اختلاف کی نوبت بھی آئی، بعض اوقات تو اختلاف مقابلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا یعنی شاہ صاحبؒ ایک فریق کے ساتھ ہوتے تو میرے محکر و نظر کا یہ تقاضا ہوتا کہ دوسرے فریق کا ساتھ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یکجائی کی نوبت بھی بہت کم آتی۔ لیکن پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے ساتھ محبت و عقیدت میں کبھی سر مو فرق نہ آیا اور جس حد تک میرا اندازہ ہے ان کی شفقت و نوازش بھی بدستور قائم رہی۔ دراصل یہ اختلافات کبھی نہ ہوا اور منزل مقصود ہمیشہ ایک رہی جب کبھی باطمینان ایک، بیٹھنے کا موقعہ ملا شاہ صاحبؒ کی گرمجوشیوں اور بہار آفرینیوں کے انہیں دل آویز کرشموں سے متمتع کیا جنہیں اتحاد و ہم آہنگی کے اوقات میں ایک خاص دولت سمجھتا تھا۔ شاہ صاحبؒ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہ ان کے چہرے پر منعکس رہتا ہے۔ گویا ان کا چہرہ ایک صاف و شفاف اور مجلا آئینہ ہے جس میں ہم ان کے باطن کی ہر کیفیت دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔

نادر شخصیت

ان کے سوانح حیات مرتب کرنے کی جرأت میں نہیں کر سکتا اس کے لئے بدرجہا بہتر نظر، مراتب دقیقہ رس، قوت موازنہ اور انتہائی شوشتہ اور دلآویز اسلوب تحریر درکار ہے، ان کے فضائل و محامد بھی ایک سرسری مقالہ کے ظرف تنگ میں نہیں سما سکتے۔ ان کے لئے وسیع دائرہ بیان و نگارش کی ضرورت ہے۔ البتہ ان کی سیرت کی چند دلکش جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں، صرف چند جھلکیاں، شائد اس طرح اندازہ کیا جا سکے کہ وہ کتنی گراں قدر عالی مرتبت اور نادر الاوصاف شخصیت کے حامل تھے اور اسلامیت و انسانیت کی شکل میں ہمارے وطن عزیز کی وہ کتنی بیش بہا دولت ہیں وہ میدان عمل کا معروف مجاہدات تھے تو لوگ ان کی زیارت کو باعث صد سعادت سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں لاکھوں کے مجمعوں کو اپنے دل آویز خطبات سے سراپا عمل و حرکت بنا دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ حریت و اسلامیت کے جانبازانہ جہاد میں گزار دیا، عمر کا خاصا بڑا حصہ قید و بند میں گزارا، جو

صلاحیتیں قدرت نے انہیں عطا کی تھیں وہ سب بے دریغ اسی راہ میں صرف کر دیں۔ اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہ کیا، عمر بھر فقر ان کے لئے سرمایۂ فخر رہا۔ فقر ہی ان کی سب سے زیادہ قیمتی خاندانی میراث تھی اور آج بھی ان کے فقر کا طرۂ آسمان بوس ہے۔ کیا وہ عرفی کے اس شعر کی زندہ مثال نہیں۔ ؎

با خونِ صد شہید مقابل نہادہ اند
عمرے کہ در آتش افسانہ سوختیم

تاہم ہمارے دور میں کتنے صاحبِ حال نگاہیں اور کتنے صاحب حال دل ہیں جو شاہ صاحب رح کے اس مقام کا موازنہ کر سکیں، خود ان کی بے نیازی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ کامل استحقاق کے باوجود ایسی کوئی چیز ان کی زبان پر تو کیا آتی یقین ہے کہ ان کے دل میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی

جہاد اسلامیت و آزادی

ہمارے گرد و پیش نفسا نفسی کے جو ہنگامے اور معاوضۂ خدمات کے جو محشر برپا رہے ان سے کون ناواقف ہے جو لوگ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہوئے تھے انہوں نے بھی اپنے کارناموں کے دفتر تیار کر کے معاوضے میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو ان کی دسترس میں آسکتا تھا حالانکہ ان کے استحقاق کا معاملہ اصولاً محلِ نظر تھا۔ شاہ صاحب رح کی تمام عمر اس قاہر حکومت سے لڑنے میں بسر ہوئی جس نے ہماری ہر مادی اور معنوی سروت غضب کر کے اپنی رگوں کے لئے زندگی کا خون مہیا کرتا تھا، پھر ان کا پورا جہاد صرف آزادی کے لئے نہ تھا، بلکہ اسلامیت آزادی کے لئے تھا۔ وہ اپنے وطن کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے تھے اور جہاں مسلمانوں کو بھی آزاد تر، خوددار تر اور مخلص تر مسلمان دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اپنی عمر انہیں مقاصد کے لئے ایسی مصیبتوں اور دلگیریوں میں گذاری جن کا معمولی سا تصور بھی بڑے بڑے مدعیانِ ہمت و جرأت کو رعشہ بہ اندام کر دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر کیا کسی خدمت کے لئے کوئی صلہ طلب کیا؟ طلب کرتا رہا ایک طرف کبھی کسی خدمت کا ذکر بھولے بھی نہیں کیا، خوب سوچو، خوب غور کرو، پھر بتاؤ کہ ہمارے وطن عزیز میں ایسی بلند پایہ شخصیتیں کتنی ہیں

اسلامی معیارِ عظمت

شاہ صاحبؒ بہر حال انسان تھے، فرشتہ نہ تھے، ان کے ساتھ بھی زندگی کی وہ تمام ضرورتیں وابستہ تھیں جن سے ہر انسان محصور رہتا ہے۔ لیکن صلے کی طلب میں کیوں وہ ہزاروں لاکھوں سے الگ ہو گئے۔ اس لئے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اسلامی زندگی کا ایک اہم فرض تھا اور اہل حق کے نزدیک فرض اسی لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چوں و چرا ادا کیا جائے۔ اگرچہ اس راہ میں کتنی ہی تکلیفوں، مشقتوں، مصیبتوں اور قربانیوں سے سابقہ پڑے۔ یہاں تک کہ جان بھی دے دینے کی نوبت بھی آجائے تو ایک لمحے کے لئے ادائے فرض سے روگردانی گوارا نہ کی جائے قرآن مجید میں انبیائے کرام علیہم السلام کا اسوہ حسنہ ہمیں کیا بتاتا ہے یہ کہ قوم کو دعوتِ ہدایت دینے کے لئے اٹھے تو فرمایا "ہم تم سے کچھ اجر نہیں مانگتے ہمارا اجر تو اللہ کے پاس ہے جس نے ہمیں پیدا کیا"۔ جن بزرگ ہستیوں نے اس اسوہ حسنہ کی پیروی کو اپنا شعار بنایا وہ بھی ہم قوموں یا ہم رفیقوں سے کبھی کسی اجر کے روادار نہ ہوئے۔ انہوں نے جو کچھ کیا فرض سمجھ کر کیا۔ ان کا مقصد ایک تھا اور وہ یہ کہ خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ اس رضا اور خوشنودی کے طلب گار اپنے کارناموں کی پاکیزہ دولت کو دنیوی صلحوں کی تمنا سے آلودہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے، کاش ہم لوگ سمجھ سکیں اور اندازہ کر سکیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا تعلق اسی حقانی گروہ سے ہے یہی انسانی عظمت و برتری کی حقیقی اساس ہے۔ افسوس کہ اس مقدس گروہ کے افراد آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ لینے والے یہاں پیدا نہ ہوئے، شاہ صاحبؒ اس وجہ سے بھی حد درجہ عزیز ہیں کہ اس گروہ سے متعلق ہیں اور اس وجہ سے بھی قابل صد احترام ہیں کہ جماعتی اور قومی ... کے سلسلہ میں صحیح اسلامی معیار کے آخری نمائندوں میں سے ہیں۔

دولتِ فقر اور سعادتِ اطمینان

یہی لوگ ہیں جن کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ جس طرف قدم بڑھے گراں قدر علمی جواہرات کے انبار فراہم ہو گئے، خود ان پر نظر پڑی تو فقر و درویشی پر اس طرح

مطمئن ملے کہ با اقتدار بادشاہ اپنے تختِ سلطنت پر بھی اس قدر مسرور و مطمئن نہ ہوں گے
سچ ہے ؎

گر دولتے ایں بود کہ بہ درویش دادہ اند
باید گرستن جم و کے را بہ تختِ خویش

جو قلبِ مطمئن اللہ تعالےٰ نے شاہ صاحبؒ کو عطا کیا تھا وہ ہر جگہ نظر نہیں آ سکتا،
اطمینانِ قلب، دولت، اقتدار، فرمانروائی یا وسعتِ املاک و اموال پر منحصر نہیں، صرف اللہ
کے ذکر اور اس کے فضل و عطا پر موقوف ہے۔

اِلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

پھر سید عطاء اللہ شاہ نے اس دور میں خدمتِ اسلامیت و آزادی کا بارگراں دوشِ ہمت
پر اٹھایا تھا۔ جب اخلاص و ایثار اتنے کم یاب نہ تھے۔ جتنے آج نظر آ رہے تھے، یعنی ترکِ موالات
یا لاتعاون کے دور میں، اس تحریک میں جن جانبازوں نے حصہ لیا تھا، ان میں خاصی بڑی
اکثریت مخلص اور ایثار پرور کارکنوں کی تھی، اخلاص و ایثار کی ایسی مثالیں بہت کم تحریکیں
پیش کر سکتی ہیں۔ شاہ صاحب کو اس جماعت میں ایک ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اس سے ان کی
عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں صاحبِ دل بنایا تھا اور دل ایسی نعمت
ہے کہ ہزاروں جانیں بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتیں، عرفی نے بالکل درست کہا تھا۔

ہزار جان گرامی بہ نیم جو نہ خرند
بہ عالمے کہ دردِ دل بہ کار می آید

”آخر جان کی قدر و قیمت بھی تو دل کے ساتھ ہے، دل نہ ہو تو جان سے کونسا قابلِ ذکر
کام انجام پا سکتا ہے۔ دنیا میں جتنے واجب احترام کارنامے ظہور پذیر ہوئے۔ وہ دل ہی
کی کار فرمائی کا کرشمہ تھے۔ آج کتنے افراد ہیں جو اس جنسِ گراں مایہ کے قدر شناس ہوں

فی ذالک فلیتنا فس المتنافسون

میں نے یہ چند اس عالم میں لکھیں کہ اپنے خیالات و افکار کو اطمینان سے ترتیب دے
لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ گویا ادھر ادھر سے چند پنکھڑیاں چن کر دامنِ عقیدت میں رکھ لیں کہ

سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی بارگاہ عظمت میں جاؤں تو خالی ہاتھ نہ جاؤں، ان کے متعلق سیر حاصل چیزیں لکھنے کے لئے زیادہ اطمینان و دل جمعی درکار ہے۔ یہ تو ایک دھندلا سا آئینہ ہے۔ یہ اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ ہم سب اسے سامنے رکھ کر دیکھیں کہ خود ہمارے اور علمائے خدمت کے خدوخال کیسے ہیں ہماری بینائی کتنی ہی غرض آلود اور ہماری صلاحیتِ موازنہ ماؤف ہو، مگر اس آئینہ میں اپنے عمل و کردار کی حقیقی حیثیت ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

تماشائے جمالِ حور و غلمانم کجا باشد
مرا آئینہ باید کہ بینم تا چہ حد زشتم

آج اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ کے آئینہ مجاہدات سے بہتر کونسا آئینہ ہو سکتا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر دور ہمارے سامنے گذرا۔ انہوں نے اسی فضا اور اسی ماحول میں اخلاص ایثار بلند ہمتی اور سچی اسلامیت کا وہ نقشہ پیش کیا جو دلوں میں مطلوب عمل کے ولولے پیدا کر سکتا ہے

قاری محمد طیب مدظلہٗ

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اُن مشاہیر ملک میں سے تھے جن پر ملک والے ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے اور ان کے نام سے اپنے ناموں کو اچھال سکیں گے. وہ حقیقتاً "اسم بامسمیٰ" تھے، بلاشبہ وہ اللہ کی ایک عطا تھے جو ہند وپاک کے مسلمانوں پر مبذول کی گئی. جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات قدسی صفات کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:-

"انا رحمۃ مھداۃ"

(میں ایک رحمت ہوں جو خدا کی طرف سے بندوں کو ہدیہ دی گئی ہے)

اس طرح آل رسولؐ میں عطاء اللہ شاہ کی ذات تھی جو اللہ کی طرف سے بندوں کو عطا کی گئی تھی تاکہ صدیوں تک اس نام سے ان کا نام اونچا رہے.

پھر عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے مبذول ہو کر ان میں بہت سی وہ خصوصیات پیدا کیں جن سے خود ان کا نام اونچا ہوا. ان کا مشہور زمانہ وصف جس میں وہ بے مثال تھے خطابت تھا. ان کی خطابت جاذبیت کا ایک جادو تھی جس میں بے پناہ کشش تھی، ہزاروں انسانوں کا مجمع جو تا حدِ نظر پھیلا ہوا ہوتا تھا ان کی تقریر کی مسلسل زنجیر میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا تھا جس میں سے کسی کا اکتا کر اٹھ جانا تو کیا معنی کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا. ان کی تقریر اسے جکڑ کر باندھ لیتی تھی اور کیا مجال تھی کہ کوئی شخص اپنی توجہ کو بھی ان سے ہٹا سکے.

یہ کشش محض الفاظ کی نہ تھی اور محض الفاظ میں یہ جاذبیت ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ الفاظ میں گہری معنویت نہ ہو اور محض معنویت بھی زنجیرِ کشش نہیں بن سکتی جب تک کہ اس معنویت میں معرفت نہ ہو، اور محض معرفت بھی کشش کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس میں محبت نہ ہو، اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ بے مثال خطیب ہونے کے ساتھ صاحب معنویت، صاحب معرفت اور صاحبِ عشق و محبت تھے۔ بالفاظ دیگر وہ محض صاحب لسان نہ تھے بلکہ صاحب دل انسان تھے محبت نبویؐ ان کے دل کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی سے ان کے جوش کا تعلق تھا اور اسی سے ہوش کا۔ اور اسی سے ان کی خطابت کا چشمہ ابلتا تھا، جس میں دوسروں کے دلوں کی رگ و پے میں سما جانے کی خاصیّت ہوتی تھی۔

آدمی صاحب دل خود سے نہیں بنتا کسی صاحب دل سے بنتا ہے۔ ارباب لسان کے بس کی بات نہیں کہ باتوں سے کسی کو صاحب دل بنا دیں، دل سے دل بنتا ہے دل جب کسی دل والے سے ملتا ہے جب ہی صاحب دلی آتی ہے۔ عطاءاللہ بھی ایک صاحب دل سے وابستہ ہو کر ہی صاحب دل بنے۔ اگر رائے پوری کی خانقاہ میں ان کا گزر نہ ہوتا تو ان کا لفظی کمال معنویت کی روح اختیار نہ کرتا —— اور اگر وہ رائے پوری کے مقدس درویش حضرت اقدس مولانا عبدالقادر شاہ صاحب ادام اللہ ظلالہم کے قدموں تک نہ پہنچتے تو ان کے قدم دوسروں کے سروں پر نہ ہوتے انہیں حضرت رائے پوری مدظلہ تعالیٰ کا دستِ مبارک ملا تو دست بدست وہاں پہنچ گئے جہاں اس دستگیری کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا۔ یہ خدا کی دین ہے کہ پہنچے تھے مرید بن کر اور لوٹے مراد بن کر۔

ہر مرید اپنے شیخ کا اور ہر شاگرد اپنے استاد کا محب ہوتا ہے، لیکن عطاءاللہ کو مقام محبوبیت یہ ملا کہ خود شیخ ہی ان کے گرویدہ ہو گئے، سید عطاءاللہ کی وفات کی خبر پہنچی تو شیخ بے اختیار رو پڑے اور رونے میں آوازیں تک نکل پڑیں —— جس کا شیخ اپنے مرید پر پھوٹ پھوٹ کر روئے اس کی محبوبیت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی شیفتگی، مرید کی اعلیٰ تربیت کا نشان ہوتی ہے، اور قابلیت بھی قلب کی نہ کہ محض لفظوں کی —— اس لئے ماننا پڑے گا کہ سیّد عطاءاللہ بے مثال صاحب لسان خطیب ہی نہ تھے بلکہ ایک بے نظیر صاحبِ دل عارف بھی

تھے۔

شاہ صاحبؒ کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی پاکیزہ سیرت کی ترجمان تھی ــــ ان کا شگفتہ چہرہ ان کے کھلے ہوئے اور کھلے دل کا آئینہ تھا۔ ان کی رسیلی آواز، چمکدار آنکھوں سے ان کی طباعی اور ذہانت کا پردہ فاش ہوتا تھا اور ان کے بشرہ کی صفائی ان کے اخلاق کی صفائی اور طبیعت کی ستھرائی کا نشان تھی، جس کا ظہور ان کے مجلسی کلام اور اجتماعی بیان بلکہ ان کی ایک ایک ادا ہیئت کذائی سے ہوتا تھا۔

مرحوم کے چھوٹے چھوٹے فقرے طباعی اور ذہانت کے ساتھ بہت سی حقیقتیں اور دل کی صداقتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہوتے تھے جن سے فہیم انسان دُور تک پہنچ جاتا تھا۔ پاکستان میں کسی مقدمہ کے سلسلہ میں ان کا بیان عدالت میں ہوا اور فاضل جج نے کسی سلسلہ میں پوچھا کہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ (ازواج مطہرات نبیؐ) میں باہم کیا فرق تھا ــــ؟ تو برجستہ فرمایا کہ خدیجہ کا نکاح محمدؐ ابن عبداللہ سے ہوا تھا اور عائشہ کا نکاح محمد الرسول اللہ صلعم سے ہوا تھا ــــ فرق مراتب کی یہ کس قدر بلند تعبیر ہے؟ جو عطا اللہ ہی کا حصہ ہے۔ ایک سوال کیا گیا کہ علیؓ اور عمرؓ میں کیا فرق ہے؟ تو برجستہ بولے کہ علیؓ مرید تھے اور عمرؓ مراد تھے (یعنی علیؓ کو اسلام کی طلب تھی اور اسلام کو عمرؓ کی طلب تھی) یہ لطیف اشارہ تھا دعائے نبوئی کی طرف کہ اے اللہ "عمرین" میں سے کسی ایک کو اسلام میں داخل کر دے اس دعا کی قبولیت حضرت عمرؓ کے حق میں ظاہر ہوئی، ایک موقع پر کہا کہ گو میں علیؓ کی اولاد ہوں لیکن عمرؓ کے بارہ میں عقیدہ یہ رکھتا ہوں کہ اگر عمرؓ کو درمیان سے نکال دیا جائے تو اسلام میں کچھ باقی نہیں رہتا (یعنی حضرت عمرؓ کے نہ ہونے سے بعلم اسباب اسلام کی کتنی ہی بنیادی خصوصیات چھپی رہ جاتیں) بہرحال یہ جادو کے فقرے یہ فسوں کے جملے ایک ایسی طبیعت کی نشان دہی کرتے ہیں جس میں ذکاوت و ذہانت کے ساتھ اسلامی ذوق اور اس ذوق کا اسلامی تاریخ پر پھیلاؤ رچا ہوا تھا اور وہ اسلامی حقائق کی واقفیت کے ساتھ ان کی تاریخی خصوصیات کے تجزیہ پر قادر تھے۔

ان کی بے نظیر خطابت جہاں اسلامی مقاصد کی ترجمان تھی، وہیں اسلامی مدافعت کے لئے مضبوط ترین سپر بھی تھی، جماعت احرار کے سلسلہ میں انہوں نے قادیانیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے

کی جو مساعی انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہی تھیں۔ جماعت احرار کی قیادت کے زمانہ میں عطاء اللہ کے ہاتھ میں چمکدار تیر۔ منہ میں دو دھاری زبان اور باطن میں جرارِ قلب تھا، جس نے جماعت احرار کی قیادت کرتے ہوئے پنجاب سے قادیانیت کا جنازہ نکال دیا جو پھر نہ اُبھر سکی، قادیانیت کا ابطال درحقیقت ختم نبوت کا اثبات تھا اور ختم نبوت عطاء اللہؒ کا ایمان اور ایمان کا بھی تخم تھا جس سے ایمان کو نشوونما ملتا ہے، اس لئے انہیں قادیانیت کو نیچا دکھانے اور اسے زیروزبر کر دینے کا ایک خاص شغف تھا، باطل ازم اور بھی ہیں لیکن قادیانیت ہمیشہ ان کی تلوار کی نوک پر رہتی تھی، کیونکہ اس کی زد اسلام کی اصلی جڑ بنیاد (ختم نبوت) پر تھی۔

سیاسی لائن میں انگریزی قوت کو توڑنے اور ملک کو آزاد کرانے میں ان کی خدمات نہ صرف یہ کہ کسی لیڈر سے کم نہ تھیں بلکہ عام سیاسی ایجی ٹیشنوں اور مقاومت مجہول کے اقدامات میں روح کا درجہ رکھتی ہیں۔ عطاء اللہؒ نے اپنی جوشیلی اور ہوشیلی تقریروں سے لاکھوں کے مجمعوں کو ہلا ہلا دیا اور برطانوی اقتدار کے ایوانوں میں زلزلے ڈال ڈال دیئے، عوام کے ٹھنڈے قلوب ان کی تقریروں سے آتشیں بن کر لوٹتے تھے ——— ان کی امروہہ والی تقریر جو جمعیۃ العلماءؒ کے پلیٹ فارم پر ہوئی آج تک ضرب المثل کے طور پر یاد کی جاتی ہے جس نے جنگِ آزادی کا ایک نیا موڑ پیدا کیا پھر اردو پارک دہلی کی آتش فشاں تقریریں آج تک اس میدان میں گونج رہی ہیں جہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی مرحوم آرام فرما ہیں، اس وقت یہ لوگ بخاری کی تقریروں سے جذباتی روح پیدا کرتے تھے اور آج ان کی تقریروں کی گونج سے جو انہیں کے قیام گاہ پر ہمہ وقت موجزن ہیں عرفانی روح لے رہے ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کراچی جیل میں محبوس تھے اور کراچی ہی میں جمعیۃ العلماءؒ کا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا۔ اس وقت جمعیت کی مجلس مضامین میں حضرت شاہ صاحب کا چلبلا پن تیزیٔ طبع کنوینگ کے لئے ادھر اُدھر اور اُدھر سے اِدھر قلبی جذبات کے ساتھ دوڑ دھوپ کا نقشہ گویا آج تک آنکھوں میں ہے اس وقت وہ خلاف معمول "کھدر" کا پتلون پہنے ہوئے تھے جو اس وقت کی لیڈرانہ فضا میں تو کھپ رہا تھا مگر شاہ صاحبؒ پر اوپرا معلوم ہوتا تھا ——— اور غالباً بعد میں انہیں بھی اس کا اوپرا پن محسوس ہوا تو پھر کبھی ان پر دیکھنے میں نہیں آیا۔ شاید یہ بار اس پتلون کے لئے پہلی بار ہی تھی اور آخری بار

بھی، پھر ہمیشہ انہیں لنگی یا شلوار ہی میں دیکھا گیا اور یہی انہیں زیب بھی دیتی تھی۔

انقلاب سے پہلے جالندھر میں مدرسہ خیرالمدارس کے ایک جلسہ میں میں نے ایک تقریر کرتے ہوئے قطبی کی کوئی مثال پیش کی تھی تو مجھے یاد ہے کہ شاہ صاحبؒ نے قطبی سے قطبیت کے مقام کا ذکر چھیڑ کر اقطاب امت کا تذکرہ شروع کیا اور دریا کی طرح تقریر رواں ہو گئی۔ ان کی تقریروں میں بارہا ایسا ہوا کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد خطابت کے اسٹیج پر کھڑے ہوئے خود بھی تقریر میں محو ہو گئے اور سامعین کو بھی از خود رفتہ کر دیا۔ یعنی عطاء اللہؒ تو اپنے اندر گم ہو گئے اور سامعین ان کی تقریر ہی میں گم ہو گئے تا آنکہ اس گم گشتگی کو صبح کی اذانوں نے چونکا دیا کہ رات ختم ہو چکی ہے اور صبح صادق نمودار ہو گئی ہے، نہ سامعین کو رات کی خبر ہوئی کہ کہاں گئی نہ منتظمین جلسہ کو پتہ چلا کہ وقت کہاں سے کہاں پہنچا اور خطیب کے ہوش میں رہنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

حسن و صورت کے ساتھ عطاء اللہؒ کو خدا نے حسن صوت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی۔ وہ جب قرآن حکیم کی آیتیں تلاوت کرتے تو ان کے نغمۂ قرآنی سے قلوب کھنچ کر گویا باہر آ جاتے تھے۔ آواز گونج دار ہونے کے ساتھ بلند بھی تھی۔ اس لئے لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کی صورت میں بھی ہجوم و اجتماع کی آخری صفیں صف اول ہی کی طرح لذت سماع سے بہرہ یاب ہوتی تھیں، اثنائے تقریر میں موقع بموقع اشعار کا ترنم باغ و بہار ہوتا تھا۔

موزوں صورت اور موزوں صوت کے ساتھ طبیعت کے غیر موزوں ہونے کے کوئی معنی نہ تھے۔ طبیعت بھی اتنی ہی حسین تھی جتنی صورت و سیرت اور صوت۔ ممدوح موزونیت طبع سے کبھی کبھی شاعری بھی کرتے تھے۔ بالخصوص فارسی کا کلام دلکش ہوتا تھا جس کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے، سید عطاء اللہ ان بے علم خطباء میں سے نہ تھے جن کی خطابت میں علم نہ ہو، یا محض لفاظی ——— ان کی خطابت کا مادہ ہو بلکہ باضابطہ درس نظامی پر مشکوٰۃ شریف تک عبور کئے ہوئے تھے۔ تعلیم و تعلّم کے کوچے سے نا آشنا نہ تھے۔ قدرت کو ان سے خطابت کا اور خطابت کے راستہ سے اسلام کا کام لینا تھا۔ اگر وہ ادھر لگ گئے تو اس میں لگ جانے کی بھی ان میں صلاحیتیں تھیں۔ اگر دین کی خدمت تعلیم و تعلم ہی میں منحصر نہیں، جس راہ سے ان سے کام لیا جانے والا تھا وہ خطابت کی راہ تھی تو اس کا ان میں میلان پیدا کر دیا گیا ہے

ہر کسے را بہر کارے ساختند

میل اورا در دلش انداختند

تاہم علمی قوتیں بھی ان میں موجود تھیں اور بحوجہت رہتی تھیں اس لئے وہ علم کے کوچے سے نابلد نہ تھے۔ قرآن کریم کے مضامین پر بہت خاصا عبور تھا اور اس کے حقائق کو واشگاف کرنے کا خاص سلیقہ اور ملکہ تھا جس نے من بھر علم کو ہزاروں من کر کے دکھلا دیا تھا۔

بہرحال سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ عالم، عارف، خطیب، شاعر، زعیم، قائد اور درویش صفت انسان تھے جن میں قدرت نے بہت سی خوبیاں ودیعت کی تھیں۔ وہ دنیا سے کیا گئے کہ بہت سی خوبیاں رخصت ہو گئیں۔ ان کے آخری دور میں حکومت پاکستان نے ان کی غیر معمولی خدمت و داشت کر کے اپنی علم دوستی اور علماء نوازی کا ثبوت دیا جس کے لئے وہ پاک و ہند کے اہل علم کے شکریہ اور ممنونیت کے مستحق ہیں۔۔۔۔ حق تعالیٰ حضرت مرحوم کو ان کے جد اعلیٰ کے قدموں تک پہنچائے۔ اعلیٰ علیین میں ملاقات بلند ہو۔

پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے اور قوم کو ان کا بدل عطا فرمائے

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

شورش کاشمیری

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی

شخصیت کا

تاریخی تجزیہ

سوال تقابل کا نہیں اور نہ مماثلت زیرِ بحث ہے. مقام اپنا اپنا، کمال اپنا اپنا. لیکن واقعہ یہی ہے کہ پنجاب نے تین شخصیتیں ایسی پیدا کی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی پر نہ صرف دور دول کے ساتھ غور کیا بلکہ اس کے لئے حرکت و عمل کے عنصر پیدا کئے.

۱- علامہ اقبالؒ

۲- ظفر علی خاںؒ

۳- سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

علامہ اقبال کا فکر ہی ان کا عمل تھا۔ وہ اس انداز کے دینی یا سیاسی رہنما نہ تھے جو عملی جدوجہد میں حصہ لیتے اور اپنے نقشِ پا چھوڑ جاتے جیسا کہ مولانا ظفر علی خاں یا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے۔ یہ دونوں غیر ملکی غلامی کے خلاف لڑتے رہے. قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، اور ان عناصر کی سرکوبی کا خمیازہ بھگتا جو برطانوی حکومت کیلئے ملکی دوائر میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دے رہے تھے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں برطانوی استعمار کا خوف توڑنے اور پنجاب کے علاقوں میں پشتینی وفاداروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں جو کام ظفر علی خاںؒ اور عطاء اللہ شاہؒ نے کیا وہ بہمہ وجوہ ابھی سامنے

نہیں آسکا۔ لیکن جب کبھی اس علاقے کے جمود و انحطاط کی ابتدائی مشکلیں سامنے آئیں گی ایک سچا مورخ ان دونوں شخصیتوں کے ممتاز کارناموں کا ذکر جلی حروف میں کئے بغیر نہیں رہے گا۔ ان دونوں رہنماؤں نے ایک خاص عہد استبداد سے لے کر ان جان بلب عہدِ استعمار تک مغربی پاکستان کے علاقے میں جس حرکت اور بیداری کا جوش و جذبہ پیدا کیا وہ بجائے خود جماعت یا تحریک سے کم نہیں —— علامہ اقبال نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو ایک فکری مزاج دیا۔ ان کے افکار و نظریات کا چرچا تمام ملک میں پھیلا نتیجۃً مسلمانوں میں اپنی روایات سے انہماک کا شوق پیدا ہوا۔ یہی شوق بعد میں تحریک پاکستان کا محرک ہو گیا۔ بالفاظ دیگر —— علامہ اقبال ایک مفکر تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ماضی کو سہارا دیا اور موثر بامعنی مستقبل کا ایک راستہ دکھایا۔ ظفر علی خاں اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے عوام کو عملاً جھنجھوڑا۔ اس ذہن کی آبیاری کی جو غیر ملکی غلامی کے بندھن توڑ سکے اور اس لئے قربانی کر سکتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ قومی تحریکیں یا سیاسی انقلاب محض فرد واحد سے پیدا نہیں ہوتے اور یہ عوامل و عناصر متحد ہو کر کسی فرد کی شخصیت کو اپنے خصائص کا مظہر بنا دیتے ہیں۔ نتیجۃً ایک شخصیت پوری تحریک یا پورے انقلاب کی مظہر بن جاتی ہے۔ مثلاً قائد اعظم تحریک پاکستان کے مظہر تھے اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے مظہر مہاتما گاندھی۔

افراد نہیں ادارے

جن دنوں ظفر علی خانؒ اور سید عطاء اللہ شاہؒ نے نعرۂ رستاخیز بلند کیا ان دنوں کے احوال و کوائف پر نظر ہو تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے کس سنگین دور میں انقلاب و استحکام کی نیو رکھی۔ پنجاب استعماری مقاصد کی شہ رگ تھا۔ اس قسم کے عوامی ذہن کا مغربی پاکستان میں پیدا ہونا یا پیدا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ان دونوں رہنماؤں نے جس بے جگری سے یہ فرائض سرانجام دیئے وہ تمام تر ان کی جرأت رندانہ کا معجزہ تھا۔ ہم انہیں تاریخ یا تاریخ کے محرکات سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ کہنا مشکل ہو گا کہ جو کچھ انقلاب اور بیداری کی شکل میں سامنے آیا تمام تر انہیں کے عمل و ایثار با قیادت و سیادت کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا ہے

یہ ایک تاریخی عمل ہے۔ اس عمل کو جب ہم ان شخصیتوں کے قالب میں دیکھتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ:۔

اقبالؒ ——— کی فکر۔ ظفر علیخانؒ ——— کی صحافت اور سید
عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ——— کی خطابت

نے مسلمانوں میں ایک تحریک یا تنظیم سے زیادہ کام کیا اور ان کے نتائج بھی ایک تحریک یا تنظیم کے نتائج سے زیادہ ابھرے ہوئے، بکھرے ہوئے اور نکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے

کمالات کا مجسمہ

شاہ جیؒ کے کمالات کا احاطہ کرنا مشکل ہے وہ ایک چمنستان کی طرح تھے۔ ان میں ایک باغ کی تمام دولتیں موجود تھیں۔ رنگارنگ پھول تھے، سبزہ تھا، شاخیں تھیں، روشیں، درخت پھل پانی، ہریالی، چھاؤں، صبا، نسیم بہار۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار پت جھڑ اور اس کی اداسیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ سیاسی تعصبات کی بات دوسری ہے۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ انسان حزبی افکار سے ہر قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتا ہے، ممکن ہے کہ بعض غیر تاریخی طبقوں کو شاہ جیؒ کے کمالات فائقہ سے انکار ہو یا وہ حزبی افکار کے تحت مجبور ہوں، لیکن کوئی واقعہ محض اس لئے نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ اس کی تائید و حمایت کا پہلو کمزور ہے۔ یا اختلاف کی ایک ایسی فضا موجود ہے جو نہیں چاہتی کہ فلاں واقعہ وجود رکھتا ہو۔ اب چونکہ واقعہ موجود ہے۔ لہذا الٹا سے دل مطمئن کر لیا جائے کہ نفی ہو گئی ہے ———

مثلاً یہ واقعہ کہ شاہ جیؒ سے بڑا خطیب اردو زبان نے پیدا نہیں کیا، ہو سکتا ہے کہ بعض خطباء کو بعض اعتبارات سے فوقیت حاصل ہو۔ اس کی نظیریں موجود ہیں۔ لیکن خطابت میں جو کمال شاہ جیؒ کو حاصل رہا وہ نصف صدی میں اردو زبان کے کسی خطیب کو حاصل نہیں ہوا۔ شاہ جیؒ کی عمر کا آخری حصہ دینی خطابت میں بسر ہوا۔ بلکہ ان کی زندگی کا تقریباً دو تہائی حصہ توحید و رسالت کی خدمت گزاری میں کٹا۔ ان کے انداز تبلیغ اور عام خطباء کے انداز تبلیغ میں عظیم فرق تھا۔ انہوں نے مذہب کو کبھی مسلمانوں میں تفریق تو کیا؟ انسانوں میں تفریق کے لئے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے

مذہب کے روائتی جھگڑوں اور خطابتی آویزشوں کو چھیڑا تک نہیں۔ ہمیشہ مسلمانوں کے احوال کی اصلاح اور عقائد کی درستی کو ملحوظ رکھا۔

عظیم خدمت

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے قادیانی جماعت کا تعاقب کیا۔ لیکن اس کے وجوہ فروعی نہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ ختم نبوت کے عقیدے سے مسلمانوں کی وحدت برقرار رہتی ہے اور جب کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، خواہ وہ ظلی ہو یا بروزی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک نئی شریعت۔ فکر یا تنظیم پیدا کر کے مسلمانوں کی عالمی وحدت کو نقصان پہنچاتا ہے، دوسری چیز ان کے سامنے یہ تھی کہ وہ قادیانی جماعت کو برطانوی امپیریلزم کا دست و بازو سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی بے نظیر خطابت سے قادیانی جماعت کو متروکات کی صف میں لا کھڑا کیا۔

علامہ اقبالؒ نے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا تھا۔ اس میں اس اجمال کی تفصیل موجود ہے، صورتحال ایسی ہے کہ ہم نے ابھی تک برطانوی غلامی کے اسباب و علل اور آثار و نتائج کا جائزہ نہیں لیا۔ ہمارے ہاں ابھی اسلامی بنیادوں پر فکری دماغوں کا قحط ہے، جب کبھی یہ جائزہ مرتب ہوا۔ اور ہم نے ان کرداروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں، جو مسلمانوں کی سیاسی غلامی میں شریک رہے ہیں، یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ قادیانی جماعت برطانوی مستعمرین کی ایک دلچسپ کھیپ ثابت ہوگی۔ تب یہ امر خود بخود ابھر کر سامنے آجائے گا۔ کہ قادیانی جماعت کے خدوخال کیا تھے اور شاہ جی کی خدمات اس بارے میں کتنی عظیم تھیں

سیاسی پسماندگی

سرحد مدت العمر سرزمین بے آئین رہا بڑی جدوجہد کے بعد اسے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا گیا، سندھ کے حالات سیاسی اعتبار سے کبھی خوش آئند نہیں رہے، کسی سیاسی تحریک یا سیاسی شعور کا سندھ کے عوام میں پیدا ہونا خواب وخیال رہا، اس اعتبار سے بلوچستان بھی سناٹوں کی سرزمین ہے۔ پنجاب کے مشرقی اضلاع میں ضرور سیاسی شعور اور سیاسی تحریک پیدا ہوئی مغربی

اضلاع میں شہری زندگی نے سیاسی تحریکوں کو محسوس کیا اور بعض اضلاع کے عوام نے کس قدر حصّہ بھی لیا لیکن ایک صحیح سیاست تربیت سے یہ اضلاع اکثر محروم ہی رہے، تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ وہ مسلمان قوم کا ہندوئیت اور استعماریت کے خلاف ایک ردعمل تھا جو استعمار و استبداد کے رخصتی عہد میں پیدا ہوا لیکن قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے قومی آزادی پر قبضہ کر لیا وہ زیادہ تر اس جماعت کے افراد تھے جو ان علاقوں میں سیاسی شعور کی گمشدگی کے ذمہ دار تھے اور ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ بات بعض طبقوں کے لئے بارِ خاطر ہو تاہم واقعہ یہی ہے کہ پاکستان کے عوام قومی آزادی سے پورے طور پر متمتع نہیں ہو سکے۔ سیاسی مزاج آج بھی وہی ہے جو برطانوی عہد میں تھا۔ یعنی عوام الناس قومی مسائل میں دلچسپی لینے کی بہ نسبت حکمرانِ جماعت کی خوشنودی کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں۔

یہ عہد جس میں سے ہم گزر رہے ہیں معمولی عہد نہیں۔ ایک عظیم عہد ہے۔ یہ دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے بدلی ہے۔ اس عہد میں کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ انسان کو غلام رکھے یا اس کے ابتدائی حقوق غصب کر لے یا لوگوں کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ اپنے حکمران خود منتخب کریں قریب قریب ناممکن ہے۔ جن قوموں کو بالادستی حاصل ہے ان کی آزادی تقلید و احترام کے قابل ہے جو قومیں سیاسی طور پر آزاد ہیں، ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں، وہاں کوئی شخص بآسانی عوام کی فکری آزادی پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ جو ممالک ابھی شخصی حکمران کے قبضے میں ہیں یا جہاں غیر ملکی انتداب باقی ہے وہ بدیر یا سویر آزاد ہونے والے ہیں۔ ان ممالک کے عوام کروٹ لے چکے ہیں اور شرف و امتیاز کے نشانات بھی بدل چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ انقلابِ حال محض اتفاقی یا حادثاتی نہیں بلکہ یہ فکری انقلاب سے پیدا ہوا ہے۔ ان عوامل و عناصر کی بدولت جو قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جن کی انتہائی کا شرف دل و دماغ کے انسانوں کو قدرت کاملہ نے تفویض کیا ہے۔

حاصلِ کلام

پنجاب مدتہا عسکریوں کی گزرگاہ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی استعمار نے اپنے اغراض

مقاصد کے لئے پنجاب کو نامزد کیا۔ اب جو تالیفات مختلف انگریز مصنفوں کے قلم سے نکلی ہیں اور جن میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہاں سول سروس میں رہے۔ ان کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ پنجاب برصغیر میں برطانوی سلطنت کا ایک ایسا ستون تھا جس نے نہ صرف انگریزی استعمار کو قائم رکھا بلکہ اپنے تیئں بازوئے شمشیر زن ثابت کیا۔ ایک ایسے علاقے میں ظاہر ہے قومی تحریکوں کا اٹھنا یا سیاسی طوفانوں کا اٹھنا سہل ہے؟ انگریز نے یہاں مختلف مفاد پیدا کئے، ایسے لوگوں کو مختلف داؤ پر پروان چڑھایا جن کا فہم و ادراک ان کے لئے ممد ہو سکتا تھا، یہ ایک بڑی دردناک تاریخ ہے کہ پنجاب کو برطانوی استعمار نے سب سے زیادہ اپنے حق میں استعمال کیا، یہ صوبہ سیاستاً اس کی سرحد رہا۔ یہاں انگریزوں نے ایسے خاندان پیدا کئے یا ان خاندانوں کو پالا گیا جن کی معرفت یہ کوششیں بار آور ہوتی رہیں کہ اس صوبے میں نہ کبھی منظم سیاسی تحریک پیدا ہوئی، نہ کوئی ایسا لیڈر اٹھا جو تمام ملک کے لئے قابل قبول ہوتا۔ اور اگر مسلمانوں میں اس دل و دماغ کے ساتھ کوئی اٹھا تو وہ شکار ہو گیا یا زچ ہو کر رہ گیا۔ یہ بھی ایک المیہ ہے اور اس کہانی کے اجزا بھی بڑے دردناک ہیں۔ مگر ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں، اب آپ ہی کچھ کہہ لیجئے۔ حقائق یہ ہیں:

۱. پنجاب نے انفرادی طور پر بڑے دل و دماغ کے سیاسی عبقری اور پرزور انقلابی پیدا کئے مگر ان کی اجتماعی شخصیت کو نشوونما پانے سے روک دیا گیا، بلکہ رسوائی کے خنجر سے ذبح کیا

۲. تمام صوبے میں استبدادی زمینداروں کا جال بچھا دیا گیا جنہوں نے برطانوی استعمار کی بہ صمیم قلب حفاظت کی۔ عام مسلمانوں میں روحانی افلاس کو مستحکم رکھنے کے لئے تن آسان سجادے پیدا کئے۔

۳. عامۃ الناس کو بہ لطائف الحیل تعلیم سے محروم رکھا۔

۴. معیشی زندگی کو فرقہ وارانہ عصبیتوں کے تابع کر دیا۔

۵. مسلمانوں میں عقائد کی اساس پر تفرقے پیدا کئے گئے اور ان مذاہب ا … کی حوصلہ افزائی کی گئی جو جہاد سرائی کے بجائے مسلمانوں میں مسکینی اور گوشہ نشینی پیدا کرتے تھے۔

بظاہر حقائق کی یہ ایک مختصر سی داستان ہے۔ لیکن اس کے جو نتائج پیدا ہوئے وہ اتنے تیسیح تھے کہ ان پر قابو پانا مشکل تھا۔ ظفر علی خاں کی صحافت نے درمیانے درجے کے شہری جماعت کو جگا دیا اور وہ پلکوں سے نیندوں کا بوجھ اتار تے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ مگر شاہ جیؒ نے واقعتاً ایک صور پھونکا۔ ان کی عدیم المثال خطابت نے ان تمام ستونوں کو ہلا دیا۔ جن پر پنجاب میں برطانوی حکومت کا قصر رفیع استوار تھا۔ شاہ جی نے پنجاب کو دو طرح سر کیا۔

۱۔ شہروں اور قصبوں پر سیاسی یلغار کی، جتنے دماغوں میں بھی سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کر سکتے تھے کر گئے۔

۲۔ دیہات میں انہوں نے دعوت وارشاد کے ہتھیاروں سے حملہ کیا اور اس کمین گاہ سے انگریزی دبدبہ کو بے توقیر کیا۔

ا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ شاہ جیؒ نے پنجاب جیسے عسکری صوبہ میں نہ صرف خلاف سامراج ذہن کو پرورش کیا بلکہ نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت فراہم کر دی جس نے برطانوی حکومت کو آخری دن تک پریشان رکھا۔

ب۔ غریبوں میں زرداروں کے استحصال کا رد عمل قوی کیا۔

ج۔ ایک ایسی سرفروش جماعت پیدا کی جس نے صوبے کے ذہنی انقلاب کو ابھارنے میں کما حقہٗ حصہ لیا

د۔ عام لوگوں کے دلوں سے مختلف الاصل مفادات کا خوف خارج کیا۔

س۔ رسوم و عقائد کی خرابیوں کے بعض ایسے قلعے مسمار کئے جو اسلام کی حقیقی روح کو گھن کی طرح کھا رہے تھے اور یہ وہ کارنامے ہیں کہ مغربی پاکستان کی سرزمین حالات کی آئندہ تبدیلیوں کے ساتھ نہ صرف ان کی اہمیت کو محسوس کرے گی بلکہ تاریخ شکر گزار ہوگی کہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسے خطیب نے اس کے ایک خاص عہد کی پرورش کی ہے۔

مولانا منظور احمد نعمانی

امیرِ شریعتؒ

امیرِ شریعت آج ہماری اس دنیا میں نہیں ہیں اور ان کو ہمارے کسی خراجِ عقیدت اور تحسینی تذکرے کا انتظار بھی نہیں ہے۔ جو چیز اس دوسرے عالم میں ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لائق ہے اور جس کا پہنچنا بھی انشاءاللہ یقینی ہے وہ اچھی ساعتوں میں ان کے لئے رحمت و مغفرت کی پرخلوص دعائیں اور اعمالِ خیر کے ثواب کا ہدیہ ہے اور یہی ان کی محبت کا ان کے محبین پر خاص حق ہے اللہ تعالےٰ اس حق کے ادا کرنے کی توفیق دے۔

اسی کے ساتھ یقین ہے۔ کہ ان کی بعض ایمانی خصوصیات اور ان کی زندگی کے بعض واقعات کا تذکرہ انشاءاللہ زندوں کے لئے ضرور نافع ہوگا، اسی امید پر یہ سطریں ایک عزیز سے بطور املا لکھا رہا ہوں۔

عظمتِ رسالتؐ کا نگہبان

جہاں تک اب یاد آتا ہے، اخبارات میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا نام سب سے پہلے اس ناچیز نے اس وقت پڑھا، جب لاہور کے ایک دریدہ دہن آریہ سماجی نے اللہ کے آخری رسولؐ کے خلاف ایک نہایت گندی اور رسوائے عالم کتاب لکھ کر" لٹ کی، اس کتاب کا نام بھی اتنا خبیث اور دل آزار تھا کہ کوئی شریف آدمی خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، دلی تکلیف کے بغیر وہ نام نہیں لے سکتا۔ ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا سنگھٹن اور شدھی کی تحریک نے پہلے

ہی سے خراب کر دی تھی اس کتاب کی اشاعت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلمانوں میں سخت ہیجان بلکہ طوفان برپا کر دیا۔

اس سلسلے میں امیر شریعتؒ نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ پردہ نشین خواتین نے اپنے بچّے ان کے قدموں میں ڈال دیئے تھے کہ ان کو رسول اللہؐ کے ناموس پر قربان کر دو۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس تقریر پہ گرفتار کر لیے گئے ان پہ مقدمہ چلا اور بالآخر ایک سال کی سخت قید ہوئی بہرحال جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے میرے دل میں ان کی محبت کا بیج اسی واقعے کے بعد پیدا ہوا۔

قبولِ خواص

یہاں تک کہ ایک وقت انجمن خدام الدین لاہور کے جلسے میں (جس میں پنجاب بھر کے علمائے حق کی ایک بڑی تعداد شریک تھی) سیّد صاحبؒ امیر شریعت بنا دیئے گئے اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین اور سب سے بڑی دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند کے صدر و شیخ الحدیث استاذنا و استاذ العلماء حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے بھی بحیثیت امیر شریعت ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اخبار میں یہ خبر پڑھ کر قدرتاً سید صاحبؒ کی عظمت و اہمیّت میرے دل میں پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی اور دید و ملاقات کا اشتیاق بہت زیادہ بڑھ گیا۔ ان کے نام کے ساتھ بخاری اور شاہ کے دو پر عظمت ضمیمے لگے ہونے کی وجہ سے میرا تصوّر اس وقت ان کے بارے میں یہ تھا کہ ان کی شکل و صورت بخاری علماء کی سی اور وضع و ہیئت مشائخ طریقت کی سی ہوگی۔ لیکن اتفاق کی بات عرصہ تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ میں ۱۹۳۰ء میں امروہہ ضلع مراد آباد میں مدرس تھا۔ حسنِ اتفاق کہ اسی سال جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس امروہہ میں ہونا طے ہو گیا۔ اس زمانے میں مجھے جمعیۃ العلماء اور اس کے کاموں سے خاصی دلچسپی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ چند ہی مہینے پہلے آل انڈیا کانگریس اپنے لاہور کے اجلاس میں ۱۹۲۸ء والی اس نہرو رپورٹ کو منسوخ قرار

سے کرجس کی بنا پر ۱۹۲۹ء میں جمعیۃ العلمائے ہند بھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئی تھی، آزادئ کامل کی تجویز پیش کی تھی اور پھر اس کے بعد گاندھی جی نے نمک سازی کی شکل میں انگریزی اقتدار کے خلاف رسمی نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کر دی تھی، بہرحال اس ماحول میں یہ اجلاس امروہہ میں ہونے والا تھا.

ایک اہم واقعہ

ادھر ایک بات اسی درمیان میں یہ ہو چکی تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم اور جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت جمعیت علما بنالی گئی تھی جس کے صدر خود مولانا محمد علی مرحوم تھے. یہ کش مکش ناسنجیدگی میں کس حد تک جا چکی تھی اس کا اندازہ بس اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند دہلی کا اجلاس امروہہ میں جن تاریخوں میں ہونا طے ہوا تھا انہی تاریخوں میں امروہہ ہی میں اس دوسری جماعت کا اجلاس بھی طے کیا گیا اور ہوا. اور خود مولانا محمد علی مرحوم نے اس کی صدارت کی. جمعیۃ کا اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی قریبی مقامات سے جمعیتی رضا کاروں کے جتھے انتظام کے لئے آنا شروع ہو گئے

میرے وطن سنبھل کا ایک جتھا ایک دن پہلے پہنچنے والا تھا، اس میں سے بعض آدمی علی الصبح پہنچ گئے اور انہوں نے بتایا کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہمارا جتھہ ایک جلوس کی شکل میں امروہہ میں داخل ہو، اس جلوس میں کچھ اونٹ ہوں اور ان پر نقارے ہوں، اس لئے ہمارے واسطے اونٹوں اور نقاروں کا انتظام کیا جائے (دراصل سنبھل کے رضا کار اس طرح کے حجازی جلوس نکالا کرتے تھے) ہم لوگ جو اس وقت امروہہ میں اجلاس کے کاموں کے ذمہ دار تھے ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا. تقریباً ۸-۹ بجے صبح کا وقت تھا مجلس استقبالیہ کے دفتر میں بیٹھے ہم اسی مسئلے پہ مشورہ کر رہے تھے کہ اونٹوں اور نقاروں والا یہ حجازی جلوس یہاں نکالنا مناسب ہے یا نہیں. میری اور اکثر کارکنوں کی رائے اس وقت کے حالات میں جلوس کے حق میں نہ تھی. ہم سب کے مخدوم اور ہر حیثیت سے بزرگ حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدر مدرس مدرسہ

اسلامیہ امروہہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے نہیں تھی۔ وہ اس کو ثقاہت اور سنجیدگی کے خلاف سمجھتے تھے یہ مشورہ جاری تھا کہ اچانک دو حضرات دفتر میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک تو مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے اور دوسرے صاحب کو ہم میں سے کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ جسم پر از سر تا پا کھدر کا لباس جسم پہلوانوں کا سا، میں سمجھا کہ یہ مفتی صاحب کے ساتھ کوئی رضاکار ہیں اتنے میں خود مفتی صاحب نے بتایا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں یہ سن کر خصوصاً میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ میرے تصور میں تو ان کی صورت اور وضع سجادہ کے کسی مقدس شیخِ خانقاہ کی سی تھی۔ مصافحہ اور ملاقات کے بعد بڑی بے تکلفی سے شاہ صاحبؒ نے ہم لوگوں سے فرمایا۔ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا کہ ہم لوگ ایک چھوٹے سے مسئلے پر غور کر رہے ہیں "سنبھل" سے رضاکاروں کا جتھہ آ رہا ہے وہ اس طرح کا جلوس نکالنا چاہتا ہے۔ ہم میں سے کچھ کی رائے یہ ہے کہ نکلنا چاہیئے اور بعض اسے ٹھیک نہیں سمجھتے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ اس وقت کے مفتی ہم ہیں، ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ ایسا جلوس نکالنا چاہیئے منگواؤ اونٹ اور نقارے۔ ایک اونٹ پر میں خود بھی بیٹھوں گا۔

تقریر یا سحر

اس عاجز کی سب سے پہلی ملاقات شاہ صاحبؒ سے یہی تھی اور ان کے انداز و مزاج کا یہ پہلا تجربہ تھا، جہاں تک یاد ہے، یہ جمعہ کا دن تھا، جلوس کی تیاریاں فوراً شروع ہو گئیں اور اسی شان سے جلوس نکلا اور پورے بازار کا اس نے گشت کیا، مشورہ سے یہ بھی طے کر لیا گیا تھا۔ کہ آج بعد نمازِ جمعہ جامع مسجد میں شاہ صاحبؒ کی تقریر ہوگی (واضح رہے کہ اجلاس بھی جامع مسجد میں ہونے والا تھا)

جلوس نے ہی شاہ صاحبؒ کی تقریر کا اعلان کیا، اس زمانے میں شاہ صاحبؒ کی اخبارات میں بہت دھوم تھی اور ان کی زندگی کے بعض واقعات نے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حلقہ کو ان کا نادیدہ عاشق بنا دیا تھا، پھر امروہہ میں بلکہ ہمارے اس علاقے میں شاہ صاحبؒ کی یہ پہلی آمد تھی اور اس دن امروہہ میں کوئی دوسرا بڑا جلسہ بھی نہیں تھا (کیونکہ دونوں جمعیتوں کے بڑے جلسے کل سے شروع ہونے والے تھے) اس لئے شاہ صاحبؒ کی تقریر سننے کے لئے آج بہت سے لوگ ایسے

بھی آ گئے، جن کی دلچسپی دوسری جانب تھی اور جمعیت العلماء ہند کے وہ سخت مخالف تھے۔

نماز جمعہ کے بعد تقریر شروع ہوئی، یہ پہلی تقریر تھی جو اس ناچیز نے شاہ صاحبؒ کی سنی اس میں انشاء اللہ کوئی مبالغہ نہیں کہ پورا مجمع مسحور تھا جمعیۃ العلماء کے مخالفین کی طرف سے اس وقت خاص طور پر دو باتوں کا پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ یہ لوگ کانگریس اور ہندوؤں سے مل جانے والے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ دیوبندی، وہابی اور سجدیوں کے حامی ہیں دشمن رسول ہیں (معاذ اللہ) اس دوسری بات کے اچھالے جانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ دوسری جماعت کے اجلاس کا داعی اتفاق سے امروہہ کا عنصر تھا، جن کے نزدیک دیوبندی، وہابیوں کی تکفیر کے سوا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی دوسرا مسئلہ قابل توجہ نہیں تھا شاہ صاحبؒ کے علم میں یہ صورت حال ہم لوگوں کے ذریعے آ چکی تھی اس لئے ساری تقریر کا محور یہی دو نکتے رہے۔ اس تقریر نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ پوری زندگی میں کسی کا اتنا اثر مجھے یاد نہیں، رسول دشمنی والے ناپاک اتہام کے سلسلے میں کچھ کہتے ہوئے جب شاہ صاحبؒ نے مولانا جامیؒ کے دو شعر اس موقعہ پر پڑھے تو دو آدمی تڑپ کر بے ہوش ہو گئے۔ جن کو بہت دیر کے بعد ہوش آیا۔ یہ تقریر ڈھائی گھنٹے تک ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ اس پہلی تقریر نے مسلمانوں کو انگریز دشمنی کے جذبے سے بھر دیا اور امروہہ کی فضا کو جمعیۃ کے حق میں اور آزادی کی جنگ میں شمول کے لئے آمادہ کر دیا، اس فضا میں اس تجویز کے پاس کرا لینے میں سب سے زیادہ حصہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہی کا تھا عام وخاص مجالس کی اس شخص کی تقریروں نے کایا پلٹ دی، معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کا بندہ تقریر نہیں سحر کر رہا ہے۔

بعض مخصوص ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ کی گرفتاری کے احکام آ گئے اور وہ اجلاس ختم ہونے کے بعد روانگی کے وقت گرفتار کر لئے جائیں گے، چونکہ طے شدہ پالیسی یہی تھی کہ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو گرفتاری سے بچائیں۔ اس لئے یہ چال چلی گئی کہ آخری رات کے آخری اجلاس کے لئے ان کی تقریر کا خاص طور پر اور بار بار اعلان کیا جائے اور اس طرح عوام کو مشتاق بنانے کے ساتھ پولیس کو بھی شاہ صاحبؒ کے بارے میں مطمئن کر دیا جائے اور ہوا یہ کہ شاہ صاحبؒ ایک بڑے عجیب وغریب طریقے پر دن ہی میں امروہہ سے نکل گئے اور

امروہہ کا اسٹیشن چھوڑ ایک دوسرے قریبی اسٹیشن سے انہوں نے سفر کیا، یہ سب کچھ اس طرح سے ہوا کہ ان کی روانگی کا انتظام کرنے والے دو چار آدمیوں کے سوا اپنوں میں بھی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ رات کو مولانا سید احمد سعید صاحب دہلویؒ کی تقریر شروع ہوئی، اس دن مولانا کی تقریر بھی بڑی غیر معمولی قسم کی ہوئی۔ اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا رہا کہ مجمع بڑی بے چینی کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی تقریر کا منتظر اور مشتاق ہے، مولانا نے رات کے قریباً دو بجا دیئے اور ایک دفعہ کلائی کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے فرمایا

"او ہو دو بجنے کے قریب ہیں۔ تو بھئی السلام علیکم۔ اب شاہ صاحبؒ کی تقریر پھر کبھی سن لینا"۔ یہ سن کر پولیس والے بھی ہکا بکا رہ گئے، شاہ صاحبؒ نے امروہہ سے نکل کر ایک طوفانی دورہ کیا، وہ عرصہ تک گرفتار نہ ہو سکے۔ انہوں نے تقریباً پورے شمالی ہندوستان کا دورہ کر لیا۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں جو ہزارہا مسلمان جیل گئے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد تنہا شاہ صاحبؒ کی ہی پرجوش اور آتشیں تقریروں کے حساب میں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی تاثیر اور کشش دی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنے اسی دورہ میں غالباً بدایوں بھی گئے، مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی مرحوم کے مہمان ہوئے۔ معلوم ہے کہ موصوف اپنے بدایونی مسلک میں کتنے سخت تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ (بریلوی حضرات کی اصطلاح کے مطابق) ٹھیٹ وہابی ہیں اس کے علاوہ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا بدایونی مرحوم امروہہ کے اجلاس میں کانگریس کی جنگ آزادی میں شریک ہونے والے ریزولیشن کے اہم مخالفین میں تھے۔ لیکن اس اختلاف (مسلک اور سیاسی رائے) کے باوجود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور ان کے خلوص سے ان کا قلب اتنا متاثر تھا کہ کھانے کے لئے ہاتھ دھونے کے لئے خود لوٹا ہاتھ میں لیکر شاہ صاحبؒ کے ہاتھ دھلاتے تھے اور اپنے شدید اصرار سے شاہ صاحبؒ کو اس معاملہ میں مجبور کر دیتے تھے، اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی رحمت فرمائے۔

یہ جملہ معترضہ کے طور پر ایک بات دھیان میں آگئی تھی ورنہ ذکر ان کے ۳۰ء کے دورے

کامیاب رہا تھا، انہوں نے پنجاب سے بنگال تک کا دورہ کیا اور بنگال جاکر گرفتار ہوئے اور گرفتار ہوکر وہیں علی پور جیل میں رہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ شاہ صاحبؒ اور اسی طرح ان کے خاص رفقاءؒ اپنی اس جدوجہد اور قربانی سے اس کی امید بالکل نہیں رکھتے تھے کہ کانگریس اور اس کے لیڈروں کی طرف سے اس کا اعتراف بھی کیا جائے گا وہ اس قربانی کے ذریعے کوئی پوزیشن حاصل کریں گے بلکہ اس کے برعکس انہیں سابق تجربوں کی بنا پر پورا یقین تھا کہ کوئی ایسا مسلمان کانگریس میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں کر سکتا جو اسلام اور مسلمانوں کا بھی پورا وفادار اور اس موضوع پر لڑ جانے والا ہو ——— اور بالکل یہی چیز سامنے آئی ۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی کے بعد دوسری گول میز کانفرنس سے پہلے گاندھی ارون پیکٹ ہوا اور سارے سیاسی قیدی رہا کئے گئے اور اس کے بعد کراچی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا تو پنجاب کانگریس نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت یہ کیا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفیقوں کو کانگریس کے نظام سے دور رکھا، یہاں تک کہ کراچی کے اجلاس میں یہ لوگ صرف شاہد کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقاءؒ کے سامنے اس جدوجہد اور قربانی کا محرک صرف یہ تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کے لئے ایک لڑائی جاری ہے ہمیں اس مقصد کی خاطر اس میں حصہ لینا چاہیئے حضرت شیخ الہندؒ سے لے کر سید عطاء اللہ شاہؒ تک اس قافلے کے تمام ہی مجاہدین نے اس کو سامنے رکھ کر قربانیاں دی تھیں اور اسی بنیاد پر وہ اپنی جدوجہد اور قربانیوں کو اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد اور قربانی سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اجر کی توقع رکھتے تھے۔

<u>صوفی تبسم</u>

دوست

بخاریؔ اور سالکؔ

بخاریؔ اور سالکؔ پرانے دوست تھے، دونوں میں اشتراکِ ذوق تھا، دونوں ایک دوسرے کے ہمخیال تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دونوں کے دل خلوص سے لبریز تھے۔

مطمحِ نظر ایک تھا، زندگی کے کاروبار میں ایک دوسرے کو سمجھتے اور بھانپتے تھے، میدانِ عمل میں مدتوں ایک دوسرے کا ساتھ رہا تھا، انگریزی عملداری میں اجنبی سیاست کے ہاتھوں ملک و ملت کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں تھیں، رفیقانِ کار و یارانِ طریقت کی محفلوں میں بیٹھ کر جسمانی تکان و ذہنی کوفت دور کرنے کے لئے باہم مل کر قہقہے بھی لگاتے تھے اور بقول حافظ

بفراغِ دل زمانی نظر بماہ روی،

کبھی کبھی یہ دو یارانِ یکدل ایک ساتھ بیٹھ کر دل کی اشتیاق انگیزیوں میں گرم گرم آنسو بھی بہاتے اور گدازِ قلب و رقتِ دل سوزی کے مزے بھی اٹھاتے تھے لیکن انسانی قدم کبھی کبھی ڈگمگا بھی جاتے ہیں اور دلوں کی یگانگت کے باوجود نگاہیں مختلف سمتوں پر پڑتی ہیں۔ ہو نہ ہو دوراہے کہیں نہ کہیں نکل ہی آتے ہیں۔

ای کہ ہمراہِ موافق ز جہاں می‌طلبی
قلندر باش کہ تنہا ز سفر باز آید

بخاری مرحوم اور سالک میں کسی بات پر اختلاف ہوا اور باوجود انتہائی الفت بھی، یگانگت اور باہمی موانست ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

لیکن قدم کتنے ہی الگ کیوں نہ ہوں، دلوں کی وابستگی ہمیشہ اپنا اثر دکھاتی ہے خلوص شرط ہے ایک بار دو ملے ہوئے دل جدا ہو کر بھی دیرینہ پیوستگی کی ایک غیر شعوری طور پر گلہ و شکایت سے گزر کر تلخ گوئیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن یہ تمام باتیں ملاپ کی ایک دبی ہوئی امنگ کا پتہ دیتی ہیں اور دو دلوں کے خفیہ جذبات کسی غیر مخلصانہ سعی و کوشش کا سہارا ڈھونڈتے نظر آتے ہیں، یہی حال بخاری و سالک کا تھا۔ وہ جب کبھی دوستوں میں بیٹھتے تو ایک دوسرے کو ضرور یاد کرتے۔ اس یاد میں تلخی بھی ہوتی، مگر اس تلخی میں ہمیشہ اخلاص مندانہ دوستی کی شیرینی بھی ہوتی۔

بخاری اور پطرس

حصول آزادی کے بعد پروفیسر پطرس ریڈیو چھوڑ کر لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج کے انتظامی امور کی باگ ڈور سنبھالی، علم و ادب کے اجتماعوں کے ساتھ ساتھ دوستوں کی محفلیں گرم ہوتیں، سالک صاحب سے تو روز کا ملنا تھا۔ لیکن جب کبھی بیٹھے کوئی دوست کوئی گرم گرم تڑپتا ہوا شعر سناتا اور اس شعر کی جذباتی کسک دلوں کو گدگدانے لگتی اور احساسات کی الہانہ کیفیت سرور و سوز اور سوز و ساز کی ایک دنیا بسا دیتی تو یک لخت اس کے کسی نہ کسی گوشے میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگتا اور شاہ صاحب یاد آجاتے اور پھر ان کے یاد آتے ہی احباب ایک اور ہی فضا میں کھو جاتے اور پھر جب ہوش میں آتے تو پطرس میری طرف گھور کر دیکھتے گویا اس خلا کا میں ہی پیدا کرنے والا تھا۔

ایک دن تنہائی میں میں نے سارا قصہ بیان کیا، انھوں نے کہا ابھی امرتسر جاؤ اور شاہ صاحب کو ہمراہ لے آؤ، آج سہ پہر کو یہ اجتماع ہو کے رہے گا، حسب معمول دوستوں کو ٹیلیفون پر اطلاع کر دی گئی، میں نے شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا آج زندہ دلان پنجاب یعنی احباب کی تیسویں سالگرہ ہے۔ تین بجے سہ پہر کو شاہ صاحب پطرس کی کوٹھی کے فراخ

صحن میں بیٹھے احباب کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، سالگرہ کی تقریب کا وقت قریب آ رہا تھا پطرس اور میں چپکے سے سالک صاحب کے مکان پر گئے اور انہیں کار میں سوار کیا اور چل پڑے۔

موٹر کی رفتار دھیمی تھی اور پطرس اس روز معمول سے زیادہ باتیں کر رہے تھے، نثر سے زیادہ شعر میں گفتگو ہو رہی تھی، وہ بار بار حافظ کا یہ شعر دہراتے اور خود ہی واہ واہ کہتے چلے جا رہے تھے۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الّا حدیثِ یار کہ تکرار می کنیم

اچانک پطرس نے کہا، سالک صاحب ولایت کے کسی صاحب ذوق ستم ظریف پبلشر نے اپنے ملک کے مختلف "برگزیدہ مصنفوں سے میرا عقیدہ" کے موضوع پر مضامین لکھوائے ہیں۔ واللہ لوگوں نے کیا کیا مزے کی باتیں کی ہیں۔ بار بار انہیں پڑھنے کو جی چاہتا ہے، کہتا ہے کہ :۔

"اگر کبھی مجھے دو چیزوں میں سے ایک کو انتخاب کرنا پڑے
(ملک و دوست) تو اللہ سے دعا ہے مجھے اتنی ہمت دے
کہ دوست کا ساتھ نہ چھوڑوں"

بات ہے تو کافرانہ اور مجرمانہ لیکن ظالم نے کیا بات کہہ دی ہے، ہم شعر چھوڑ کر اسی فقرے میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد موٹر کوٹھی میں داخل ہوئی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کوٹھی کے باہر ایک وسیع صحن کے ایک گوشے میں دوستوں میں بیٹھے معروف گفتگو تھے، سالک نے زمین پر قدم رکھا، بخاری چند لوگوں میں کیا ہزاروں میں چھپ نہ سکتے تھے، سالک نے ایک نظر میں انہیں دیکھ لیا اور بے ساختہ بول اٹھے

"اچھا یہ بات ہے"

اب وہ ہم سے بہت آگے تیز تیز چل رہے تھے شاہ صاحب کا رخ دوسری طرف تھا،

وہاں پہنچتے ہی انہوں نے شاہ صاحب کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، انہوں نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا، سالک کھڑے تھے بولے:۔

"سبحان اللہ چوں اُو آمد در آمد
از در آتش"

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے، نہ جانے کتنی آہیں تھیں جو سینوں کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھریں، کتنے آنسو تھے جو بہہ گئے، آخر نظیر سن آگے بڑھے اور دونوں کو بٹھا دیا، سالک نے کہا سنجاری شعر کو سوز پڑھتے ہیں، مدت ہوئی کوئی اچھا شعر نہیں سنا، سناؤ ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ میں نے یہ شعر پڑھا۔

در دوست قدر شناسند عہدِ صحبت را
کہ مدتی ببریدند و باز پیوستند

سنجاریؒ نے پوچھا نظیری ہے، میں نے کہا نہیں سعدی، اس پر انہوں نے نظیری کی یہ غزل چھیڑی۔

چہ خوش است از دو یک دل سر حرف باز کردن
سخن گذشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

اور جب وہ اس شعر پر پہنچے

تو اگر بجور سوزی جفا نیامد
بجز از دعای جانت ز سر نیاز کردن

دونوں کی نظریں ایک بار پھر ملیں، دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا، اللہ جانے یہ آنسو کب کے رکے ہوئے تھے، وہ انہیں مسرت کی ہنسی میں چھپانے کی کوشش کرتے رہے لیکن نہ چھپا سکے۔

محفل پر خاموشی طاری تھی، دفعتاً شاہ صاحب نے ایک گہری آہ کھینچی اور مسکرا دیئے سبحان اللہ یہ تیسویں سالگرہ ہے، اللہ کرے ایسی سالگرہ روز ہو اور ہیں اور سالک مل بیٹھیں۔

کتنا پر خلوص تھا یہ دل جہاں سے یہ آواز نکلتی تھی۔

مولانا محمد یوسف بنوری

ہندوستان میں خطابت کے ائمہ اربعہ

اور

امیر شریعت کا مقام

ہندوستان کی اس سرزمین میں ایک ہی عصر میں ایسے چار خطیب جمع ہو گئے تھے جن میں سے ایک کی بھی نظیر عالم اسلام میں نہیں تھی اور ظاہر ہے کہ جب عالم اسلام میں نظیر نہ تھی تو غیر اسلامی دنیا میں کہاں سے نظیر ملے گی، جوہر خطابت بھی شرح صدر کا محتاج ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حصہ غیر مسلموں کو نصیب ہی نہیں فرمایا مسلمان کے سینہ میں جو فیضان الٰہی ہوتا ہے کافر کے سینہ میں اس کی گنجائش نہیں، مسلمان کا دل و دماغ جس جذبے سے سرشار ہوتا ہے کافر اس نعمت سے محروم ہے، مسلمان کے دل میں عواطف و جذبات کا جو سمندر متلاطم ہوتا ہے غیر اسلامی دل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسلامی روح جس منبع قدس سے سیرابی حاصل کرتی ہے، کافر کی روح کی تشنہ لبی کو اس سے کیا نسبت۔

پہلا خطیب مولانا ابو الکلام آزاد، دوسرا خطیب مولانا احمد سعید دہلوی تیسرا خطیب مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی اور چوتھا خطیب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے، میرے خیال میں یہ ایک عصر کی خطابت کے آئمہ اربعہ تھے، ایک دفعہ ضلع سورت کے ایک گاؤں میں حضرت مولانا العارف حسین احمد کے ساتھ رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی، تنہائی میں اس موضوع کا ذکر آ گیا، اتفاق کی بات ہے جو میرا خیال تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بعینہ اسی

طرح فرمایا، بہر حال مجھے اپنی اصابت رائے پر خوشی ہوئی، پھر فرمایا کہ اب مولانا حفظ الرحمن صاحب بھی قریب قریب ان کے ہو رہے ہیں اب میں مزید اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بھی اس صف کے قریب آ رہے ہیں۔ میرے ذہن میں ان چاروں خطیبوں کی خطابت کی خصوصیات ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں اور دقیق بھی ہیں، افسوس کہ اس وقت ان کی تفصیلات کی نہ ہمت ہے نہ وقت۔ لطف تو اس وقت آتا کہ پورا موازنہ و مقابلہ نہ ہو سکتا۔ اب تو چند نا معلوم اشارے شاہ بخاریؒ سے متعلق عرض کرتا ہوں۔

خطابت اور خصوصاً عوام کو مسحور کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس موضوع کی جتنی صلاحیتیں ہو سکتی ہیں قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کو عطا فرمائی تھیں، قد و قامت شکل و صورت، قوت و طاقت شجاعت و جرأت، فراست و تدبر، غیرت و حمیت، ذکاوت و شدت احساس، رقت عواطف و جذبات کا تلاطم، بلندیٔ آواز و خوش گلوئی، قرآن کریم کے ساتھ قلبی تعلق اور استحضار، منتخب ترین فارسی، اردو اشعار و ہر موضوع پر عمدہ ذخیرہ کا استحضار دردناک اور فلک شگاف آواز کے ساتھ قرآن کریم کا پڑھنا، مخالفین کے مجمع پر قبضہ کرنا، عالم و جاہل، مرد و عورت، مخالف و موافق، سب کا یکساں طور پر متاثر ہونا یہ ان کی وہ خصوصیات ہیں کہ ان میں کوئی ان کی ہمسری نہیں کر سکتا، مجمع کو رلانا، تڑپانا، ہنسانا ان کی خطابت کا ادنیٰ کرشمہ تھا، مجمع سے اپنی بات منوانا، ننانوے فیصد مخالفوں کو اپنا ہم خیال بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، بعض اوقات تو بولنے سے پہلے ساحرانہ نگاہ ہی سے مجمع کو مسخر کر لیتے تھے۔ نگاہ کیا تھی غضب کی نگاہ تھی، آواز تھی یا بجلی کوندتی تھی، اسٹیج پر کسی کی مٹی پلید کرنے کا ارادہ رکھتے تو اتنا کامیاب ترین خطیب نہ کسی نے دیکھا ہوگا نہ سنا ہوگا، لسانی اور فکری خصوصیات کی کامیاب ترین تخیل اور اپنے موضوع واقعات سے جو نقشہ کھینچتے تھے دنیا کا کوئی خطیب ان کی نقالی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر نامناسب نہ ہوتا تو میں یہ تعبیر کرتا کہ شرعی ایکٹر تھے ہندوستان کی سرزمین میں وہ واحد خطیب تھے جس نے اپنی خداداد ساحرانہ قوت خطابت سے دنیا و سیاست کی وہ خدمت کی جو ایک پوری قوم نہیں کر سکتی، تنہا ان کی شخصیت نے وہ کام کیا جو ایک صدی میں ایک ادارے کو کرنا چاہیئے تھا۔ یہ شخص کسی اور قوم میں ہوتا تو نہ معلوم

اس کی کیا یادگاریں قائم ہوتیں لیکن مسلمان قوم اپنی زندگی ختم کر چکی ہے، اس ختم شدہ دور میں یہ حیرت انگیز خطیب آئے، ورنہ تاریخ کے کسی بہترین دور میں پیدا ہوتے تو نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ امیر شریعتؒ کی نظر میں

قدرت نے فوق العادۃ زبان کی شیریں بیان روانی اور فوق العادۃ مؤثر تعبیر کی قوت عطا فرمائی بعض اوقات ایک جملہ میں پوری کی پوری داستان ختم کر دیتے تھے ایک دفعہ جامعۂ ڈابھیل تشریف لائے، اساتذہ جامعہ مروتی اسٹیشن پر استقبال کے لئے گئے لاری میں آرہے تھے، میں نے کہا شاہ جی آج تو حضرت شیخ پہ ایک تقریر کر دیجئے (یعنی حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ پر) فوراً فرمایا۔ بھائی یوسف کیا کہوں۔ صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا، اور شاہؒ پیچھے رہ گئے تھے۔

بے اختیار میں نے کہا حسبک اللہ یا عطا اللہ اور رفقا نے جملہ نہیں سنا تھا جب سنایا سب تڑپ گئے۔

غیر مسلموں کو تبلیغ اسلام

ایک دفعہ نوساری ضلع سورت میں سکھوں اور ہندوؤں کی ایک دعوت پر ایک تقریر منظور فرمائی، ایک تھیٹر ہال کا انتخاب ہوا، جامع ڈابھیل کے اساتذہ اور طلبہ بھی شریک تھے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی بھی تشریف رکھتے تھے اس تقریر کی تاثیر و حلاوت فوق العادۃ خطابت کا کمال آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے، اس کی شیرینی کام و دہن میں ہے، ہندوؤں اور سکھوں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرواتے تھے، اسلام کی حقانیت، اللہ کی عظمت اور توحید گوشت خوری کے منافع، بت پرستی کی قباحت پر حیرت انگیز بیان تھا، حضرت شبیر احمد عثمانی زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے کبھی ان کو اتنا روتے ہوئے نہیں دیکھا تقریر کے بعد میں نے سنا، فرماتے تھے، میں نے بیسیوں تقریریں مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کی سنی ہیں

لیکن مؤثر تقریر آج تک نہیں سنی اور فرمایا کہ آج عطاء اللہ شاہ نے حق تبلیغ ادا کر دیا ہے اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم متکلم خطیب کی یہ داد کتنی قیمتی ہے۔

شاہ صاحبؒ مولانا انور شاہ صاحبؒ کی نظر میں

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کو آپ سے بے انتہا محبت تھی اور دعا کیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ ایسا خطیب کبھی نہیں دیکھا جو روتوں کو ہنساتا ہے اور ہنستوں کو رلاتا ہے اور فرماتے تھے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف ان کی ایک تقریر وہ کام کرتی ہے جو ہماری پوری تصنیف نہیں کر سکتی، کسی مجلس میں انہیں دیکھتے تو باوجود اس کے متانت و وقار کا پہاڑ تھا، محظوظ ہوتے جس کی انتہا نہیں۔

لاہور کا تاریخی اجلاس جس میں آپ امیر شریعت بنائے گئے

مئی ۱۹۳۰ء کا جو تاریخی اجلاس انجمن خدام الدین لاہور کا ہو رہا تھا جس کا سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے اس وقت امام شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی مولانا ظفر علی خاں نے امارت کے لئے پیش کیا، حضرت شیخ نے کھڑے ہو کر تقریر فرمائی اور اپنی کمزوری کی وجہ سے معذرت پیش کی اور شاہ بخاریؒ کی امارت کی نہ صرف تجویز کی بلکہ امیر بنا کر فرمایا میں بھی اس مقصد کے لئے ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، آپ حضرات بھی ان سے بیعت کریں اور اپنے دونوں ہاتھ مبارک سید بخاریؒ کے ہاتھ میں دے دیئے۔ وہ منظر بھی عجیب تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رو رہے تھے اور کہتے ہیں کہ خدا کے لئے مجھے معاف فرمائیں میں اس کا اہل نہیں اور حضرت شیخ اصرار فرما رہے ہیں۔ اس وقت سب سے پہلے مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ نے پہلی بیعت فرمائی۔ پھر مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے بیعت کی، راقم الحروف بھی اس مجمع میں شریک تھا اور غالباً تیسر انمبر بیعت کرنے والوں میں میرا تھا، اس وقت شاہ بخاری امیر شریعت بنائے گئے اور ان کی شخصیت میں مقبولیت اور جاذبیت کا وہ رنگ پیدا ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہ تھا اور اس کے بعد اخلاص کے ساتھ خدمت کی توفیق ان کو ملی۔

ان کی زندگی کا تاریخی دور ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی یہ عام مقبولیت اور مجاہدانہ سرگرمیاں مخلصانہ خدمات اور حیرت انگیز تاثیر اور بے پناہ محبوبیت حضرت مولانا انور شاہ کی کرامت تھی ۔ اپنے ہاتھ مبارک جو ان کے ہاتھوں میں رکھ دیئے تھے اس کی وجہ تھی اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کو جو قادیانی فرقہ سے بغض و عناد تھا اس نے عطاء اللہ کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ دراصل شاہ بخاری کا وجود حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی کرامت تھا جس کی وجہ سے علماء، صلحاء، عرفاء و اتقیاء وقت کے بڑے بڑے اہل فضل و کمال مولانا عطاء اللہ کے جاں نثار محب و والہانہ معتقد بن گئے تھے ۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم ۝

علامہ طالوت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ نذیر

بطور

شاعر

(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جب کہ عرب قبائلی زندگی بسر کرتے تھے ہر قبیلے کا ایک شاعر اور ایک خطیب ضرور ہوتا تھا، جس قبیلے میں شاعر یا خطیب نہ ہوتا وہ کم مرتبہ خیال کیا جاتا، جس قبیلے کے شاعر اور خطیب بلند مرتبے کے ہوتے وہ دوسرے قبائل سے سربرآوردہ خیال کیا جاتا، اس لئے شاعر قوم کا دل خیال کیا جاتا تھا، خطیب قوم کی زبان متصور ہوتا تھا اور قبیلے کا سردار قوم کا دماغ اور نوجوان اس کے دست راست شمار کئے جاتے تھے، دل جہاں نہ ہو وہاں دست و بازو اور دماغ کیا کام دے سکتے ہیں —— اور زبان نہ ہو تو دل و دماغ کی ترجمانی کیونکر ہو، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ دل اور زبان کا کام ایک ہی شخصیت سے لیا گیا۔

اسلام آیا تو قرآن کے سامنے نہ شاعری کا زور باقی رہا نہ خطابت کا زور چل سکا، پھر بھی شعراء اور خطیب باقی رہے مگر اب وہ عصبیت جاہلیہ کو بھڑکانے والے نہیں تھے بلکہ

قرآن کے مبلغ اور اسلام کے مدافع تھے، اسلامی فوجوں میں دونوں کا وجود ثابت ہے اور یہ دونوں فوجی نظام کا ایک اہم جزو خیال کئے جاتے تھے۔

پھر جب اسلام ہر بلند و پست پر چھا گیا اور اس کی فوجیں فتح ممالک کے ساتھ ساتھ نظم ممالک کا کام کرنے لگے تو شعر و خطابت نے اپنی اپنی راہیں بدل دیں، شعرا نے مدح و ہجو کی راہ پر چل کر اگرچہ اپنی جیبیں بھر لیں مگر اپنا وقار کم کر لیا، خطیبوں نے قوم کے بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارنے کا کام اپنے ذمے لے لیا اور اپنی عزت اگرچہ پہلے سے زیادہ کر لی مگر یہ

چہ خورد بامداد فرزندم

کے مسئلے پر پہنچ کر ششدر رہ گئے، پھر محض قصاص اور پیشہ ور بن گئے جن کے متعلق :۔

چوں بہ خلوت میروند آں کار دیگر میکنند

کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی رہے جنہوں نے کما کر کھانے اور حق کہنے کی قسم کھا رکھی تھی، وہ منبروں پر بھی حق کہتے رہے اور جب ایسا وقت آیا کہ :۔

برادر تواں گفت بہ ممبر نتواں گفت

تب بھی انہوں نے حق کہنے سے دریغ نہ کیا، جب مشرق و مغرب سے عرب قیادت کا ٹاٹ لپیٹ دیا گیا تو شاعری نے عشق بازی کو رسوائی کا طرۂ امتیاز بنا لیا اور خطابت غیروں کے کام آنے لگ گئی،

ایں ہم رفت و آں ہم رفت

ہر کلیے میں استثناء ضرور ہوتا ہے، چنانچہ بعض صوفیا اس دور میں بھی مستثنیٰ رہے جنہوں نے شاعری کو رسوائی سے علیحدہ رکھا اور خطابت کو قصہ گوئی سے بچا کر اغیار کی دستبرد سے بھی محفوظ رکھا مگر ان کی حیثیت الشاذ کالعدم سے زیادہ نہ تھی۔

—— ۲ ——

برعظیم پاک و ہند میں اسلام گجرات کاٹھیاواڑ کے راستے داخل ہوا جہاں عرب اپنی تجارت کے سلسلے میں آمد و رفت رکھتے تھے مگر اس کا نفوذ اس وقت پورا ہوا جب محمد بن قاسم سندھ

کے راستے سے ملتان و لاہور تک خانقاہ آیا، پھر جب اسلام کے سیاسی سفیر معین الدین اجمیری نے دہلی، پنجاب اور راجپوتانہ کا دورہ کر کے شہاب الدین غوری کو بلایا تو یہ نفوذ اور بھی بڑھ گیا کچھ دن غوری اور اجمیری کے جانشین مل کر کام کرتے رہے، مگر ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ ان کی راہیں الگ ہوگئیں، پھر بھی ایک دوسرے سے اتنا بُعد نہیں تھا کہ اجنبیت کا خیال گزرا، کبھی اجمیری کے جانشین دہلی تک چلے جاتے اور کبھی غوری کے جانشین خانقاہوں تک قدم رنجہ فرما لیتے ــــ خانقاہوں نے تخت و تاج کی حفاظت اور تخت و تاج نے خانقاہوں کو جاگیریں عطا فرمائیں اور دونوں :-

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو!

کے کوچے میں پہنچ کر اپنے اصل مقصد سے دور ہو گئے، خانقاہوں میں تخت و تاج کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں اور تخت شاہی پر سے اہل خانقاہ کی ترغیب و تربیت کے لئے منصوبے تیار ہونے لگے۔

تلک الایام نداولہا بین الناس

کی صداقت نے کبھی اہل خانقاہ کا ساتھ دیا اور کبھی تخت و تاج کا ــــ تا آنکہ مغل اعظم نے الحاد کے ساتھ ساز باز کر کے اہل خانقاہ کو مارکیٹ بدر کر دیا، مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا، مغل اعظم کے جانشین نے سرہند میں گھٹنے ٹیک دیئے اور اہل خانقاہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر پھر بلند و پست پر چھا گئے، اسی زمانے میں مغرب کے دندانِ آز کی تیزی کی داستانیں بھی اس برعظیم تک پہنچنے لگ گئی تھیں، حکمت و طب کے چور دروازے سے گزر کر کچھ لوگوں نے اس برعظیم کی نفع بخشی کا جائزہ کیا تو اسی چور دروازے سے تجارت کی راہیں پیدا کی گئیں تا آنکہ ایک وقت ایسا آیا کہ اہل خانقاہ تاج و تخت سے بیزار ہو کر بالکل الگ ہوگئے اور تاج و تخت بحیرۂ فرنگ کی موجوں میں ہچکولے کھانے لگ گیا، موجیں اگرچہ تند و تیز نہیں تھیں۔

ــــ ۳ ــــ

تخت و تاج سے نمٹنے کے بعد نئے حاکموں نے پہلے تو قانونِ خداوندی کو پورا کیا

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا
وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذالک
یفعلون۔

(بادشاہ جب (فاتحانہ) کسی ملک میں داخل
ہوتے ہیں تو اسے برباد کرنے کی کوشش
کرتے ہیں اور وہاں کے غالب لوگوں کو
ذلیل بنا دیتے ہیں اور وہ اسی طرح کیا
کرتے ہیں)

پھر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ اہل خانقاہ جنہوں نے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مغل اعظم کے جانشینوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا ان میں ابھی اتنی جان باقی ہے کہ وہ قوم کو پھر میدان میں لا کھڑا کر سکیں گے، چنانچہ عیار حکمرانوں نے نظام خانقاہی میں سے کچھ لوگوں کو ترغیب کے چھکے دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا اور دوسری طرف وہ کام شروع کر دیا جو فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا، مگر فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو "تلخ چھری" سے ذبح کرتا اور یہاں قوم کے بچے "میٹھی چھری" سے ذبح ہوتے اور میٹھی چھریاں بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ اگرچہ علیگڑھ میں تھا مگر اس کی شاخیں ہر شہر اور قصبے میں موجود تھیں جب بغیر بدنامی مول لئے قصاب خانوں اور مسلخوں سے زندہ لاشیں برآمد ہوئیں تو ان پر نوازشات کی بارش شروع ہو گئی جسے دیکھ کر ہر شخص اپنے بچوں کو خود بخود ان مسلخوں میں داخل کرانے لگ گیا اور اس طرح ان حاکموں کا کام آسان ہو گیا، مگر باوجود اس آسانی کے ان کا دل مطمئن نہ ہوا اور خطرہ یہ تھا اہل خانقاہ کا دوسرا حصہ جو ترغیب و ترہیب سے بے نیاز تھا برابر اپنے کام میں مصروف تھا اور ہو سکتا تھا کہ ان زندہ لاشوں کے قلوب میں وہ ایمانی حرارت پیدا کر کے ان حکام کے خلاف انہیں استعمال کرلیں، اس لئے حاکموں نے تہیہ کر لیا کہ جس طرح ان لوگوں کی ظاہری کھال قصاب خانوں میں اتار لی گئی ہے کسی طرح ان کے قلوب میں سے ایمانی حرارت کا بھی خاتمہ کر دیا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ الحاد کی ہموت

اس طرح ان کے دلوں میں داخل کر دی جائے کہ ایمان کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ پنجاب کے ضلع گورداسپور میں ایک خاص قسم کے کھیت ایک مخصوص قطعہ زمین پر تیار کئے گئے اور وہاں ایک تجرباتی فارم بنا کر نئے اصول کے مطابق کاشت کے نئے تجربے کئے گئے یہاں تک کہ ایک خود کاشتہ پودا ایسا نتیجہ خیز ثابت ہوا جس کے استعمال سے حرارت ایمانی کے لئے قلوب میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ اب ملک میں ہر طرف اس فارم کی شاخیں کھول دی گئیں اور ہر جگہ یہ پودا کاشت کیا گیا، جب ملک میں اس کی پیداوار وسعت اختیار کر گئی اور وہ منافع بخش بھی ثابت ہوئی تو یہ مال باہر کی منڈیوں میں بھیجا جانے لگا، عرب، افریقہ اور یورپ کی منڈیوں میں خاص طور پر یہ مال بھیجا جاتا تھا، یورپ میں تو صرف نمائش کی خاطر کہ دیکھئے ہندوستان کا مال کس طرح خوبصورت اور نفع بخش ہے، اور عرب و افریقہ کی منڈیوں میں استعمال کی خاطر، تاکہ وہاں کے لوگوں کے دلوں سے بھی حرارت ایمانی کا خاتمہ کیا جا سکے۔

۴

یہ حالات تھے جب غیرتِ حق کو جوش آیا اور اس نے سرزمین پاک و ہند میں عرب کے باقیات الصالحات اور عربی آقا کے نام لیواؤں کو ایک شاعر اور ایک خطیب عطا فرمایا تاکہ شاعر اپنے سوز اور خطیب اپنے ساز سے ان کے دلوں کو گرما کر پھر ان میں حرارت ایمانی پیدا کر سکیں۔ خطیب کے جادو بیانی ساتھ نہ ہو تو شاعر کا پیدا کیا ہوا سوز میدان میں کام نہیں دے سکتا اور اگر شاعر کا سوز نہ ہو تو خطیب کی جادو بیانی اگرچہ اثر تو کرتی ہے مگر اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ سرد لوہے کو کوٹنے سے آج تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا البتہ لوہا گرم ہو تو لوہار کے لئے کام آسان ہو جاتا ہے۔

شاعر کا کام قساوت قلبی کو اشعار کی گرمی سے نرم کرتا ہے اس کے بعد خطیب کا کام شروع ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے کام لے۔

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا۔

"ان من الشعر الحکمۃ وان من البیان السحرا"

کچھ اشعار حکمت بھرے ہوتے ہیں اور کوئی خطابت جادوگری کا کام کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے جب اسلامیانِ پاک و ہند کی اصلاح کے لئے نظرِ عنایت ملتفت فرمائی تو انہیں حکمت و سحر بیانی دونوں عطا فرمائے۔ تاکہ پہلے حکمت ذہن تیار کرے اور اس کے بعد جب یہ معلوم ہو کہ

یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

تو خطیب کی ساحرانہ طاقت بروئے کار آکر قوم سے کام لے، آپ کو معلوم ہے کہ حکمت کے علمبردار ہمارے ان حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ تھے جنہوں نے اپنی حکیمانہ شاعری سے الحاد زدہ سنگین قلوب کو موم کی طرح نرم کر دیا اور

ان من البیان لسحرا

کا مصداق پیکرِ خطابت خطیب الامت مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری ہیں (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) جن کی جادو بیانی اپنوں بیگانوں سب کے ہاں مسلّم ہے اور جو:-

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

کا پورا پورا مصداق ہیں۔

۵

علامہ اقبال کے حلقۂ اثر میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے ان کے پیغام اور ان کی حکمت کی تشریح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، کیونکہ یہ کام آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا مصداق ہے۔ ہم خرما و ہم ثواب، اچھا کام بھی کرو اور تصنیف و تالیف کے دام بھی پلّے باندھ لو، دام نہ ملے تو شہرت تو کہیں گئی نہیں مگر بخاری کی خطابت کی تشریح اور ان کے مقاصد کا بیان کچھ آسان کام نہیں، اگر ان کے حلقۂ مآثر نے جادو بیان خطیب تو پیدا کئے، مگر آج تک انہیں ایک بھی آدمی ایسا نہ مل سکا جو ان کی ساحری کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر کے زادِ تاریخ بنا سکتا جس سے آنے والی نسلیں بھی بہرہ اندوز ہو سکتیں اور یہ اس لئے کہ ایک تو یہ کام آسان نہیں اور دوسرے گٹھلیوں کے دام تو الگ رہے یہاں آموں کے دام وصول ہونے کی بھی امید موہوم ہے

اور یہی وجہ ہے کہ آج تک بخاری پر کچھ نہیں لکھا گیا ورنہ ان کے محاسن برِّ اعظیم پاک و ہند کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے کم نہیں۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی شخصیت سے اہل علم واقف نہیں ہیں۔ آج سے چار سو سال پہلے تک ان کے مرتبے کا کوئی عالم نہیں اور نہ ہی شائد آج سے چار سو سال بعد تک پیدا ہوا انہوں نے خود علامہ اقبال اور دوسرے اکابر کے سامنے لاہور میں آپ کو "امیرِ شریعت" نامزد فرمایا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور سب کو آپ کی متابعت کا حکم دیا۔ کیا یہ کچھ کم فضیلت ہے؟

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے پاک و ہند کا بچہ بچہ واقف ہے۔ ان کی خطابت و قیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں، مگر انہوں نے لاہور میں ایک موقع پر شائد "زمیندار" کے دفتر میں سب کے سامنے شاہ صاحبؒ کے متعلق فرمایا:۔

"اس ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جا سکتی ہے، نہ بعد میں، اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جمتا، اور اس سے پہلے جو تقریر کرے اس کے اثر کو یہ آ کر مٹا دیتا ہے۔"

مذہب و سیاست کی دو بڑی شخصیتوں کی رائے کے بعد کسی تیسرے آدمی کی رائے بیان کرنے کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ بلکہ میرے نزدیک تو ان آرا کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

ابن الوقت کا لفظ آپ نے سنا ہوگا، اردو میں ابن الوقت اس شخص کو کہا جاتا ہے جو

دُر مع الدھر کیف ما دار

پر عمل پیرا ہو۔ اس کو ہر دیگ کا چمچہ اور تھالی کا بینگن بھی کہتے ہیں جو آپ کے پاس آئے تو آپ کی ہاں میں ہاں ملائے اور آپ کے دشمن کے پاس جائے تو اس کی ہاں میں ہاں ملائے۔

ابن الوقت کی ضد ایک اور لفظ ہے "ابو الوقت"۔ یہ لفظ ایسے شخص کے لئے استعمال

ہوتا ہے جو اپنی رائے کا اظہار صفائی سے کرے اور دوسروں کی ہاں میں ہاں نہ ملائے، گویا ہر زمانے میں ابوالوقت تو ایک ہوتا ہے اور ابن الوقت ہزاروں ہوتے ہیں۔

زمانہ حال میں شاعری کے ابوالوقت علامہ اقبال مرحوم تھے اور خطابت کے ابوالوقت حضرت سید عطا اللہ شاہ بخاری ہیں۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ آج ہر شاعر اپنے الفاظ میں وہ ترکیبیں اور بندشیں لاتا ہے جو علامہ اقبال لایا کرتے تھے، بلکہ مضامین بھی تقریباً وہی لاتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ لوگ ان کے اور علامہ اقبال کے کلام میں کوئی تمیز نہ کر سکیں اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کے کلام کی طرح ان کا کلام بھی بلند پایہ اور مقبول عام ہو جائے۔

اسی طرح آج ہر واعظ اور خطیب کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی بخاری کی طرح قرآن پڑھے، بخاری کی طرح وجد آفریں الفاظ اور سحر آفریں ترکیبیں استعمال کرے۔ بخاری کی طرح ترنم (اگر میسر ہو۔ ورنہ بغیر ترنم ہی سہی اور اگر غلط فہمی غالب ہو تو بدآوازی کے ساتھ ہی) اساتذہ کے چیدہ چیدہ شعر سنائے، بخاری کی طرح تاریخی واقعات سے استفادہ کرے، بخاری کی طرح شواہد کو واقعات پر چسپاں کرے، بخاری کی طرح قرآنی آیات والفاظ کے نئے نئے نکات بیان کرے، بخاری کی طرح مجمع کو کبھی کبھی لطیف چھینٹوں سے جگائے، اور کبھی ترنم کی لوریوں سے سلائے۔

غرض آج ہر خطیب اور واعظ پر بخاری کا اثر ہے اور وہ ابوالوقت اور تو اور ان لوگوں پر بھی چھایا ہوا ہے جنہیں علمی فضیلت و کمال کی بنا پر وہ اپنے اساتذہ کے برابر درجہ دیتا ہے۔ ہم نے ایک دو نہیں کئی بزرگ دیکھے ہیں جن کا ترنم برائے بیت ہے لیکن بخاری بننے کے شوق میں سارے کا سارا وعظ مترنم انداز میں فرما رہے ہیں، حالانکہ بخاری کا کمال حضرت بخاری کے ترنم میں نہیں بلکہ ان کے انداز خطابت میں ہے، وہ بغیر قرآن و حدیث پڑھے اور بغیر ایک شعر سنائے بھی بخاری سے کامیاب تقریر سنی جا سکتی ہے۔ مگر ابنائے وقت (خواہ علمی طور پر وہ آبائے علم ہی کیوں نہ ہوں) یہ بات سمجھانا تو بے سود ہے کہ وہ بخاری کی تقلید نہ کریں، کیونکہ ابنائے وقت کا تو کام ہی تقلید ہے

۷

بخاریؒ نہ ہوتے تو زمانۂ حال کے اسی فیصد بہترین خطیبوں کو فنِ تقریر سے منفی کیا جاسکتا تھا۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی زبانوں پر الفاظ بخاریؒ کے ہیں، اشعار بخاریؒ کے انتخاب کردہ ہیں اور آیات و حدیث تک بخاری کی دی ہوئی ہیں۔

یہ وہ ہیں جنہیں لفظاً لفظاً بخاری کی تقریریں ازبر ہیں اور اپنے اپنے مقام پر وہ ایسے زنانٹے کی تقریر کرسکتے ہیں کہ اگر آپ بخاریؒ کو نہ جانتے ہوں یا ان کی تقریر نہ سنی ہو تو براہ راست ان کی خطابت پر ایمان لے آئیں، ان میں وہ بھی ہیں جنہیں آپ نقل مطابق اصل کہنے میں باک نہیں کریں گے اور کچھ ایسے ہیں جنہیں بخاری کا پاکٹ ایڈیشن کہا جاسکتا ہے، ان کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی نقل راہم عقل بابدیہ تک بھی رسائی ممکن نہیں۔ مگر بخاری بننے کے شوق میں غلط شعر ہی جھوم جھوم کر سنائے جارہے ہیں، یہ لوگ اپنی جگہ پر اور سب کچھ ہوسکتے تھے لیکن اگر بخاری نہ ہوتے تو یہ واعظ یا خطیب ہرگز نہ ہوسکتے اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ بخاریؒ کے حافظ (یعنی بخاری کی تقریروں کے حافظ) سب بخاری کے ہمنوا یا ہم صفیر ہیں، ان میں سے اکثریت بخاری کی مخالف ہے، بخاریؒ کے الفاظ بخاریؒ کے انداز اور بخاری کے منتخب اشعار، بخاریؒ کے خلاف استعمال کرنا یہ لوگ باعث فخر سمجھتے ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر بخاریؒ نہ ہوتے تو ان لوگوں کا وجود بھی نہ ہوتا، بغرض جس طرح لوگ اقبال بننے کی کوشش لاحاصل کررہے ہیں، اسی طرح بخاریؒ بننے کی بھی کوششیں کررہے ہیں، اقبال اور بخاری کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔

۸

ہم جملہ عقیدت مندوں کی طرح مدت العمر شاہ صاحب کو ایک بے مثال خطیب اور ایک بے نظیر سخن فہم بزرگ سمجھتے رہے مگر ایک دن اتفاقاً ہمیں معلوم ہوا کہ شاہ صاحب شاعر بھی ہیں اور ندیم تخلص فرماتے ہیں، سچ مانئے کہ آسمان پھٹ پڑتا اور ہم اپنی آنکھوں سے

فرشتوں کو زمین پر گرتا ہوا دیکھ لیتے تو ہمیں اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا یہ سن کر کہ شاہ صاحب شعر گوئی بھی فرماتے ہیں، یہ تعجب اس بنا پر نہیں تھا کہ شعر و سخن کوئی عالم بالا کی چیز ہے اور وہاں تک شاہ صاحب کی رسائی نہیں تھی، بلکہ یہ استعجاب :۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کی اقسام میں سے تھا۔

یہ تو ایک مسلّمہ امر ہے کہ سخن گوئی سے سخن فہمی زیادہ مشکل ہے اور شاہ صاحب سخن فہموں کے بھی سرداد ہیں تو سخن سنجی ان کے مرتبے سے فروتر بات ہے مگر اس فروتر بات میں بھی اس قدر سنجگی، بلندی اور چستی ہوگی کہ اس کا ہمیں گمان تک بھی نہیں تھا، یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے شعر گوئی کی طرف عمداً اور ارادتاً توجہ نہیں فرمائی اور جس طرح ہمیں دفعتہً معلوم ہوا کہ وہ شاعر ہیں خود انہیں بھی اچانک واردات کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ سخن فہمی کے ساتھ ساتھ سخن گوئی کے جراثیم بھی ان کے اندر پائے جاتے ہیں مگر شکر کیجیے کہ بحیثیت فن انہوں نے اس کو اختیار نہیں کیا، ورنہ بڑے بڑوں کے نام اس کی سخنوری کے سامنے "چھوٹو رام" ہو کر رہ جاتے، ان کی زندگی بازی گاہِ سیاست میں جس نہج پر گزری اس کے متعلق کبھی میں نے کہا تھا :

صبحدم ریل میں گزرتی ہے
شب کسی جیل میں گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو اس کھیل میں گزرتی ہے

اسے تفنن نہ خیال فرمایئے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خداداد لغت (خطابت) کے نشہ میں کراچی سے کلکتہ اور گلگت سے بمبئی تک سارے برعظیم پاک و ہند میں گاؤں گاؤں شہر شہر اور کونے کونے کا سفر کر ڈالا اور ہر جگہ لوگوں کو آزادی وطن خواہی اور مغربیت سے دین و اسلام کو بچا لینے کا درس دیا، یہ کام اس قدر وسیع تھا کہ انہیں اس کے سوا کسی دوسری طرف توجہ فرمانی کا موقع ہی نہ مل سکا۔

۹

پھر تعجب بالائے تعجب اس وقت ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے فاضل شہزادے ابوذر بخاری نے موتیوں کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو بڑے سلیقے سے ایک سلک میں پرو کر بازار کساد وفساد میں پیش کرنے کا ارادہ فرما لیا ہے اور پھر اس مشک نافہ کے لئے عطاّ کے فرائض مجھ ہیچمدان وہیچ مرز کو ادا کرنے ہوں گے۔ اب کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا پہلے تو خیال آیا کہ تعارف میں صرف سعدی کے یہ الفاظ لکھ دوں:

مشک آنست بوید نکہ بعطار بگوید

مگر پھر خیال ہوا کہ عطاروں کے بازار میں تو یہ بات کہتے ہوئے کوئی ہرج نہیں اور جس بازار میں حضرت ابوذر اپنا یہ گنجینۂ زر پیش کرنے والے ہیں وہاں

شناسا نہیں کوئی بھی اس ہنر کا

پھر اس کے ساتھ خطرہ یہ بھی ہے کہ کچھ کہنے کے ساتھ کہنے والے کا بھرم بھی کھلتا ہے: شاہ صاحبؒ فرمائیں گے کہ

شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد

اور اہل نظر کہیں گے:

سخن فہمی عالم بالا معلوم شد!

بہت سوچا، اصطلاحات کا سہارا لینے کو جی چاہا اور معاً غالبؔ کا شعر دماغ میں گھومنے لگا:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی اور شاہ صاحب کے کلام کو دیکھنے بیٹھ گیا کہ اب بادہ و ساغر کی اوٹ میں بہت کچھ لکھ لوں گا ورق الٹا تو نظر سب سے پہلے شاہ صاحب کے اس شعر پر جا پڑی:

گر ہو وداے عشق کی تلخی، نصیب حق
ملتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر

پڑھتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اصطلاحات کا سہارا (ھباءً منثورا) ہوگیا اور ضمیر نے کہا اب کہو اور میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ غالبؔ کے بعد غالبؔ کی زمینوں میں پہلے تو بہت کم لکھا گیا اور تھوڑا بہت جو لکھا گیا وہ کامیاب نہیں رہا، جواب آں غزل کا دور غالبؔ کے ساتھ ہی ختم ہو گیا

ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است

لیکن اگر شاہ صاحب اس شعر کے جواب کی بجائے جواب آں غزل لکھ ڈالتے تو کیا کامیاب نہ ہوتے ؟

۱۰

دوسرے صفحہ پر نگاہ پڑی تو ایک فارسی نعت سامنے آگئی جس کا مطلع ہے:-

ہزار صبح بہار از نگاہ مے چکدش
جنوں ز پیچشِ زلفِ سیاہ مے چکدش

مطلع پڑھتے ہی ایک بہت پرانا واقعہ ذہن پر چھا گیا۔ اور دل نے گواہی دی کہ "یقیناً" یہ نعت اس واقعے کے بعد ہی کہی گئی ہوگی۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ بار ہیں نے شاہ صاحب کی ایک تقریر سنی، یوں تو ہر تقریر خطابت کا شاہکار ہوتی تھی مگر اس تقریر کا رنگ ہی کچھ اور تھا، تقریر تقریباً ساری رات جاری رہی مگر ہزاروں کے مجمع میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جسے کوئی داعیہ تقریر میں سے اٹھا کے لے گیا ہو، شاہ صاحب کا چہرہ جلال و جمال کا مرقع بنا ہوا تھا۔ بجلی کی روشنی میں آفتاب کی طرح چمک رہا تھا، مجھے اس موقع پر پرانے کسی استاد کی رباعی یاد آگئی:

از سخن شہد ناب مے چکدش
وز تبسم گلاب مے چکدش

مے تواں گفت کز حرارت مے
از جبیں آفتاب مے چکدش

میں نے ایک لفظ کی تبدیلی "مے" کی بجائے "عطا" سے شاہ صاحبؒ کے نام پر چسپاں کر دیا اور پاس بیٹھے ہوئے ایک دوست کو سنادی، وہ تڑپ اٹھا۔ بار بار رباعی کے مصرعوں کو دہراتا اور شاہ صاحبؒ کو دیکھتا، بعد میں یاد نہیں کہ میں نے یہ رباعی خود یا اس دوست نے شاہ صاحبؒ کو سنائی، اگرچہ آپ نے ہماری اصلاح تو قبول نہ فرمائی، مگر رباعی کو بہت پسند فرمایا، لکھ لی، اپنی عادت کے مطابق جھوم جھوم کر کئی بار سنائی، ہمارے لئے سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ تو جی ایک چیز تو ہم بھی ایسی نکال لائے جو اب تک شاہ صاحبؒ کے ذخیرۂ انتخاب میں نہیں تھی اور نہ عموماً یہ ہوا کہ ان کی محفل میں کوئی شعر پیش کرو تو اس کے ساتھ کے دو تین شعر اور سنا ڈالتے تھے اور دل نے ابتہاجاً یہ کہا کہ اس رباعی کے ساتھ ساتھ اب تمہارا نام بھی شاہ صاحبؒ کے دل میں محفوظ ہو گیا، اتنے سے تقرب میں بھی اس قدر نشہ چھا گیا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

مگر یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس رباعی کا کچھ جواب بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی اتنا بلند پایہ کہ کیا کہنا سنئے:

چمن چمن گل و نسریں ز عکس رُخ ریزد
سبد سبد گل خنداں ز راہ مے چکدش
چہ سود ہاست بجانم ز خندۂ نمکیں
چہ فتنہ ہا کہ ز چشم سیاہ مے چکدش

صفاتِ حق کی جلوہ نمائی کا بیان آپ نے بہت پڑھا ہوگا مگر ذات و صفات کے شاہد اور گواہ آپ نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔

چہ گفتگو چہ تبسم شہادتے بحدوثش
ز نور چہرہ قدم را گواہ مے چکدش

اس نعت کے ساتھ ساتھ یہ نعت بھی ملاحظہ فرمایئے۔ انشاءاللہ یہ نعت جامی کے ہم پلہ ہوگی۔

لولاک ذرۂ زجہانِ محمدؐ است
سبحان من براہ چہ شانِ محمدؐ است
سیپارۂ کلام الٰہی خدا گواہ!
آں ہم عبارتے زِ زبانِ محمدؐ است
نازد بنام پاک محمدؐ کلام پاک
نازم بآں کلام کہ جانِ محمدؐ است
توحیدِ ما کہ نقطۂ پرکارِ دینِ ماست
دانی کہ نکتۂ زبیانِ محمدؐ است

وہی جامی کا سوز و گداز، وہی بیان کی پختگی و شستگی، وہی انداز و طرز بیان۔ کونسی ایسی چیز ہے جو جامی کے ہاں ہو اور یہاں نہ ہو! وحدت الوجود کا بیان شاہ صاحبؒ کی زبانی سنیئے؛

وحدت بہ وجد حالتِ کثرت درآمدہ
حرکت بہ جلوہ، جلوہ بہ حرکت درآمدہ
موسیٰ وطور و وادیٔ ایمن ہمہ حرم
ہر جاکہ دیدہ ایست بحیرت درآمدہ

یہ وہ جاہلانہ وحدت الوجود نہیں جہاں عیسائیوں کی طرح تین میں ایک اور ایک میں تین کے بجائے دو میں ایک اور ایک میں دو یا ایک میں سب اور سب میں ایک، کہا جاتا ہے بلکہ یہ وہ وحدت الوجود ہے نہ جس کے سمجھنے میں دقت پیش آئے نہ جس کے ماننے میں کوئی امر مانع ہو، وحدت کو وجد آیا تو اس نے اپنی صفات کے مظاہرہ کو پھیلا دیا۔ ذات نے صفات کی جلوہ نمائی کی اور جلوہ ذات متحرک ہوا۔ دیدۂ بینا جہاں جہاں تھی وہ حیران رہ گئے۔ اردو میں وحدت الوجود کا مسئلہ آپ نے صرف ایک شعر میں بیان فرمایا ہے۔ زبان و بیان، دیکھیئے کس قدر صاف اور تعبیر کتنی دلکش ہے۔

ذروں سے تا بہ مہر، ستاروں سے تا چمن
عکسِ جمالِ یار کی تابندگی ہے دوست

شاہ صاحبؒ کی چار پسندیدہ چیزیں ملاحظہ ہوں:۔

سخت اگر رو اشود دست دہد سبوئے خویش
از نگہ سمن برے لالہ رخ نکوئے خویش!
باغ و بہار ما ندیم یعنی کہ جنت النعیم
روئے خوش است و خوئے خوش بوئے خوش و گلوئے خوش

غنیمتؔ کنجاہی نے اپنی مثنوی میں پنجاب کی تصویر کشی کی ہے اور شاہ صاحبؒ نے اس تصویر کا دوسرا رخ اسی زمین میں پیش کیا دونوں ساتھ ساتھ ملاحظہ ہوں۔

غنیمتؔ

ندیدم کشورِ غارت گر تاب
بخوبی ہائے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خورده سخاکش آب کوثر
فضائے نشۂ ہستی ہوایش
زمینے کاسہا تہا خاک پایش
بنائے کعبۂ دلہا ز خاکش
عروج نشۂ معنی ز تاکش
غبارش آب و رنگِ چہرۂ گل
بہر جا سبزه از خاکش دمیده
رُخ خوباں بہ پشتش خط کشیده
زلالش بادہ ساز مستی عشق

نسیمش روح بخش ہستیٔ عشق !
گلش بر خاک ہرجا سایہ انداخت
زمیں از آتشِ یاقوت بگداخت
سخا کش سایۂ پرہائے بلبل
جوابِ یک چمن خندیدنِ گل
شفق سرمایۂ چشم از دیدنِ گل
چمن ساماں نگہ از چیدنِ گل
ز شوقِ آں کہ تا آمد بہ پنجاب
دلِ کشمیر صد رہ میشود آب
خنک ہر کس کہ در ہنگامِ سرما
دریں گلشن بود گرمِ تماشا

شاہ صاحب

ندیدم کشورے مردود و مُرتاب
بہ شومی ہائے کفر آبادِ پنجاب
چہ ملکے ننگ و عارِ ہفت کشور
ز شرق و غرب بادش خاک بر سر
خمیرِ طینتش مردم کشی ہا
ز قتلِ مسلمش باشد خوشی ہا
چہ پیرانش مریدانِ فرنگی
لقب کافر و ذاتِ پاک زنگی
ز نواب و رئیسانش چہ پرسی
سگ و سگ زادگان کرسی بہ کرسی

چناں فرزند ناہموار زاید
کہ از خر قیمتش برتر نیاید!
چکد از لالہ اش خون مسلماں
از دنبالاں حجاز و مصر و ایراں
جوانش غلامان فرنگی؛
پناہ شاں بدامان فرنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را معسکر
معسکر را غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب
فرنگی را معسکر ہست پنجاب
فضائش کفر ریز و کفر بیز است
بر آئینِ الٰہی در ستیز است
زمینِ فتنہ زائے فتنہ خیزے

دونوں رخ کس قدر صحیح اور درست ہیں، غنیمت نے جغرافیائی اور عمرانی رخ کا جائزہ لیا ہے اور شاہ صاحبؒ نے پنجاب کے اس زمانے کا سیاسی رُخ دکھایا ہے جب انگریز یہاں حاکم و قابض تھا، دونوں نظمیں عنقریب تاریخ کا باب بننے والی ہیں اور مستقبل کا رخ بتلائے گا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ کس قدر صحیح منظر کشی تصویر کرتے ہیں

—— ۱۳ ——

چند نظمیں اردو میں اکبرؔ کے رنگ کی بھی موجود ہیں جن میں مزاح اور تفنن ہے اور انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر شاہ صاحبؒ خار زار سیاست سے دامن نہ الجھا لیتے تو موجودہ وقت میں اکبرؔ کے صحیح جانشین ہوتے اور جب اتنا اور اس میں اضافہ ہو جائے کہ ان کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ غالبؔ کی طرح شاہ صاحبؒ بھی یہ کہنے

میں حق بجانب ہیں۔

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے!

نہ یہ اشعار اس بنا پر انہوں نے لکھے ہیں کہ واقعی وہ شعر لکھ رہے ہیں اور نہ فن کو انہوں نے کبھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کی حیثیت محض تبرکات اور تاریخ کے گم ہو جانے والے اوراق کے لئے صرف یادداشت کی ہے اور بس!

—— ۱۴ ——

خداداد خطابت میں جو کام شاہ صاحب عمر بھر کرتے رہے اس کا خلاصہ دو لفظوں میں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ حضور خواجۂ دو سرا صلعم کی مدح و ثنا۔

۲۔ حضورؐ کے دشمنوں سے نہ ختم ہونے والا دائمی جھگڑا۔

شاہ صاحبؒ کی شاعری کا سرمایہ بھی یہی دو باتیں ہیں اور یہ آفتاب کو چراغ دکھانے والا سلسلہ ہے آپ کے چند نعتیہ شعروں کو پیش کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ براہ راست نورِ آفتاب سے مستنیر ہو سکیں۔ چراغ تلے تو آپ کو معلوم ہے ہمیشہ اندھیرا ہی ہوتا ہے اور دیر تک اندھیرے میں بھٹکتے رہنا بھلے لوگوں کا کام نہیں۔

نعت کا مطلع ملاحظہ فرمائیے:

چہ جلوہ ایست کہ آسودہ در بر خاک است
کہ ذرّہ ذرّہ طرب ریز و بس طربناک است

دوسرے مطلع کی بلندی دیکھیے:

بیا کہ با تو سخنہا ز حرفِ لولاک است
بیا کہ با تو حکایت ز قدرِ افلاک است

نعت گو شاعروں کے ہاں حدیث لولاک لما خلقت الافلاک کا بیان عام ہے اور ہر شخص حضورؐ کی مدح و ثنا میں اس کا ذکر کرتا ہے مگر کسی نے آج تک اس کی یوں تجزی نہیں

کی کہ اللہ نے ما خلقت الارض نہیں فرمایا بلکہ ما خلقت الافلاک فرمایا ہے۔ اور اس میں کیا نکتہ ہے۔

اگر یہ تجزی پہلے معہود ہوتی تو یہ مطلع تھا۔ مگر چونکہ یہ کام پہلے پہل آپ نے کیا ہے اس لئے دوسرے مطلع سے پہلے ایک شعر میں اس طرح توجہ فرماتے ہیں کہ:

نگفت خالقِ مطلق کہ ما خلقت الارض
مقامِ فکر و تامل حدیث لولاک است

اس شعر کے بعد دوبارہ شاہ صاحبؒ کا مطلع ثانی پڑھ کر دیکھئے تاکہ آپ "قدر افلاک" کی قدر پہچان سکیں۔ بے شک افلاک کی قدر بہت بڑی ہے مگر اب زمین کی قدر کی افزائش بھی قابلِ غور ہے:۔

مقام و منزلِ قرآن و انبیاء گردید
بہ مشتِ خاک بنازم چہ رتبۂ خاک است

سبحان اللہ۔

زمیں کو اس ترقی پر فلک سے داد ملتی ہے
فلک کیا عرشِ باری سے مبارکباد ملتی ہے

شورش کاشمیری

اقبالؒ و بخاریؒ

"اج او ہوندا، تے اینہاں کرگساں نوں دسدا کہ بخاری غدار اے کہ فداکار، میں کنوں کواں، میرے تے ساتھی ای میرے کولوں وچھڑ گئے تے یا پچھڑ گئے نیں"۔

علامہ اقبال کا ذکر ہو رہا تھا، شاہ جی نے اک سرد آہ بھری، اور کہا

"اقبال زندہ ہوتا تو ان کرگسوں کو بتاتا کہ بخاری غدار ہے یا فداکار، میں کسے کہوں کہ میرے ساتھی ہی مجھ سے بچھڑ گئے اور پچھڑ گئے ہیں۔"

شاہ جی فرماتے تھے جب کبھی میں اُن کے ہاں حاضر ہوتا وہ چارپائی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھے ہوتے، حقہ سامنے ہوتا، دو چار کرسیاں بچھی ہوتیں، صدا دیتا، یا مرشد۔ فرماتے

"آ بھئی پیرا بہت دناں بعد آیا ایں" (بہت دنوں بعد آئے ہو)

علی بخش سے کہتے حقہ بے جاؤ تے کلی کے لئے پانی لاؤ، کلی فرماتے، پھر ارشاد ہوتا، ایک رکوع سناؤ، میں پوچھتا! کوئی تازہ کلام؟ فرماتے، ہوتا ہی رہتا ہے، عرض کرتا لایئے، کاپی منگواتے، پہلے رکوع سنتے، پھر وہ اشعار جو حضورؐ سے وابستہ ہوتے، قرآن پاک سنتے وقت کا رنگ اور ہوتا، لیکن جب حضورؐ کا ذکر ہوتا تھا یا ان سے متعلق کلام پڑھا جاتا تو چہرہ اشکبار ہو جاتا حضورؐ کا ذکر ہمیشہ باوضو شخص سے سنتے اور خود ان کا نام بھی باوضو ہو کر لیتے تھے۔ حضورؐ

کے ذکر پر اس طرح روتے جس طرح ایک معصوم بچہ ماں بغیر روتا ہے۔

* * *

افراد و اشخاص و واقعات و حالات کے بارے میں ان کا تجزیہ بڑا حیرت انگیز طور پر درست ہوتا تھا۔ شاہ جی کا بیان ہے کہ مجھ سے اکثر لوگوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے اور ان کی سیرتوں کا اجمالی خاکہ پیش کرتے۔ سرکار کی بیشتر باتیں انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچی تھیں۔ پہلے خود ہی طرح دیتے، پھر، فقرہ ازفرماتے ”بھائی دلی دروازے کے باغ میں لوگوں کو بتا دوگے!“ پھر تیا بھی دیتے، فرماتے، اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ لطف یہ تھا کہ اپنے سبھی معتقدین کو بتاتے چلے جاتے اور سبھی کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنے تک محدود رکھنا اور جب بات بکھر جاتی تو فرماتے تم لوگ راز نہیں رکھ سکتے ہو؟ عرض کی جاتی کہ آپ ہی نے تو فلاں فلاں کو بتایا ہے، پھر مسکراتے ”اچھا تو عام ہو جانے دو، اس میں راز کی کونسی بات ہے۔“

* * *

ایک دفعہ (بروایت شاہ جیؒ) جلسوں کی رونق پہ گفتگو کرتے رہے کہنے لگے عامۃ المسلمین میں بڑی جان ہے، اس قوم کا مزاج حرارت سے بنا ہے، یہ بجھنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ ساری خرابی لیڈر شپ کی ہے، خواص تو غیر متعلق ہیں، انہیں اپنے جسم کا عیش چاہیئے، لیڈر گم کردہ راہ ہیں، لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لاتے، عرض کیا حضرت یہ بھی آپ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے، قوم خود ہی صحیح راہ پر نہیں آتی ہے ___ آپ کے لئے عامۃ المسلمین کس طرح تڑپتے ہیں لیکن آپ جی میں لاتے ہی نہیں۔

”نہیں پیرجی! یہ بات نہیں ___ میرا جی میری کتابیں ہیں، میں ہجوم و افکار میں اس طرح گھرا رہتا ہوں کہ بسا اوقات فرصت کے اوقات ہی تنہا ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے“

”او شاہ جی تساں تے دلاں تے دماغاں دی مٹی جھاڑ دے او۔“

(شاہ جی آپ تو دلوں اور دماغوں کی گرد جھاڑتے ہیں)

شاہ جی نے یہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا [illegible] الفاظ تھے جدید

دانش اور قدیم حکمت کا نقطۂ معراج چونکہ میاں جی سے محبت کرتے تھے اس لئے اللہ نے ان پر علم و دانش اور فکر و نظر کے سبھی راستے کھول دیئے تھے۔ وہ میدان کا کھلاڑی نہیں تھا، لیکن علم اس کا خانہ زاد تھا۔

٭ ٭ ٭

آج جو پشتینی وفادار — شاہ جی نے فرمایا اس کا نام لے لے کر اس کے ہمنشینوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا رہے ہیں، کسی علمی مسئلے پر اقبال نے کبھی ان سے مخاطبت کی؟ کبھی ان سے کوئی دینی سوال کیا، کبھی ملی امور پر ان سے از خود گفتگو کی، کبھی مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ان سے زیر بحث لاتے رہے؟ ان کے ساتھ تو ان کے زیادہ سے زیادہ اس قسم کے مجلسی روابط تھے۔

شاہ جی نے کہا — یہی وہ لوگ، جو اقبال کی راہ میں ہمیشہ مزاحم ہوتے رہے، انہی لوگوں نے اقبال کے خلاف مخبریاں کی تھیں اور انہیں کسی منصب پر فائز نہیں ہونے دیتے تھے، اقبال نے مجھ سے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا تھا۔

شاہ صاحب ان خاندان فروشوں کی سیاہ دلی کی حد ہو گئی، خوفِ خدا سے بھی عاری ہو چکے ہیں میرے بارے میں ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور گورنر صوبہ کو عرضداشت بھجوائی ہے، جس میں مجھے ایک ایسے ذوق سے متہم کیا ہے جس کا تصور ہی شرافت کو مرجھا دینے کے لئے کافی ہے۔

شاہ جی نے بتایا، یہ بیان کرتے ہی ان کا بدن کانپنے لگا کہ انسان مخالفت اور مخاصمت میں کس حد تک سنگدل، سیہ رو اور گندہ ضمیر ہو جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭

شاہ جی کی روایت ہے کہ فرنگی دشمنی سے ان کے خون کا قطرہ قطرہ انگاروں میں ڈھلا ہوا تھا، وہ یورپی تہذیب، یورپی دانش، یورپی سیاست اور یورپی سب چیز کے سخت دشمن تھے کہا کرتے تھے کہ قوم کی خودی اپنی قیمت کھو بیٹھی ہے، لوگ علم کی سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر نٹوں کا تماشا دیکھنے میں غلطاں ہیں۔

کاسہ لیس خاندان کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے، یہ طنطنہ میں نے صرف انہی میں دیکھا کہ

جو سے نفرت کرتے، انہیں اپنے گھر میں بھی گھسنے نہیں دیتے تھے اور اگر کوئی کسی بہانے چلا آتا تو اسے دھتکار کر نکال دیتے، ور نہ منہ نہیں لگاتے تھے۔

ایک دفعہ فرمایا، شاہ جی میں مطمئن ہوں کہ میرا کلام لوگوں کے رگ و پے میں اتر رہا ہے لیکن ابھی کارواں تیار ہو رہا ہے، ابھی کارواں بنا نہیں ــــ سفر، راستہ اور منزل تو دور کی چیز ہے جب تک مشرق، مغرب کی ذہانت کو للکارے گا نہیں، اس وقت تک مشرق کی عظمت کا سورج نہ کبھی ابھر سکتا ہے اور نہ اُس کے نصف النہار پہ پہنچنے کا سوال ہی زیرِ غور آ سکتا ہے۔

شاہ جی یہ عموماً فرماتے :

"کاش اقبال آج زندہ ہوتے ان کا دماغ ایک عظیم الشان تنہائی کا عظیم الشان کتب خانہ تھا، جب کبھی ان کی ہم نشینی کا موقع ملتا معلوم ہوتا تھا کہ لالہ زار کھل گیا ہے۔

حافظ لدھیانوی

عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کے چند پہلو

بعض مجالس ایسی ہوتی ہیں جو زندگی کی حسین یادگاریں بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ مجالس ان علماء و ادباء کی ہوتی ہیں جن کا ہر لفظ سراپا علم، ہر فقرہ ادب پارہ اور ہر بات اس دور کی تاریخ بن جاتی ہے یعنی گفتگو ہو یا علمی تبصرہ، سیاست کا عنوان ہو یا دینی مسائل پر اظہار خیال، موضوع گفتگو چاہے کچھ بھی ہو ان کے ایک ایک جملے سے علم و ادب کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں ہر جملہ ان کے حسن مذاق اور ژرف نگاہی کا نادر نمونہ ہوتا ہے۔ ایسی مجالس میں شرکت ادب عالیہ کی درجنوں کتابوں کی صحبت سے زیادہ مفید ہوتی ہے۔ مجھے زندگی میں چند علماء کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں کی محفلوں میں شمولیت کا موقع بھی نصیب ہوا ہے مگر جو لطف، جو کیف سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی صحبت میں نصیب ہوا ہے وہ اور کہیں نصیب نہیں ہوا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ اگر سیاست کی بات ہو ان کا انداز فکر جداگانہ، دین کی بات ہو اُن کا طرز بیان سب سے الگ، شاعری کی بات ہو ان کا سوچ کا انداز سب سے الگ ان میں بھرپور انفرادیت ہے۔ وہ ہر مسئلے کو اپنے زاویۂ نگاہ سے سوچتے ہیں۔ شاعری اور ادب کا ذکر ہو ان کی نظر شاعر کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے۔ وہ شعر کو ایسے حسین معنی پہناتے ہیں کہ سننے والا بیخود و مسحور ہو کر رہ جاتا ہے

میں نے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ عصر حاضر کے ممتاز شعراء کو شعر سنائے بھی ہیں اور ان کے کلام سے مستفیض بھی ہوا ہوں۔ مگر شعر فہمی سخن شناسی اور مضمون آفرینی کا جو جوہر شاہ جی کی ذات میں دیکھا وہ کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

شاہ جی کے داد دینے کا انداز سب سے نرالا اور مختلف ہے۔ شاہ جی شعر سُن رہے ہوں تو شاعر ان کی آنکھوں کی سجاوٹ اور ہونٹوں کی بناوٹ سے شعر کا معیار پرکھ سکتا ہے۔ شعر کے معنی ان کے چہرے پر بکھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسی حسین داد ہے جو وہی شخص دے سکتا ہے جو شعر کی روح سے واقف ہو اور شعر کی نزاکت سے کماحقہٗ آگاہ ہو۔ لطافتِ شعر بے ہنگم داد کی تو متحمل نہیں ہو سکتی۔ شاعری کے سلسلے میں مَیں شاہ جی کی پسند کو سند سمجھتا ہوں۔ شعر گوئی شعر فہمی سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ میں نے بہت سے شعراء کو شعر فہمی کے سلسلے میں بالکل کورا پایا ہے۔

شعر فہمی کی صلاحیت کا تعلق ایک خاص اندرونی کیفیت سے ہے۔ یہ وجدانی کیفیت ہر شخص کا ورثہ نہیں اس کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت درکار ہے۔ شاہ جی کو خُداوند کریم نے اس نعمت سے وافر حصّہ عطا فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے مستند شاعر شاہ جی کو شعر سنانا اپنے لئے باعثِ صد فخر تصور کرتے ہیں، ان کی نجی محفلوں میں ہر ذوق کے آدمی کے لئے سرمایۂ حیات موجود ہوتا ہے۔ دین کی بات ہو وہ علماء کے میں واجب الاحترام ہیں۔ اسی لئے ہر مدرسۂ فکر کے آدمی کو شاہ جی سے بے پناہ عقیدت رہی ہے۔ ایک دفعہ شاہ جی نے فرمایا تھا کہ بچپن پٹنہ عظیم آباد میں گزرا۔ شاد عظیم آبادی جیسا قادر الکلام شاعر بھی محاورہ اور روزمرہ کی تصحیح کے لئے ہمارے گھرانے کی طرف رجوع کرتا تھا۔ زبان کی بات چل نکلے تو شاہ جی فرمایا کرتے ہیں کہ میں نے جہاں بھی تقریر کی ہے اہلِ زبان اور اہلِ علم حضرات سے داد وصول کی ہے۔ لکھنؤ میں جلسہ ہو یا دہلی میں میری زبان کو سب نے مستند مانا ہے۔

شاہ جی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں کہیں تقریر کے لئے تشریف لے گئے ہیں اس علاقے کی زبان ہی میں نہیں بلکہ انہی کے لب و لہجے میں کئی کئی گھنٹے تقریر

کی ہے۔ ایک مقرر کا اس سے زیادہ کمال کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بات کو سامعین کی اپنی زبان اور لب و لہجے میں سمجھا سکے۔

شاہ جی جس جذبے، ذوق و شوق اور وجد آفریں قرأت سے کلام پاک کی تلاوت فرماتے ہیں یہ انہی کا حصہ ہے۔ جس نے ایک دفعہ شاہ جی سے کلام پاک سُنا اس کی حلاوت اور اس کا کیف اسے تمام عمر رہا۔ میں نے ایک دفعہ شاہ جی سے کلام پاک سنانے کے لئے درخواست کی۔ فرمانے لگے حافظ بیٹے اب وہ بات کہاں، دانت نکل چکے، آواز ساتھ نہیں دیتی۔ نقاہت بہت بڑھ گئی ہے۔ پھر بڑے جذبے کے ساتھ فرمانے لگے۔ ہاں کبھی قرآن پاک پڑھا کرتا تھا ہندو میرا قرآن پاک سننے آتے تھے اسی ضمن میں شاہ جی نے ایک واقعہ بیان فرمایا۔

دہلی میں ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ اکابرین ملت اور زعمائے کرام تشریف فرما تھے۔ مجمع کسی مسئلے پر متفق نہ تھا۔ مخالف گروہ کی اکثریت تھی۔ وہ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لئے بپھرے ہوئے تھے۔ کسی کی تقریر سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جب یہ حالت دیکھی تو مجھے تقریر کے لئے فرمایا۔ میں تا حد نظر امڈے ہوئے سیلاب کو دیکھ رہا تھا مگر حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت شروع کی، مجمع خاموش ہو گیا۔ قرآن پاک تلاوت نے ہزاروں زبانوں کو خاموش کر دیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کلام پاک کی تلاوت کرتا رہا۔ سارے پنڈال میں سناٹا تھا اور میں باری تعالیٰ کی آخری کتاب کی تلاوت کر رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں سے مخالفت کا غبار دھلتا نظر آیا۔ جذبات کے شعلے مدھم ہوتے نظر آئے لوگ بات سننے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ خدا کا نام لے کر تقریر شروع کی کئی گھنٹے تقریر کی اور اپنا نقطۂ نظر مخالفین سے منوا لیا۔ وہی مجمع جو کچھ عرصہ پہلے زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے آیا تھا زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ ایسے کئی معرکے ہیں جو شاہ جی نے سر کئے جن کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔

شاہ جی کا سب سے بڑا کمال حاضر جوابی ہے۔ جلسے میں کیسا ہی سوال کیوں نہ ہو شاہ جی نہایت سکون اور فصاحت کے ساتھ اس کا جواب دیتے ہیں کہ سائل

کرنے والے کی تشفی ہو جاتی ہے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی راوی ہیں کہ ڈیرہ غازی خاں میں ایک عظیم الشان اجتماع ہوا۔ اس علاقے کے لوگ مزاروں سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ شاہ جی کی تقریر کے آغاز میں کسی نے مزاروں کے متعلق سوال کر دیا قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ میں حیران تھا کہ شاہ صاحب اس نازک مرحلے سے کیسے نکلیں گے۔ اگر مزاروں کے خلاف کچھ کہتے ہیں تو لوگ برافروختہ ہوتے ہیں مگر شاہ جی نے فوراً جواب میں کہا کہ ایک مزار اقدس میرے آقا، میرے ہادیؐ کا مدینہ طیبہ میں بن چکا اب دوسرا مزار شرک فی النبوۃ ہے فضا زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

شاہ جی کی تقریر مزاج کو بدل دیتی ہے، نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے اعتقادات میں انقلاب لے آتی ہے۔ یہ زور بیان اور حسن خطابت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جس کے راوی میرے محترم دوست جناب اعجاز چشتی ہیں۔ یہ ان کے کالج کے زمانے کی بات ہے۔ راولپنڈی میں شاہ جی کی تقریر تھی۔ گارڈن کالج کے کچھ کمیونسٹ ذہن کے طلباء کو شاہ جی سے اختلاف تھا وہ ان کی تقریر سننے کے لئے تیار نہ تھے چشتی صاحب نے کسی نہ کسی طرح ان کو تقریر سننے کے لئے آمادہ کر لیا۔ جلسہ گاہ میں ہزاروں کے مجمع میں سب سے زیادہ آنسو بہانے والے یہی لوگ تھے۔

مسلسل سفر اور لگاتار تقریروں نے شاہ صاحب کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ وہ بہت مضمحل سے تھے ان کی جسمانی صحت جواب دینے لگی۔ شاہ جی فرمایا کرتے ہیں کہ میلوں پیدل سفر کیا ہے، کبھی تانگوں میں سفر کرنا پڑا۔ تقریر صبح کہیں ہے تو شام کہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ہزاروں ہجوم کے اشتیاق کے پیش نظر کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ اور جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ گھنٹوں تقریر کی۔ بیٹھ کر تقریر کرنے میں لطف نہ آتا تھا۔ دس دس گھنٹے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ تندرستی ایسی تھی کہ لوگ رشک کرتے تھے۔ مگر مسلسل مشقت ذہن و جسم پہ آہستہ آہستہ اپنا اثر کرتی رہی۔ قید و بند کی صعوبتوں اور جسمانی مشقت نے جسمانی حالت زیادہ خراب کر دی۔ مگر ایک ہی دھن تھی، ایک ہی لگن تھی کہ حضور اکرم صلعم کے ارشادات اور پیغامات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دوں تاکہ میری نجات ہو سکے۔

ایک دفعہ کا واقعہ بیان فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ جالندھر خیر المدارس میں جلسہ تھا۔ مدرسے کی سالانہ تقریب تھی۔ جمعہ کا دن تھا مسجد میں جگہ ناکافی ثابت ہوئی۔ اس لئے کمپنی باغ میں انتظام کیا گیا۔ میں نے ابھی خطبۂ مسنونہ تلاوت کرنا شروع ہی کیا تھا کہ کسی نے شہد کی مکھیوں کا چھتہ چھیڑ دیا۔ مجمع منتشر ہونے لگا۔ میں نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا پتھروں کی طرح جم جاؤ۔ لوگ جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے۔ شہد کی مکھیوں نے میرے چہرے پر ڈنک مارنا شروع کیا۔ میرا تمام چہرہ مکھیوں سے بھر گیا۔ اور میں اسی حالت میں بغیر جنبش کے خطبہ پڑھتا رہا۔ آخر ایک مکھی نے میری آنکھ کے کونے میں ڈنک مارا۔ مجھے جھرجھری سی آئی۔ مجمع میں سے ایک آدمی نے دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے سے مکھیوں کو اتارا۔ شدت کا بخار چڑھا۔ منہ سوج گیا۔ اسی حالت میں لدھیانہ پہنچا۔ راقم الحروف بھی اسی جلسے میں شریک تھا شاہ جی کا چہرہ متورم تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تقریر فرما رہے تھے۔ جب مولانا تقریر ختم کر چکے تو شاہ جی نے مولانا کو فرطِ عقیدت و محبت سے کرسی سمیت اٹھا لیا۔ اور مجمع کو مخاطب کر کے فرمانے لگے مجھے ایک سال کی تقریروں کے موضوع مل گئے۔

شاہ جی کو علمائے دین اور بزرگانِ دین سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ جب مولانا احمد علی صاحب احرار کے دفتر میں تشریف لاتے شاہ جی سروقد تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے اور جب تک مولانا خود ارشاد نہ فرماتے تشریف نہ رکھتے۔

پچھلے چند برس سے شاہ جی کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے ذیابیطس کے موذی مرض نے شاہ جی کی صحت کو بہت گرا دیا ہے۔ بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ اب وہ شخص خطوط کے جواب دینے سے معذور ہے جو کبھی چاندنی رات میں مطالعہ کیا کرتا تھا۔ پاؤں متورم ہو چکے ہیں مگر اس حالت میں بھی اس شخص کی شگفتہ مزاجی اور محفل آرائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

شاہ جی مجلسِ احباب میں مختلف موضوعات پر اپنے خداداد انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا کرتے ہیں۔ شاہ جی کے گرد آٹھوں پہر عقیدت مندوں کا جمگھٹا

لگا رہتا ہے۔ ملتان کے دو سال کے قیام میں گھنٹوں شاہ جی کی صحبت میں رہتا اور اپنا دامن گل ہائے رنگا رنگ سے بھرتا رہتا۔ ان صحبتوں میں شاہ جی کے ذاتی جوہر مجھ پر کھلے میں نے اس مدت میں شاہ جی کی زبان سے کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔ وہ دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے، کسی کے منہ سے کسی کی برائی سننا گوارا نہ کرتے اور اپنے بدترین دشمن کا بھی ذکر کرتے ہوئے اخلاق کا دامن ہاتھ نہ چھوڑتے۔ یہ عالی ظرفی، بلند حوصلگی کی خصوصیت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ یہ ان کی وسیع القلبی اور بنی نوع انسان سے بے پناہ محبت کی دلیل ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا اُن کا قرب میرے لئے زندگی کے مختلف شعبوں میں درس ہدایت ہے۔ کسی کی دلآزاری ان کا شیوہ نہیں صلح کُل ان کا مسلک ہے وہ حسنِ اخلاق اور شگفتہ مزاجی کی وجہ سے ہر ایک کے دل میں گھر کر لیتے ہیں اور ایک ہی ملاقات زندگی بھر کے تعلقات کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ میں نے شاہ جی کو ایک لاثانی خطیب، ایک شعلہ بیان مقرر، ایک محفل آرا شخصیت، ایک بلند پایہ ادیب اور ایک جیّد عالمِ دین کے علاوہ ایک بلند کردار اور راست باز آدمی بھی پایا۔ ملنے والے وقت بے وقت آتے ہیں مگر شاہ جی ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور خیر و عافیت پوچھتے ان کے فہم و ادراک کے مطابق ان سے گفتگو کرتے میں نے ان کے منہ سے جھوٹی بات کبھی نہیں سنی، وہ اس بات یا روایت کو کبھی بیان نہ فرماتے جس کی صحت میں انہیں ذرہ بھر بھی شک ہوتا۔

شاہ جی ابتداءً پیر مہر علی شاہ صاحب سے بیعت تھے۔ ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے حلقۂ ارادت میں عصرِ حاضر کے چوٹی کے علماء شریک رہتے ہیں۔ اور ان سے روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔ شاہ جی باوجود علالت کے ہمیشہ حضرت کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور ان کا قرب سرمایۂ زندگی سمجھتے شاہ جی کو بزرگانِ دین کی عقیدت کی وجہ سے مختلف سلسلوں سے فیض پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خلقت شاہ جی سے عقیدت رکھتی ہے۔

غالباً ان کی سیاسی زندگی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ ایک دفعہ شاہ جی شرقپور

حضرت شیر محمدؒ سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے ملاقات کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ حضرت اپنے حجرے میں تشریف لے جا چکے تھے۔ خدام نے عرض کی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ شاہ جی لاری کے اڈے پر واپس تشریف لے گئے۔ حضرت شیر محمد اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ عطاء اللہ شاہ نام کا کوئی آدمی ہے؟ خدام نے عرض کی چونکہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لئے واپس تشریف لے گئے انہوں نے یہ سن کر شاہ جی کو واپس بلوایا، بغل گیر ہوئے اور فرمایا تمہارا مرتبہ بہت بلند ہے بہت اونچا ہے۔ الفاظ دہراتے جاتے اور اپنا ہاتھ اونچا کرتے جاتے پھر بیٹھ ٹھونک کر رخصت کیا۔

روحانی فیض ان کو اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ جو اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ شاہ جی اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے ہیں، اس زمانے میں بیحد وظائف کئے۔ طبیعت میں بہت جلال تھا، جب میں کسی راستے سے گزرتا تو مجھے درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی ہوئی نظر آتیں۔

ہر مرحلے پر شاہ جی کے لئے ہزاروں دلوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔ کوئی کٹھن وقت آتا ہے تو ہزاروں عقیدت مند شاہ جی کی صحت اور زندگی کی دعائیں بارگاہِ رب العزت میں کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں شاہ جی کی زبانی ایک واقعہ سنا تھا۔ شاہ جی نے فرمایا لودھارام والا کیس چل رہا تھا، میں ایک رات جلسے سے تقریر کر کے آیا۔ ایک بوڑھی عورت راستے میں لکڑی سے ٹیک لگائے میری منتظر کھڑی تھی۔ جیسے ہی میں قریب سے گزرا اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں قریب گیا اور سلام کیا۔ کہنے لگی عطاء اللہ تیرا ہی نام ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ دعائیں دینے لگی پھر کہنے لگی؛ شاہ میں نے اس بوڑھی جان کے ساتھ سینکڑوں نوافل پڑھ کر تیری زندگی کے لئے دعا کی ہے کہ یہ حق کے لئے لڑ رہا ہے۔ تیرے رسولؐ کی ناموس کے لئے زندگی کی بازی لگا چکا ہے اس کو زندگی دے، تندرستی دے۔ شاہ جی فرمانے لگے کہ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری ہوئی۔

شاہ جی کی صحبتوں میں بے شمار واقعات سُنے، شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ جب لاہور یا کسی دوسرے مقام سے کوئی شاعر عالم یا ادیب آتا تو شاہ جی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ ملتان میں شاہ جی کی صحبتیں ایسی تھیں جیسے لق و دق اور بے آب و گیاہ صحرا میں درماندہ رہرو کو سرد و شیریں پانی کا چشمہ میسر آ جائے۔ مگر یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اور میرا تبادلہ پھر لائل پور ہو گیا۔

جھنگ کے قیام کے دوران اطلاع ملی کہ شاہ جی کی طبیعت زیادہ خراب ہو چکی ہے فالج کا پھر حملہ ہوا۔ اطلاع ملتے ہی شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عصر کا وقت تھا بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ سید عطاء المومن پاس بیٹھے تھے۔ معذرت چاہی کہ بے وقت حاضر ہو گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ وقت اوراد و وظائف کا ہے۔ مگر آپ کی صحت کے متعلق تشویش ناک خبر سنی۔ سیدھا چلا آیا۔ میری پریشانی اور اضطراب نے مجبور کر دیا کہ آپ کو ایک نظر دیکھ لوں پھر کہیں قیام کروں گا۔ زبان پر فالج کا اثر تھا رک رک کر گفتگو فرمانے لگے۔ انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے۔ انگلیاں کام نہیں کرتیں وظائف ختم ہو چکے ہیں، یادداشت کام نہیں کرتی۔ صحت جیسی ہے تم دیکھ رہے ہو۔ اللہ کا شکر ہے شکوہ کس کا کروں۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں نہیں کیں۔ اس نے اگر ساتھ چھوڑ دیا ——— اس کا کیا قصور۔ یاد رکھو اگر کوئی حکومت رعایا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گی تو رعایا ایک نہ ایک دن بغاوت کر دے گی۔ پھر جسم کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے۔ میں نے اپنی رعایا کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا اس نے بغاوت کر دی اتنی سی مختصر گفتگو کے بعد شاہ جی تھک چکے تھے۔ پھر کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس دوران میری نظروں کے سامنے وہ تمام جلسے پھر گئے جن میں شاہ جی کی سحر بیانی دیکھی تھی۔ اور ان جلسوں میں شاہ جی کی بے پناہ قدر و منزلت اور احترام دیکھا تھا۔ شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے دوسرے شہروں سے لوگ گروہ در گروہ آتے اور سینکڑوں لوگ میلوں سفر طے کر کے جلسے میں شریک ہوتے۔ تقریر سے گھنٹوں پہلے لوگ اسٹیج کے قریب جمع ہونا شروع ہو جاتے تاکہ شاہ جی کو دوران تقریر دیکھ بھی

سکیں۔ مشتاقانِ دید ہمہ انتظار بنے ہوئے بیتابی کے ساتھ شاہ جی کی آمد کا انتظار کرتے اور ہزاروں نگاہیں اسٹیج کی طرف شاہ جی کے دیکھنے کو اٹھتیں۔ شاہ جی شاہانہ طمطراق کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوتے۔ ننگی تلواروں کی سلامی دی جاتی۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ شروع کیا اور جلسہ گاہ میں موت کی خاموشی طاری ہو گئی علماء الگ مسحور ہو رہے ہیں انگریزی داں طبقہ الگ جھوم رہا ہے اہلِ ہنود شاہ جی کی تلاوت قرآن ذوق و شوق اور محو حیرت سے سن رہے ہیں۔ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہمہ تن گوش ہیں۔ ہزاروں نگاہیں شاہ جی کی سحر بیانی اور آتش نوائی اپنے اوجِ کمال پر ہے۔ شاہ جی موضوع کی ہیئت اور موقع کے مطابق قرآن پاک کی آیات وجد آفریں قرأت کے ساتھ تلاوت فرما رہے ہیں۔ تقریر کے دوران برمحل فارسی اور اُردو کے منتخب اشعار ترنّم کے ساتھ پڑھتے جاتے ہیں ہزاروں کے مجمع میں سانس تک کی آواز نہیں ایک ہی آواز ہے جو دلوں میں گھر کرتی اور روح میں سماتی چلی جاتی ہے۔ شاہ جی لوگوں کے جذبات اور چہروں سے عنوانات چُن رہے ہیں۔ شاہ جی کا ہاتھ لوگوں کی نبضوں اور دھڑکتے دلوں پر ہے۔ وہ بے پناہ ہجوم کے جذبات کا دھارا جس طرف چاہتے ہیں موڑ لیتے ہیں۔ مخالفین کے منہ سے واہ واہ نکل رہی ہے، احباب مجسمہ ایثار ہیں اور یہ مردِ مجاہد اپنے مخصوص انداز میں خدا و رسولؐ کے احکامات و پیغامات لوگوں تک پہنچا کر سرخرو ہو رہا ہے۔ رسول اکرمؐ کے ناموس کے تحفظ کے لئے شاہ جی سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں ضلالت و گمراہی کا بازار گرم ہے حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ دینِ الٰہی کا سپاہی ان سب سے نبرد آزما ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے شاہ جی کے عشقِ رسولؐ سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے   بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

شاہ جی کے الفاظ میں شبنم کی تری، شاخِ گل کی لچک بلبل کا زمزمہ ستاروں کی خنک روشنی، بہاروں کا حسین جمال ہے اور بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، سمندر کا تیز طوفان، تیز آندھی کا زور اور شاہیوں کا جلال بھی — وہ موضوع کے مطابق لب و لہجہ

اور اندازِ تقریر سے بیان کو سنوارتے اور نکھارتے ہیں الفاظ ہیں کہ پرا باندھے چلے آتے ہیں۔ ندی ہے کہ بہاؤ پر ہے خطابت کا سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور اس سمندر کی ہر موج دلوں اور ذہنوں کو بہائے لئے جا رہی ہے۔ فرطِ جذبات سے لوگ مشتعل ہو رہے ہیں۔ اور ہر دس منٹ کے بعد فلک شگاف نعروں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں امیرِ شریعت زندہ باد، عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعرے ہزاروں زبانوں سے بیک وقت بلند ہو رہے ہیں۔ میں اس فضا میں کھویا ہوا تھا۔ میں اس دور کو تصور کی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا تھا کہ ان درخشندہ تصورات کا سلسلہ شاہ جی کی مدھم آواز سے ٹوٹا۔ یہ تمام نقشے یہ تمام معرکے، تمام ہنگامے آن واحد میں غائب ہو گئے۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹا میں نے اس سحر بیان مقرر اور شیریں مقال خطیبِ شعلہ نوا اور آتش عالمِ دین کو اس حالت میں دیکھا جس کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔ جس کی زبان سے گفتگو بمشکل ہو رہی تھی جس کے قوائے جسمانی و ذہنی کمزور ہو چکے تھے جس کی بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ جو ٹوٹے پھوٹے کچے کرایہ کے مکان میں مکین تھا جس کی دینی خدمات کا صلہ عزلت و تنہائی اور جد وجہدِ آزادی کا انعام مسلسل پریشانی اور کس مپرسی تھا۔ وہ جس کی صحت کبھی باعث صد رشک تھی۔ آج وہ اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھا۔ آج اس کے جوڑ جوڑ اور نس نس میں ضعف صدی کی تکان اور شقت شامل تھی جس کا ذہنی اثاثہ کافی حد تک لٹ چکا تھا جس کا جسمانی سرمایہ آہستہ آہستہ گھٹ رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ماضی کی درخشندہ تصاویر حال کے چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ چوکھٹا کتنا دیمک خوردہ تھا۔ کتنا بے رنگ و بے کیف تھا۔ یہ حال کا چوکھٹ ماضی کے تابندہ نقوش و خطوط پر اپنا گہرا سایہ ڈال رہا تھا۔ تحیر کی اس زنجیر کو پھر شاہ جی کی گفتگو نے توڑا۔ شاہ جی نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا اور ایک لمبی آہ بھر کے فرمانے لگے یاد داشت کافی حد تک جواب دے چکی ہے، بات کرتے کرتے بھول جاتا ہوں۔ جب کوئی بات یاد نہ آئے تو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ میں خاموش شاہ جی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کتنا بڑا المیہ

ہے کتنا اندوہناک واقعہ ہے۔ وہ شخص جس کے ذہن میں سینکڑوں احادیث، پورا کلام پاک اور لاتعداد عربی اور فارسی کے الفاظ تھے اور وہ اس بے بہا قدرت کے عطیے اور سرمائے سے جب چاہتا جس وقت چاہتا حافظے کی قوت اور یادداشت کے سہارے استفادہ کر سکتا تھا۔ آج وہ شخص روزمرہ کی باتیں بھول جاتا ہے اس کے ذہن پہ کیا قیامت گزرتی ہوگی۔ آج وہ گفتگو سے عاجز چلنے پھرنے سے لاچار ملتان کے ایک کوچے میں خاموش پڑا رہتا ہے جس کی محفلیں ہر مذاق کے آدمی کے لئے ذوق وشوق کا انمول سرمایہ ہوا کرتی تھیں آج وہ ان محفلوں کو خود ترس گیا ہے۔ ایک دفعہ شاہ جی نے ایک طویل نشست کے دوران فرمایا تھا۔ حافظ صاحب! یہ کوئی زندگی ہے زندگی کا بیشتر حصہ علماء کی صحبت میں گزرا۔ پیر مہر علی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی سے ایک عمر رفاقت رہی۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی زندگی کے ساتھی تھے مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم اور دوسرے جید علماء کی صحبتیں میسر آئیں ان میں سے زیادہ تر اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے۔ یہ لوگ علم و عمل میں یکتا تھے۔ یہ لوگ جہاں دین مصطفوی کی تبلیغ واشاعت کے بہت بڑے علمبردار تھے وہاں غلامی کے طوق کو اتارنے میں بھی ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ادیبوں اور شاعروں میں ظفر علی خاں مرحوم تاثیر مرحوم، چراغ حسن حسرت مرحوم، مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، مولانا گرامی مرحوم، مولانا غلام رسول مہر، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض میری مجلسوں کی زینت اور میری ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ پھر ایک لمبی آہ بھر کے کہنے لگے ان میں بہت سے اللہ کو پیارے ہو گئے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

جو موجود ہیں ان کی صورت دیکھے برسوں گزر جاتے ہیں۔ عبدالمجید سالک مرحوم تو میرے جیل کے ساتھی بھی رہے ہے۔ ایسے ہی رفیقوں کے سہارے جیل یارانِ انجمن بنی رہی فرمانے لگے کہ ایک دفعہ صوفی تبسم جیل میں ملنے آئے۔ عبدالمجید سالک سے مل کر جیل

دیجئے میرے لئے ایک شعر چھوڑ گئے۔ میں نے عرض کی شاہ جی اگر شعر یاد ہو تو سنائیے پھر اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھا:

حیف کز رنجش پنجم و ز تو سخن بر دو کہ تو
اشک بدیدہ بشمری نالہ بہ سینہ بجگری

فرمانے لگے کہ غالب مرحوم کا شعر ہے اسی غزل کا مطلع بھی سنایا:

دیدہ وراں کہ تا نہد دل بشمار دلبری
در رگ سنگ بنگرد رقص بتان آذری

فرمانے لگے جیل سے رہا ہو کر پوری غزل دیکھی، پھر والہانہ انداز میں پوری سنائی اردو شعرا میں شاہ جی سب سے زیادہ غالب کی شاعری اور اس کے محاسن پر تبصرہ فرماتے رہے اور مختلف اشعار پڑھ کر غالب کی عظمت بتائی۔ فرمانے لگے "غالب تو جنت ہے"۔ دوسرے شعرا نے بھی عمدہ اشعار کہے ہیں۔ مگر میں اپنے ذوق کو کیا کروں دوسرا شاعر میری نظروں میں جچتا ہی نہیں۔

جب غالب کی بات ختم کر چکے تو میں نے صوفی تبسم کا سلام اُن تک پہنچایا۔ دُکھ بھرے لہجے میں فرمانے لگے، "وہ صحبتیں خواب پریشاں ہو کر رہ گئی ہیں۔ محفلیں تھیں کہ اجڑ گئی ہیں۔ اس سینے میں کن کن صحبتوں کے داغ ہیں۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

حافظ صاحب اب تو اس محلے میں رہتا ہوں جہاں کوئی صحیح اخبار پڑھ کر نہیں سنا سکتا میری بینائی کمزور ہو چکی ہے۔ آپ آجاتے ہیں تو بھولی بسری صحبتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے یا لاہور سے کوئی دوست آنکلے تو پرانے داغ ہرے ہو جاتے ہیں کمزوری اور نقاہت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ گھر کی دہلیز سے دنوں باہر قدم نہیں رکھتا۔ ذیابیطس سے جسم گھل کر رہ گیا ہے۔

ایسی کئی محفلوں کے نقوش ذہن میں تازہ ہیں۔ کن کن صحبتوں کا ذکر کیا جائے، کن کن لمحات کو یاد کیا جائے۔ کن کن واقعات کو دہرایا جائے۔ شاہ جی کی صحبتیں میرے

لئے کھلی ہوئی کتابیں ہیں جن کے ایک ایک ورق میں علمی و ادبی خزانے محفوظ ہیں بزرگانِ دین کے قصے، صحابۂ کرام کی سیرت، رسولِ پاکؐ کے فرمودات۔ شعرائے کرام کے تذکرے، بذلہ سنجی، خوش مذاقی، انقلابِ زمانہ کی ہولناک تصویریں، قید و بند کی جاں سوز حکایتیں ۔ ان مجالس میں شاہ جی نے کس موضوع پہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں فرمایا۔ کونسا وہ خزانہ ہے جس کی کلید شاہ جی کے پاس نہیں۔ ایک شخصیت میں ہزاروں جلوے موجود ہیں۔ مگر اس مرنجان مرنج انسان کو مسلسل بیماری نے پریشان کر دیا ہے اور اس کے ذہن میں ہنگاموں اور معرکوں سے زمانے ماضی کے قصہ پارینہ سے زیادہ نہیں۔ عید کا دن تھا۔ غسل خانہ سے وضو کر کے باہر تشریف لائے۔ غسل خانہ؟ جس میں ایک آدمی اچھی طرح بیٹھ کر وضو نہیں کر سکتا۔ جس کا دروازہ نہیں ۔ دروازے پر پردہ لٹکا ہوا ہے غسل خانہ سے باہر آ کر یہ شعر پڑھا۔

نہ گلم نہ برگِ سبزم نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

میں شاہ جی کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کون شخص یہ شعر پڑھ رہا ہے۔

شاہ جی کو فارسی شاعری سے بہت شغف ہے۔ فارسی کے بے شمار منتخب اشعار شاہ جی کو ازبر ہیں، فارسی کے اساتذہ میں سے شائد ہی کوئی ایسا ہو جس کا دیوان شاہ جی نظروں سے نہ گزرا ہو شاہ جی کا کتب خانہ فسادات کی نذر ہو گیا۔ بہت سے قیمتی نسخے ضائع ہو گئے۔ سینکڑوں اشعار کا انتخاب ساری عمر کی پونجی وہاں رہ گئی۔ چند ایک کتابیں ان کے پاس ہیں۔ اس علمی خزانے کے لٹ جانے سے شاہ جی جیسے علم دوست انسان پہ کیا بیتی ہوگی۔ اس کا اندازہ اہل علم حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دن فرمانے لگے کہ آج کل نوجوانوں میں فارسی کا ذوق گھٹتا جا رہا ہے۔ اس لئے شعر کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ پھر مولانا گرامی مرحوم کی صحبتوں کا ذکر فرمانے لگے۔ مولانا گرامی کے معراجِ رسولؐ پر اشعار سنائے اور کہنے لگے یہ اشعار مولانا گرامی ہی کا حصہ ہیں، صوتی آہنگ، تکرار لفظی اور شاہ جی کے پڑھنے کا انداز

ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی۔ شاہ جی اس زمانے میں ترنم سے اشعار نہیں پڑھتے تھے تحت اللفظ اشعار سنانا شروع کئے۔

بلا در حسرہ گرہ پیچیدہ زلف نیم تابش را
اجل در یک گریبانست چشم نیم خوابش را
شبے در خانۂ زین آں امام انبیا آمد
قضا گیرد عنانش را قدر گیرد رکابش را
سوارے برق شد ماہے فلک آمد غبارش
رکابش بوسہ بہ بازو فلک بوسد رکابش را
گرامی در قیامت آں نگاہے مغفرت خواہد
کہ در آغوش گیرد جرمہائے بے حسابش را

فارسی کا ذکر بہت دیر تک ہوتا رہا۔ اور بہت سے شعرائے متقدمین کا عجیب کلام سناتے رہے۔ اسی مجلس میں تاثیر مرحوم کا ایک واقعہ بھی سنایا:

فرمانے لگے ایک دفعہ میں تاثیر مرحوم سے ملنے گیا۔ واپسی پر تاثیر مجھے رخصت کرنے کے لئے سڑک تک تشریف لائے۔ میں تانگے میں بیٹھ گیا۔ اور وہ تانگے کی کمانی پکڑے اپنے خاص انداز میں یہ شعر سنانے لگے:

دل است بندۂ احرار جاں اسیر فرنگ
نہ بہرہ ہمہ صلح و نہ چارۂ ہمہ جنگ
نمود سر بسر انظہار و کوہکن یک تن
ہزار پیکرِ شیریں فسردہ در رگِ سنگ

یہ شعر پڑھتے جاتے اور اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے جاتے تھے۔ میں نے بھی تانگے میں بیٹھے بیٹھے اشعار سنائے۔ اسی طرح شعر سنتے سناتے دو تین گھنٹے گزر گئے۔ تاثیر کہنے لگے شاہ جی اب واپس گھر چلیں۔ میں تانگے سے اتر کر پھر تاثیر کے ساتھ ہو لیا۔

ایک نشست میں پنجابی زبان کے سلسلے میں بات شروع ہو گئی شاہ جی پنجابی زبان کی بے ساختگی اور وسعتِ خیال کے بہت مداح ہیں۔ پنجابی زبان کے متعلق ایک دن نہایت بلیغ اور جامع جملہ ارشاد فرمایا۔ فرمانے لگے کہ "پنجابی زبان خیال کو آنگن دیتی ہے" اسی سلسلے میں ایک واقعہ بیان فرمایا کہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مجلس میں شریک تھا۔ سیف الدین کچلو اور دوسرے زعمائے کرام حلقہ بگوش تھے ہیر وارث شاہ کا ذکر چھڑ گیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ مولانا یہ بھی کوئی کتاب ہے۔ مولانا کو ناگوار خاطر گزرا۔ فرمانے لگے، میرے بھائی بہت بڑا لٹریچر ہے۔ تین سال گزر گئے ایک دفعہ مولانا غالباً لاہور میں تقریر کر رہے تھے۔ اور میں اسٹیج کے پاس ایک خیمے میں قاضی احسان احمد سے تقریر نقل کروا رہا تھا۔ جونہی میں خیمے سے باہر نکلا مولانا اسٹیج سے اتر رہے تھے، فرمانے لگے سنا ہے ہیر وارث شاہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہو رہی ہے، میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضرت بہت بڑا لٹریچر ہے اس طرح یہ قصہ ختم ہوا۔ اسی محفل میں پنجابی اشعار کا دور چلا۔ مولانا نے ہیر وارث شاہ کے بہت سے اشعار سنائے۔ میں نے ایک شعر مولانا کو سنایا شعر یہ تھا:

میری گھگھری نوں گھنگھرو لوا دے
جے توں میری چال ویکھنی!

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا کئی بار پڑھا اور فرمانے لگے کہ میں اپنے حضرت دھضرت رائے پوری کے پاس جاؤں گا۔ اور دھوتی کا کونا پکڑ کر یہ شعر پڑھوں گا

شاہ جی باتوں باتوں میں ایسے جملے کہہ جاتے ہیں جو ادبی تاریخ ہوتے ہیں۔ کتنے جواہر پارے ہوں گے جو ضبطِ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے ضائع ہو گئے

ایک دفعہ حدیث کے متعلق فرمانے لگے کہ حدیث تو دعوے کی مثل ہے۔ اور اسی طرح ایک دن فرمانے لگے کہ دوستی اور دشمنی کا ترازو تو صرف انبیاء کے ہاتھ میں رہا ہے۔

شاہ جی ہر آدمی سے اس کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ

مجھے سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ایسی کوئی مجلس نہیں ہوئی جس میں انہوں نے سیاست کو موضوع گفتگو بنایا ہو۔ مذہب کی بات کرتے یا شعر و شاعری کا تذکرہ رہتا ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نہایت میٹھے اشعار سناتے :

وجدت العلم فی الاشراف عظماً

وفی الاجلاف مقبوحاً و ذماً

کماء المطر فی الاصداف دُرّاً

وفی ھتم الافاعی مار سماً

(شریفوں میں میں نے علم کو معزز پایا اور کمینوں میں ذلیل و خوار دیکھا۔ جیسے سواتی کا پانی سیپ کے منہ میں موتی اور سانپ کے منہ میں زہر)

آج وہ صاحب کمال اور صاحب فضیلت بزرگ نشتر ہسپتال ملتان کے ایک کمرے میں صاحب فراش ہے۔ جس کا وجود پچھلی نصف صدی کی تاریخ ہے جس نے اپنی سحر بیانی اور ایثار و قربانی سے لاکھوں افراد کے دلوں پہ حکومت کی ہے جس کی صدائے کلمۃ الحق سے اہل باطل کانپ کانپ اٹھتے تھے۔ جس کی زندگی مسلسل جدوجہد اور لگاتار آزمائشوں میں گزری مگر کسی امتحان کسی آزمائش میں اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ انگریز حکومت کے خلاف اس وقت علم جہاد بلند کیا جب مائیں بچوں کو انگریز کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ اور عوام کے دلوں پہ ان کی ہیبت اور عظمت چھائی ہوئی تھی۔ آزادی ہند کے لئے قابل رشک جوانی قربان کر دی اور ناموس رسولؐ کے لئے تمام زندگی۔ اس شخص کو نہ زنجیر و سلاسل کا خوف تھا نہ دار و رسن کی پرواہ نہیں تھی۔ اس نے ہر ظلم و استبداد کو عالی حوصلگی اور پامردی سے برداشت کیا اور ماتھے پہ شکن تک نہ آئی۔ یہ قید و بند کی صعوبتیں کسی انعام یا صلے کے لئے نہیں اٹھائیں اس نے کبھی لوگوں سے اپنی خدمت کا صلہ نہیں چاہا۔ اگر شاہ جی چاہتے تو آج ان کے پاس لاکھوں روپے کا اثاثہ ہوتا۔ خلافت کے زمانے میں ہزاروں روپیہ اکٹھا ہوا۔ خواتین نے شاہ جی کی تقریریں سن کر اسٹیج پہ زیورات پھینک دیے اگر وہ

چاہتے تو اپنی ذات کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے مگر ان کی بے لوث اور پُرخلوص زندگی نے دنیوی جاہ و جلال یا مادی زندگی کی آسائشوں اور زینتوں کو کبھی قبول نہ کیا۔ شاہ جی کو قدرت نے جو جوہر عطا کیا ہے وہ اپنی ہر تمنا پوری کر سکتے تھے مگر اس مردِ قلندر درویش صفت اور فرشتہ سیرت شخص نے اگر کوئی خواہش کی تو آخرت میں نجات کی اور دنیوی لذّات کو متاع الحیوٰۃ الدنیا سمجھا۔ ورنہ وہ یوں آج کچے مکان میں زندگی بسر نہ کرتے۔ ان کو اس حالت میں بھی کسی سے کوئی توقع نہیں اور نہ ہی شاہ جی نے آج تک کسی کے سامنے اپنی اقتصادی حالت کا اظہار کیا۔ وہ ہر حال میں قانع اور شاکر ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے اب رو بصحت ہیں۔

بات محبوب کی تھی طویل ہو گئی۔

افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شد

اللہ تعالیٰ اس مردِ مومن کو جس نے زندگی بھر خوشنودیٔ مولا اور رضائے الٰہی کو کو اپنا نصب العین بنائے رکھا تندرستی اور صحت عطا فرمائے۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مولانا تاج محمود، لائلپور

اب کہاں دنیا میں ایسی ہستیاں

شاہ جی کی ذاتِ گرامی بے شمار محاسن کا مجموعہ تھی وہ بظاہر ایک انسان تھے، لیکن حقیقت میں قدرت نے انہیں کئی انسانوں کے کمالات و صفات سے نوازا تھا۔ وہ عشقِ رسول میں ڈوبے ہوئے عالم۔ بے مثال مفسرِ قرآن۔ فصیح اللسان مبلغ اسلام۔ بڑے دل گردے کے مجاہد، ہمہ تن ایثار، سراپا اخلاص، وجیہہ صورت، مضبوط ڈیل ڈول۔ سرفروش غازی۔ سحر طراز مقرر۔ انقلاب انگیز خطیب، پرسوز قاری۔ باخدا مردِ مومن اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ان کے خیالات میں آسمانوں کی بلندی۔ عقائد میں پہاڑوں کی پختگی، زبان میں دریاؤں کی روانی۔ جلال میں تلواروں کی کاٹ اور جمال میں صبا کی لطافت پائی جاتی تھی، وہ نبی نہ تھے بلکہ ان کی زندگی حضور سرورِ کائنات صلعم کے اس ارشاد کی شہادت و اشاعت میں گزری کہ:

"اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ"

لیکن شکل و صورت سے لے کر نشست و برخاست تک ہر بات میں پیغمبرانہ انداز رکھتے تھے، ان کے جس کمال اور جس خصوصیت پر غور کیا جائے، حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم!
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است

ہم نے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا نہیں۔ ان کے حالات سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پڑھے ہیں، شاہ جی کی زندگی عبادت و ریاضت سے لے کر لطافت و ظرافت تک انہیں اکابر کی زندگیوں کا عکس جمیل تھی۔ اگرچہ فیاضِ ازل نے بڑی فیاضی سے انہیں بے شمار ملکات و صفات ودیعت فرمائے تھے لیکن ان کمالات میں جو چیز سب سے نمایاں تھی اور جس کی بدولت شاہ جی آسمانِ شہرت پہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے وہ ان کی خطابت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسب و نسب کی شرافت و نجابت سے لے کر آواز کی سحر طرازی اور الفاظ کی فصاحت و بلاغت تک کی تمام نعمتیں انہیں خطابت ہی کے لئے عطا کی گئی تھیں۔ لاکھوں کے مجمع میں جب تشریف لاتے تو لوگوں کی گردنیں اٹھنے لگتیں دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں، مجمع سے منظم اور غیر منظم نعرے بلند ہونے شروع ہوتے، ایک ہی وقت میں ایک گوشہ اللہ اکبر پکار رہا ہوتا، دوسرا زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پہ اٹھا لیتا۔ غرض مجمع میں ایک غلغلہ بپا ہو جاتا۔ بیٹھ جائیے، بیٹھ جائیے، سٹیج سے آواز آتی حضرات بیٹھ جائیے، اطمینان سے بیٹھ جائیے، شاہ جی ابھی سٹیج پر تشریف لا رہے ہیں۔ آپ انہیں بخوبی دیکھ سکیں گے۔ ذرا بیٹھ جائیے لیکن کون سنتا آدھے کھڑے، آدھے بیٹھے ہیں، کھڑے ہونے والے بیٹھ رہے ہیں اور بیٹھے ہوئے کھڑے ہو رہے ہیں، ایک عجیب وارفتگی اور شوق کا عالم ہوتا، شاہ جی بڑے عجیب و غریب انداز سے آتے، پنڈال نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھتا۔ اور جب وہ سٹیج پر پہنچ کر ستاروں میں چاند کی طرح بیٹھ جاتے۔ تو لوگوں کا شور و غل اور جلسے کی افراتفری سکون و سکوت میں بدل جاتی، ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ اب شاہ جی مجمع کے سامنے آتے، تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہتے کچھ پڑھ کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں اور ہتھیلی پہ پھونکتے ہاتھ منہ پر پھیر لیتے، میرا زندگی بھر یقین رہا کہ جب شاہ جی مجمع کے سامنے کچھ پڑھ کر پھونکتے تھے تو آپ کے دل کا تعلق کسی اور ہی جگہ ہو جاتا تھا۔ ؎

سیماب لفظ اترتا ہے عرش سے

ایک دفعہ سامنے پھر دائیں بائیں غور سے مجمع کو دیکھتے۔ پھر خطبہ کی آیات اور درودِ پاک حجازی لے میں پڑھتے، عوام کے دل و دماغ مسحور ہو جاتے، عناصر پہ سکتہ طاری ہو جاتا، ایسا محسوس ہوتا کہ عالم ارواح اور عالم ملکوت بھی شاہ جی کی آواز پہ متوجہ ہو گئے ہیں۔ تقریر شروع ہوتی منہ سے پھول جھڑنے لگتے، ہاتھ اٹھاتے ہلاتے تو محسوس ہوتا کہ عوام پہ جادو کر رہے ہیں۔ آیات احادیث

کا ایک ذخیرہ اور ان کی ایسی اچھوتی تشریح و تفسیر کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی، عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے شعر ایسے برمحل پڑھتے گویا انگشتری میں نگینے جڑ رہے ہیں۔ لطائف و ظرائف بیان کرتے تو مجمع کشتِ زعفران بن جاتا، کبھی ہنسا دیتے کبھی رلا دیتے، رات ڈھل جاتی، سحر قریب ہو جاتی اور وہ پڑھ رہے ہوتے ے

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند!
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا ست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند!

نہ کسی کو سردی گرمی کا احساس رہتا، نہ کسی کو نیند و آرام کا خیال، اگر کسی کو کوئی فکر دامن گیر ہوتی تو صرف یہ کہ کہیں رات ختم ہونے کے ساتھ ہی شاہ جی کی تقریر بھی ختم نہ ہو جائے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ شاہ جی کی تقریر میں صبح کی اذان ہوئی اور شاہ جی چونک کر مؤذن کو پکار اٹھتے ے

تری آواز مکے اور مدینے!

تب تقریر ختم کر دیتے۔ لوگ اصرار کرتے شاہ جی کچھ اور، فرماتے "بھائی رات ختم ہو گئی۔" اور شاہ جی عموماً اس شعر پر ختم کر دیتے ے

وسعتِ دل ہے بہت، وسعتِ صحرا کم ہے!
اس لئے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے!!

شاہ جی کی تقریریں لوگوں کے دل و دماغ کو کیونکر مسخر کر لیا کرتی تھیں یہ ایک لمبی داستان ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ انہوں نے اپنی خطابت سے بڑے بڑے طوفانوں کو روکا یہاں تک کہ بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ صرف چند واقعات عرض کرتا ہوں جن سے اندازہ ہو گا کہ وہ کس طرح لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔

(۱) ایک ریٹائرڈ پولیس افسر نے بتایا کہ ایک مرتبہ شاہ جی مسجد خیر دین امرتسر میں تقریر کر رہے تھے، میں ڈیوٹی پر تھا، دو بجے شب مجھے اعلیٰ حکام نے طلب کیا اور میری جگہ ایک دوسرا رپورٹر بھیجا۔ میں نے جب اپنی ڈائری ختم کی تو اس میں یہ الفاظ درج کر دیئے،

"شاہ جی رات کے ۱۱ بجے سے تقریر کر رہے ہیں۔ اب رات کے دو بجے ہیں ان کی تقریر سے حاضرین جلسہ تو در کنار، مسجد خیر دین کے در و دیوار، اس کے گنبد و محراب اور حوض کے پانی تک مسحور ہو چکے ہیں"۔

(۲) خان غلام محمد خان لوند خوڑ نے سنایا کہ میں نے نہ تو شاہ جی کو دیکھا ہوا تھا اور نہ ان کا خاص معتقد تھا۔ میرا سیاسی مسلک بھی ان سے جدا تھا۔ ایک دفعہ عشا کے وقت دلی دروازے کے باہر سے گزرا تو شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ میں بڑے ضروری کام میں تھا، اس خیال سے رک گیا کہ جس مقرر کی اتنی شہرت ہے اسے پانچ منٹ سن لوں۔ میری عادت یہ ہے کہ میں جلسہ میں ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتا خود اپنے جلسے میں بھی گھوم پھر کر دیکھتا اور سنتا ہوں۔ میں پانچ منٹ تک شاہ جی کی تقریر سنتا رہا۔ پھر سوچا تھوڑی دیر اور سن لوں۔ ان کا سحر تھا کہ کھڑے کھڑے بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا۔ اور لیٹے لیٹے ساری رات تقریر سنتا رہا اور ایسے حواس گم ہوئے کہ اپنا کام ہی بھول گیا یہاں تک کہ صبح کی اذان بلند ہوتی شاہ جی نے تقریر کے خاتمے کا اعلان کیا تو مجھے خیال آیا کہ او ہو! ساری رات ختم ہو گئی۔ یہ شخص تقریر نہیں کر رہا بلکہ جادو کر رہا تھا۔

(۳) حاجی قائم دین لائل پور میں کپڑے کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین و دنیا دونوں بڑی فیاضی سے عطا کی ہیں۔ شاہ جی کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ تقسیم سے قبل آگرہ میں تھے۔ انہوں نے واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ شاہ جی آگرہ میں مارکیٹ کی چھت پر منعقدہ جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔ نماز کے بعد میں قرآن مجید کی آیات پڑھیں تو ایک نوجوان تڑپ کر چھت کے کنارے کی دیوار سے چھت پر آ گرا۔ مرنے سے تو بچ گیا لیکن وجد اور جذب کی حالت میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ لوگوں نے اٹھایا تو اس کے چھرا برآمد ہوا۔ اسے شاہ جی کے پاس لایا گیا، شاہ جی نے اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا، کچھ پڑھ کر پھونکا اور محبت سے پاس بٹھا لیا جب اسے ہوش آیا تو اس نے انکشاف کیا کہ مجھے تو شاہ جی کے قتل کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن شاہ جی کا خطبہ اور قرآن مجید سن کر میں بے تاب اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر اس کے بعد کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔

ایک دفعہ شاہ جی علی گڑھ کے کسی جلسہ میں تقریر کرنے تشریف لے گئے، کالج کے

بچے برافروختہ ہیں، کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو فرمایا اچھا بیٹا قرآن مجید کا ایک رکوع پڑھ دیتا ہوں اور جلسہ تمہارے احترام میں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ طلبا خاموش بیٹھ گئے شاہ جی نے انتہائی دلسوزی سے نیم خوردہ آواز میں قرآن مجید پڑھنا شروع کیا، چشم و گوش اور در و دیوار جھوم گئے، تلاوت ختم ہوئی تو فرمایا بیٹا کیا خیال ہے اس کا ترجمہ بھی کر دوں۔ آواز آئی ضرور ترجمہ بھی کر دیجئے۔ اب ترجمہ شروع ہوا۔ پھر ترجمے کے بعد تفسیر و تشریح کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، شاہ جی نے تقریر ختم کی طلبا نے شور مچایا، شاہ جی خدا کے لئے کچھ اور بیان کیجئے۔ فرمایا بیٹا کبھی پھر آؤں گا تو تقریر سناؤں گا۔

شاہ جی ایک صاحب طرز خطیب تھے۔ ان کی خطابت میں سیاست، مذہب، معاش اور معاشرت سبھی قسم کے مسائل زیر بحث آتے۔ لیکن ان کی خطابت کا مرکزی نقطہ جس کے گرد نہ صرف ان کی خطابت بلکہ ان کی پوری زندگی گردش کرتی تھی وہ عشق رسول تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی کے کل محاسن ان کی خطابت کے لئے تھے اور ان کی خطابت عشق رسول کے لئے تھی۔ انہی کی ایک نعت شریف کا... مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

سبحانَ مَن یّرٰی چہ شانِ محمد است
لولاک ذرۂ ز جہانِ محمد است!
ہر قضا و قدر ہمیں است اے ندیم
پیکانِ امرِ حق ز کمانِ محمد است

حضور سرورِ کائنات ؐ کے فضائل کو عشق و محبت میں ڈوب ڈوب کر بیان کرتے، حضورؐ کے لئے الفاظ و القاب کا انتخاب خاص اہتمام سے کرتے تھے، اگر کوئی معیاری نعت آپ کے سامنے پڑھی جاتی تو اس کے الفاظ و آواز پر سر دھنتے تھے، ایک دفعہ لاہور میں ایک رضاکار نے نعت پڑھی سبحان اللہ سبحان اللہ پڑھتے ہوئے جھومنے لگے، میری آنکھوں میں ابھی تک وہ نقشہ ہے شاہ جی جذب و مستی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے گھنگھریالے بالوں پر بھی اسی جذب و مستی سے وجد کی حالت طاری تھی۔ ایک شعر پر جس میں سرورِ دو عالم کے نقر و فاقہ ہو رہا تھا اٹھ کر ردائے مبارکہ کی کہنگی کا ذکر تھا کھڑے ہو گئے، اور کھڑے کھڑے جھومتے جھومتے بر ـــــ

کیفیت ختم ہوئی تو فرمایا کہ سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک پر قیام کرنے کا مقام تھا۔

گجرات کے مشہور مقدمہ میں جب لدھا رام ریڈر سی آئی ڈی نے حقیقتِ حال کا انکشاف عدالتِ عالیہ میں کیا اور شاہ جی کی رہائی ہو گئی تو لدھا رام سے پوچھا گیا کہ آخر تو نے سرکاری ملازم ہوتے ہوئے یہ جھوٹی شہادت دینے سے گریز کیوں کیا، اور سچی شہادت سے اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالا۔ تو اس نے بتایا کہ میں نے سرکاری ملازمت میں ہمیشہ سچی جھوٹی شہادتیں دی ہیں اور اس دن بھی شاہ جی کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ ڈائری میں ردوبدل اگرچہ اعلیٰ حکام کے حکم سے کیا تھا۔ لیکن اس میں بہرحال میری بھی رضامندی شامل تھی۔ ہوا یہ کہ میں جب گواہی دینے عدالت میں آیا تو شاہ جی کو دیکھا کہ رشیوں اور منیوں کی شکل و صورت کا ایک سچا انسان کھڑا ہے۔ مجھے کسی مخفی طاقت نے ٹوکا کہ یہ شخص اب میری جھوٹی شہادت پر پھانسی کی سزا پائے گا۔ میرا دل لرز گیا، میں نے دل ہی دل میں توبہ کی اور عہد کیا کہ دنیا کی ہر مصیبت برداشت کروں گا۔ لیکن اس عظیم انسان کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کا پاپ نہیں کماؤں گا۔ تب میں نے شاہ جی کے وکیل کو علیحدگی میں سارا ماجرا بیان کیا، ساتھ ہی اپنا ارادہ بھی بتایا۔ لدھا رام نے ہائیکورٹ میں شہادت دی، اس کی ملازمت گئی، تین سال سخت کی سزا ہوئی۔ لیکن شاہ جی کی معجزانہ رہائی کا باعث بن گیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی ۹ ماہ کے قریب جیل میں رہے۔ جب رہا ہو کر آتے تو تقریروں میں اکثر فرمایا کرتے کہ ایک طرف بے نوا تھا، میرے غریب ساتھی جیلوں میں مقید تھے، میری اولاد کمسن اور والدہ ضعیف العمر تھا۔ دوسری طرف فرنگی کی صولت و حشمت تھی۔ خزانے اس کے، پولیس اس کی، عدالتیں اس کی، جیل خانے اس کے، سب اختیار و اقتدار اسی کا تھا۔ پھر ترنم سے پڑھتے

روح بخت ملاقی ان کا!!
چرخ ہفت طبقاتی ان کا

حضرت یوسف علیہ السلام کے زندانی ہونے کا واقعہ دہراتے، زلیخا کی الزام تراشیوں کا تذکرہ کرتے قرآن مجید کی آیت شریفہ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا پڑھ کر لدھا رام کو انگریزوں کا گھریلو گواہ قرار دیتے۔ اس مقدمہ سے رہائی کو وہ اللہ کا احسان کہتے۔ آخر میں فرماتے، اے اللہ اس نعمت کے شکرانے میں میں تیری خدمت میں کیا پیش کروں، کیونکہ جو نعمت سوچتا ہوں وہ سب تیرے خزانوں میں موجود ہے۔ ایک دن تقریر کرتے ہوئے جھولی پھیلا دی اور فرمایا میرے پاس ایک چیز ہے جو تیرے پاس نہیں ہے وہی تیرے شکر نعمت کے لیے پیش کرتا ہوں اور وہ میرے گناہ ہیں، میرے پاس ان کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ بیان کچھ اس عجز و انکسار اور رقت انگیز منظر میں پیش کیا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔

شاہ جی نے تحریک آزادی میں جو تقاریر کیں اگر انہیں جمع کیا جائے تو وہ ایک بے مثال ذخیرہ ہے۔ قرآن مجید سے بعض ایسی آیات کا انتخاب فرمایا کرتے اور ان پر آزادی سے متعلق ایسی شعلہ بار تقریریں کرتے جن کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد ان کی پوری توجہ مسئلہ تحفظ ختم نبوت کی طرف ہو گئی، وہ اس مسئلے کو توحید، رسالت، قیامت اور تمام عقائد و عبادات اسلام کی اصل قرار دیتے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ان تمام مسائل کی تعریف اور تعین نبوت کرتی ہے۔ اگر نبوت بدل سکتی ہے تو یہ سب کچھ بدل سکتا ہے، یہاں تک کہ حلال و حرام بھی بدل سکتا ہے۔ وہ موجودہ اسلام کی بنیاد حضور سرور کائنات صلعم کی تعلیمات کو تعین کرتے تھے۔ اور حضورؐ کی ذات کے ساتھ ان کا جو عشق تھا اس کے خلاف وہ کسی چیز کو برداشت کرنے کا تصور تک بھی نہ کر سکتے تھے۔ مسئلہ ختم نبوت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جو کچھ کہا، وہ برسوں ہمارے ملک کی فضا میں گونجتا رہے گا۔ اس سلسلے میں وہ بعض عجیب عجیب پیشین گوئیاں بھی کرتے تھے جو وقت نے کچھ پوری کر دی ہیں۔ اور وقت بعض دوسری باتوں کو بھی پورا کر دے گا۔ انشاء اللہ۔

حضور سرور دو عالم صلعم کی ذات کے سلسلہ میں ان کا اخلاص کس درجے کا تھا اس کا اندازہ ان کی ۱۷ فروری ۱۹۵۳ء کی تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے لاہور دہلی دروازہ (بیرون دہلی دروازہ) میں کی تھی۔ اس دن خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے تقریر

کرتے ہوئے اپنی ٹوپی اتارلی اور فرمایا "کوئی ہے جو میری یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین کے پاؤں پر رکھ دے اور انہیں میری طرف سے یقین دلا دے کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں، اگر وہ محسنِ کائنات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس اور عزت کا تحفظ کر دیں تو میں اپنی زندگی ان کا خدمتگار رہوں گا حتیٰ کہ ان کے کتّے ہیں اگر سوئر بھی ہوں گے تو انہیں بھی چراتا رہوں گا" اس سے مجمع میں ایک کہرام مچ گیا۔

صحابہ کرامؓ کے اکرام و احترام کو بھی جزوِ ایمان جانتے تھے اور اصحاب رسولؐ پر تنقید و تنقیص کو بربادیٔ ایمان یقین کرتے۔ لکھنؤ میں بعض خلفائے راشدین کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہنا جرم تھا، شاہ جی نے بر سرِ اجلاس اس قانون کی دھجیاں اڑا دیں۔ وہ صحابہ کرام۔ ازواج مطہرات اور آلِ بیت اطہار کے فضائل و محاسن پر گھنٹوں بولتے رہتے تھے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ اور اسی طرح وَطَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ سے وہ اصحابؓ و ازواجِ رسولؐ کی معیت کے درجہ کو عام ایمان کے درجے سے افضل قرار دیتے تھے۔ وہ حدیث پاک اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کو صحابہؓ کے فضائل میں بیان کر کے سعدی شیرازیؒ کے مشہور شعر پڑھا کرتے تھے۔ ے

گلے خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم!
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلآویز تو مستم!!
بگفتا من ناچیز بودم!!!
ولیکن مدتے با گل نشستم!
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

شاہ جی نے مختلف اصحاب رسولؐ کے فضائل کے سلسلہ میں حضورؐ کی نبوت کی صداقت کا دو صحابہ کبارؓ کو بہترین گواہ قرار دیا کرتے۔ پہلے جناب حضرت عمر بن خطابؓ اور دوسرے حضرت

خالد بن ولیدؓ کو۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی! اور ابوبکر صدیقؓ ۔ فرمایا ان کی اس مقدمے میں سرکاری گواہ کی حیثیت تھی۔ وہ حضورؐ کے پہلے ہی سے دوست تھے، لیکن یہ دونوں بہادر دشمن اور سخت دشمن تھے، لیکن نبوت کی صداقت کو یقین کر کے شرفِ ایمان حاصل کر گئے۔ وہ حدیثِ رسولؐ کہ نبوت کی مثل فرمایا کرتے تھے۔ اور کہتے کہ اب کچھ لوگ اس مثل ہی کو غتربود کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ شاہ جی کی ایک بڑی خوبی ان کی زندہ دلی اور لطافت وظرافت تھی۔ وہ مصنوعی خاموشی اور یبوست کے خلاف تھے۔ اللہ نے باغ و بہار طبیعت بخشی ہوئی تھی۔ جب کبھی ان پر مصائب کا ہجوم ہوتا ساتھیوں پر ظلم وتشدد کی یلغار ہو رہی ہوتی تو رنج وملال نہیں کرتے تھے بلکہ خوب ہنستے اور ہنساتے تھے۔ اس طرح وہ اپنا اور اپنے دیوانے سرفروش مجاہدوں کا غم غلط کرتے رہتے۔ ان کی شعر وسخن کی محفلوں اور بذلہ سنجی وظرافت کی مجلسوں میں بیٹھ کر ہر رنج اور ہر مصیبت بھول جایا کرتی تھی! ان کے بیان کردہ لطائف وظرائف کو اگر کوئی اکٹھا کرے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

جب پہلے پہل ان پر فالج کا حملہ ہوا تو ہم ملتان پہنچے۔ اتفاق سے مولانا احمد علی صاحب بھی لاہور سے مزاج پرسی کے لئے تشریف لے آئے۔ اب شاہ جی نے فالج کے حملے کا واقعہ سنایا کہ صبح۔۔ اچھا بھلا اٹھا وضو کرنے لگا تو ہاتھ نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ منہ میں پانی ڈالا تو اس نے بھی بغاوت اختیار کی۔ میں سمجھ گیا کہ فالج کا حملہ ہوا ہے اور اب میں مرنے لگا ہوں۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ صبح کی نماز ادا کی اور زور زور سے پڑھا۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ لا نبیَّ بعدہٗ ولا رسول بعدہٗ۔ اور یہ پڑھ کر۔۔ چارپائی پر لیٹ گیا کہ اگر اب موت آگئی تو ان شاء اللہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر لیٹا رہا اور موت کا انتظار کرتا رہا لیکن موت نہ آئی اب اٹھا اندر گیا بھوک لگ رہی تھی، کھانا مانگا تو رات کی ٹھنڈی کھچڑی کھالی۔ البتہ ایک غلطی ہوگئی جس کے لئے اللہ سے معافی مانگتا ہوں، آپ لوگ بھی معاف کر دیں! وہ یہ کہ کھچڑی کے بعد گھڑیا کا ٹھنڈا ٹھار پانی پینا بھول گیا۔ بس یہ کسر رہ گئی۔ شاہ جی یہ باتیں بڑے مزے لے لے کر کر رہے تھے اور میں سوچتا تھا کہ فالج کا حملہ ہے منہ پر لقوہ کا اثر ہے زبان میں لکنت آچکی ہے لیکن اس ہولناک اور خوفناک مرض میں بھی شاہ جی کی وہی زندہ دلی اور چٹکلے مشغلہ [illegible] کسی مرض میں بھی یاس و ملال یا کسی پریشانی

کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ جب کسی ساتھی کو رنجیدہ خاطر یا ملول دیکھتے بس ایسی بات کہہ دیتے کہ وہ رنج و ملال سب چلا جاتا۔

ایک دفعہ مولانا محمد علی جالندھری سندھ کے تبلیغی دورے سے واپس آئے، سفر کی تھکان طبیعت ناساز، گلا خراب، افسردہ حال شاہ جی کی خدمت میں آپہنچے۔ شاہ جی خود بھی بیمار تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی۔ شاہ جی مولانا کا بے حد احترام کرتے تھے پوچھا۔

"محمد علی کیا حال ہے؟"

مولانا نے جواب دیا۔

"شاہ جی سفر بہت تھا بیمار ہو گیا، تقریریں کرنا پڑیں، طبیعت سخت خراب ہو گئی اور گلا بھی خراب ہو گیا"

شاہ جی لیٹے ہوئے تھے اٹھ بیٹھے اور فرمایا۔

"محمد علی خدا کا خوف کر تیرا گلا اب خراب ہو گیا، یہ پہلے کون سا لحنِ داؤدی تھا جو اب خراب ہوا ہے"۔

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ شاہ جی خود بھی ہنس دیئے، مولانا کی ساری خرابیٔ طبیعت جاتی رہی اور چہرہ کھل گیا۔

شاہ جی بعض باتیں ایسی کہتے جو سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہوتیں۔ ایک دفعہ نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ آئے اور عرض کیا کہ شاہ جی آج کل کالجوں میں ہمارے لئے داڑھی رکھنا مشکل ہے۔ ہنس کر فرمایا۔ "ہاں بیٹا خالصہ کالج میں مشکل نہیں ہے، اسلامیہ کالج میں واقعی مشکل ہے"۔

وہ عام طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں نصف صدی اس ملک کے چپے چپے پر پھرا ہوں، میری قوم کی نفسیات یہ ہیں کہ یہ ڈنڈے والے کے آگے اور دولت والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔

ہم سے موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آخر یہ عظیم انسان بھی رخصت ہو گیا ؎

گماں مبر کہ نظیری چو تو بگذری جہاں گذار
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست!

مولانا حفظ الرحمان۔ ناظم جمعیۃ العلماء ہند دہلی

یادیں باقی رہ گئیں

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس دنیا سے رخصت ہو کر رحمت الٰہی کے آغوش میں پہنچ چکے ہیں لیکن وہ اپنی زندگی کے جو روشن نقوش، اپنی صلاحیت و کمال اور اپنے مجاہدانہ ایثار و کردار کی جو یاد باقی چھوڑ گئے ہیں وہ نہ صرف تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہیں گی بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں اور دماغوں پر نقش ہو چکی ہے۔ اور نسلاً بعد نسلاً انسانی نسلوں کو ان کی یاد بہتر زندگی اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا سبق دیتی رہے گی۔

ان کی شخصیت اس دور کی ایک عظیم اور باکمال شخصیت تھی۔ خدا تعالےٰ نے ان کو مخصوص ممتاز صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ انتہا درجہ سادگی پسند، قناعت گزین اور توکل شعار انسان تھے۔ ان کی طبیعت صد درجہ بے لوث و بے غرض واقع ہوئی تھی۔ اپنے رہن سہن۔ وضع قطع۔ بول چال۔ میل جول اور ہر ادا میں وہ سادگی کا پیکر اور "مرد مومن و مجاہد" کی زندہ تصویر تھے شاہ صاحبؒ بجا طور پر اس صدی کے ان علماء حق میں شمار کئے جائیں گے جنہوں نے اپنے فکر و عمل کی تمام صلاحیتیں انسانی سماج کی بے لوث و بے خوف خدمت کے لئے وقف کیں اور ان کی پوری زندگی جہاد و عمل کا ایک نمونہ بنی۔

شاہ صاحبؒ کو دین و ملت سے وہ شغف تھا جو مرد مومن کا شعار ہے۔ خدا تعالےٰ نے

نے ان کو خطابت و بیان کی بے مثال صلاحیت عطا کی تھی اور ساتھ ہی دل بھی وہ عطا فرمایا تھا جو سعی و عمل کے جذبات اور حق پسندی و حق گوئی کی سدا بہار امنگوں سے معمور تھا ان کی یہ مخصوص صلاحیتیں سرتا سر خداداد صلاحیتیں تھیں۔ جن میں کسب و تمنا کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ سعادت! کہ شاہ صاحب نے اپنی یہ تمام صلاحیتیں خدمت دین و ملت اور خیر خواہی وطن کی راہ میں صرف کیں اور یہی ان کی شخصیت و کردار کا نشانِ امتیاز ہے۔

ملک کی زندگی میں شاہ صاحبؒ ایک سحر آفرین خطیب اور بے مثال مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور بہت ہی جلد عوام و خواص کے دلوں پہ چھا گئے۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں اس شان کے خطیب کم بہت کم ہو سکتے ہیں۔ کوئی دینی اور مذہبی عنوان ہو یا کوئی سیاسی اور سماجی۔ موضوع وہ جس سلاست، روانی، برجستگی اور بے تکلفی کے ساتھ گھنٹوں تقریر کرتے اور اپنے مافی الضمیر کو سامعین کے رگ و پے میں سمو دیتے تھے اس کو دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ وہ ایک پیدائشی اور خدا ساز مقرر اور خطیب ہیں۔

سیرت پاک اور اسوۂ رسول کریمؐ ان کا خاص موضوع اور ذہنی شغف تھا۔ اور نہ صرف وعظ و تبلیغ کی حد تک ——— بلکہ شاہ صاحب ان خوش نصیبوں میں تھے جن کو خدا تعالیٰ نے اسوۂ رسولؐ کی سچی لگن اور عمل کی توفیق و سعادت سے بھی نوازا تھا۔

"ختم نبوت" کی راہ میں جب قادیانی نیت نے رخنے پیدا کرنے چاہے اور ایک گمراہ تحریک نے سر اٹھایا اس وقت حق پرستوں کی جو صفتیں اس کے مقابلہ پہ سینہ سپر ہوئیں شاہ صاحبؒ ایک قائد کی حیثیت سے ان میں پیش پیش تھے۔ اور آخر تک پیش پیش رہے۔ اس راہ میں انہیں بڑے بڑے خطرات و مصائب کا سامنا ہوا مگر عشق رسولؐ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد عالمِ اسلام کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ "خلافت" کا تھا تحریکِ خلافت کی ہما ہمی نے مسلمانانِ ہند میں جو بیداری اور جراتِ عمل پیدا کی وہ خود ملک کی تحریکِ آزادی کے لئے ایک بڑی کمک ثابت ہوئی اور اسی وقت سے آزادی کی تحریک نے اپنی ملک گیر اور مضطرب شکل اختیار کی۔ ناممکن تھا کہ شاہ صاحب جیسا اولوالعزم اور باعمل انسان اس تحریک کی صفِ قیادت سے پیچھے رہ جاتا۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۲۰ء میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے دہلی میں ایک اہم سیاسی اجتماع بلایا تھا۔ اس اجتماع میں پہلی بار مجھے حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد مسلسل پچیس سال پھر اس طرح گزرے کہ فکر و عمل کا ایک میدان تھا اور ایک ہی لگن۔ تحریک آزادی شبانہ روز سرگرمیوں کا محور تھی۔ اس طویل رفاقت اور شعور و جذبات کی ہم آہنگی نے دلوں میں خلوص و تعلق کی جو گرہیں لگائیں۔ آج جب کہ شاہ صاحبؒ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ان کا ذکر بھی دل پر شاق گزرتا ہے۔ ؎

نہیں آتی گر ان کی یاد تو برسوں نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

برصغیر آزاد ہوا اور اس کے بعد برا بھلا جو کچھ ہونا وہ ہوا، مگر افسوس —— اس کے ساتھ ہی "اخوان الصفا" کی وہ محفلیں بھی اجڑ گئیں جو گھروں اور دیوان خانوں کی جگہ قید خانوں میں آراستہ ہوئی تھیں اور دار و گیر اور جہاد و آزمائش کا وہ عزیز دور بھی یک بارگی ختم ہو گیا جس کی لذتیں کچھ خوش نصیبوں کے حصہ میں آئیں ؎

آئے عشاق، گئے، وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

برصغیر کی تاریخ میں یہ چوتھائی صدی سیاسی ہیجان و تلاطم کا ایک صبر آزما دور تھا جس میں چالیس کروڑ محکوموں اور غلاموں کی بے سروسامانی اس عظیم الشان اور پر غرور اقتدار سے برسرِ پیکار رہی جس کی حدود و مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

اس دور کی آزمائش اگرچہ بہت کٹھن اور ہمت شکن تھی لیکن وطن کے قدم کار مردانِ ہمت کا جو قافلہ ہر خوف و خطر سے بے نیاز —— یہاں تک کہ خود اپنی عزت و آبرو اور جان و مال سے بے فکر ہو کر اس عہد کے ساتھ اپنے گھروں سے نکلا تھا کہ ——

یا تن رسید بجانان یا جان ز تن بر آید

اس کا عزم و ثبات بھی ناقابلِ تسخیر تھا۔ اور بالآخر وہی کامیاب ہوا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس قافلہ کے ایک سالار اور اسی مردانِ ہمت کی صفِ اول میں تھے۔

آزادیٔ وطن کی خاطر انہوں نے جس تن دہی کے ساتھ کام کیا ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک کی خاک چھانی اور خندہ پیشانی کے ساتھ قدم قدم پر خطرات کا مقابلہ کیا۔ پامردی کے ساتھ ہر تعاقب اور قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ اور اس پورے دور میں جو قائدانہ اور مجاہدانہ کردار پیش کیا وہ تاریخ آزادیٔ وطن کا ایک سنہرا ورق ہے جو ہمیشہ قدر و اعجاب کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور مکمل آزادی کی فضاؤں میں سانس لینے والی آئندہ نسلیں اس احسان سے گرانبار رہیں گی۔

حق یہ ہے کہ شاہ صاحب کی شخصیت۔ ان کا جوشِ عمل، ان کی قربانیاں اور سب سے بڑھ کر ان کی ساحرانہ خطابت، تحریک آزادیٔ وطن، اس کی پرورش اور ترقی کے لئے ایک بڑی مدد اور بیش قیمت اثاثہ تھی جس کے بغیر اس عظیم تحریک کی کامیابی اور اس کا نشو و نما بروقت مکمل نہ ہوتا۔

قدس اللہ سرہٗ و اسکنہ، فسیح جناتہٖ

ڈاکٹر سید عبداللہ

کمالاتِ فائقہ کا پیکر

عطاءاللہ شاہ بخاری

شخصیتیں توفیقاتِ ایزدی سے پیدا ہوتی ہیں —— ان کا وجود جو قدرت کے معمولی قوانین کا کرشمہ نہیں ہوتا —— وہ تو قدرت کے کسی غیر معمولی اور پراسرار عمل سے ظہور میں آتی ہیں —— یوں قدرت (نیچر) کی اپنی عام کارفرمائی بھی بوقلموں کی گل کاریاں کرتی رہتی ہے اور اس کے ہاتھ کی ہنرمندی کے عام عجوبے بھی کچھ کم نہیں —— صرف پھولوں کی کائنات پر ہی غور کر لیجیے۔ آپ قلمروِ گل کی وسعتوں کو دیکھ دیکھ کر محوِ حیرت تو لازماً ہوں گے۔ مگر آپ بالیقین اس کی پہنائیوں، اس کی رنگا رنگیوں، کرشمہ آفرینیوں اور دلفریبیوں کے اندازہائے بے شمار کو دیکھ کر تھک بھی تو جائیں گے اور بالآخر کہہ اٹھیں گے ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے!
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

یہ تو ہوا احوال نیچر کی عام تخلیقات کا —— اور اس کے ادراک کی کوشش کچھ کامیاب بھی ہے۔ مگر نیچر کی تخلیقاتِ فائقہ کی کائنات کہ عظیم الشان بھی اسی کا ایک حصہ ہیں۔ خدائے مصور الاجسام والارواح کا ایک بھید ہے یعنی ایک جہانِ راز جس کا مرکز خود خدا کی ذات مجرد ہی ہے، جس کے انعکاسات عظیم فائق انسانوں کا روپ دھارتے رہتے ہیں —— اور یہ

وہ لوگ ہیں جن کے متعلق میر تقی نے سادہ سے الفاظ میں پتے کی بات یوں بتادی تھی ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اور جب میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ذکر سنتا ہوں اور ان کے کمالات فائقہ کا تصور کرتا ہوں تو میر تقی کا منسوبہ بالا شعر خود بخود میری زبان پر ورد ہو جاتا ہے ——— اللھم اغفرلہ وارحمہ!

بخاریؒ واقعی ان عظیم اشخاص میں سے تھے جن کی ہستی کی ترکیب و تعمیر میں قدرت کے غیر معمولی قوانین نے کارفرمائی کی ——— اور اگر اس ترکیب و تعمیر میں آسمان و زمان اور وقت کے تصرفات کا واقعی کچھ حصہ ہے تو یقیناً آسمان کے مدتوں کی محنت سے ان کے کمال معنوی کی عمارت تیار کی ہوگی۔

میں بخاریؒ رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست کم ملا ہوں مگر قریب سے دیکھنے کے لئے بے شمار مواقع فراہم ہوئے ہیں اور ان کی تقریریں تو بلا مبالغہ سو ڈیڑھ سو مرتبہ سنی ہوں گی جن میں وہ تقریریں بھی شامل ہیں جو مجمع عام کے لئے تھیں اور وہ بھی ہیں جن میں عالمانہ بحث و نظر کی ضرورت ہوتی تھی۔

سید صاحبؒ مرحوم کو قریب سے دیکھنے کی صورت یہ تھی کہ میں مرحوم چوہدری افضل حق کے نیاز مندان خاص میں شامل تھا ——— وہ بعض اوقات بغرض مشاورت میرے مکان پر بھی تشریف لے آتے تھے۔ اسی طرح دوسرے احرار اور حریت پسند رہنماؤں سے بھی میری اچھی علیک سلیک تھی ان وجوہ سے دفتر احرار میں میرا آنا جانا تھا اور یہ بات اس زمانے کے احباب کو اچھی طرح معلوم ہے۔

اس طرح گویا میں مجلس احرار کا ایک بے قاعدہ رکن تھا مگر سب کو یہ معلوم تھا کہ میری سرگرمیاں زیادہ تر ادبی ہیں ——— اور سیاسی بھی اگر تھیں تو احرار کی جزئیاتی اور وقتی سیاست سے میرا کوئی تعلق نہ تھا ——— مجھے تو ان کے نصب العین اور برطانوی استعمار کے متعلق ان کے جرأت مندانہ خیالات سے دلچسپی تھی!

غرض حلقہ احرار کے قرب کا مجھے موقع حاصل تھا اور میں سبھی احرار لیڈروں سے بے تکلف تھا ماسوا مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے کہ میں ان کے رعب و جلال اور ان کے حد درجہ کٹیلے انداز خطابت کی وجہ سے اپنے اندر کچھ ایسی کمی پاتا تھا کہ جس کا احساس مجھے ان کے قریب نہ ہونے دیتا تھا۔ لہٰذا میں برسوں سید صاحبؒ کو قریب سے مگر دور سے دیکھتا رہا اور خوب دیکھتا رہا۔

ہر حقیقت کو باندازِ تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلوؤں کو مگر کیا دیکھا

میں نے احرار کی مشاورتوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو حکمرانی کرتے دیکھا احرار میں بڑے بڑے مفکر اور عالم اور مقرر تھے اور انہی میں چوہدری افضل حق بھی تھے مگر سید صاحبؒ اس قبیلے کے وہ سردار تھے جن کی بات کو ٹال مٹول کر دینا کسی کے لئے ناممکن تھا، یہ اور بات ہے کہ سید صاحبؒ کی رواداری اور وسعت قلبی اکثر اس بات کو روا رکھتی تھی کہ مخلص رفقاء کے استدلال کو بھی سن لیتے تھے اور بسا اوقات وہ اپنے رفیقوں کے خلوص سے متاثر ہو کر اپنی رائے ترک بھی کر دیتے تھے مگر پھر بھی میرے اپنے خیال میں مجلس احرار کی سیاسیات کی باگ مسلسل بیس سال تک سید صاحبؒ کے ہاتھ میں رہی۔

سید صاحبؒ کو اپنی جماعت میں یہ مقام کسی چیرہ دستی یا دھاندستی کی وجہ سے حاصل نہ تھا، اس کا اصلی سبب یہ تھا، کہ سید صاحبؒ سیاسی لیڈر ہو کر بھی سیاست کے طریقے سے نہیں چلتے تھے بلکہ ان کی آراء کی بنیاد وقتی سیاست کے بجائے صحیح اور مرکزی اساسی عقائد پر تھی ! میں نے بارہا جلسوں میں سید صاحب کو مرکزی عقائد پر اڑے دیکھا اور اسی خلوص عقائد کی بنا پر وہ اکثر اپنے نقطۂ نظر کے منوانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے، اگرچہ (جیسا میں نے پہلے عرض کیا) کبھی کبھی وہ بھی احباب کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال دیا کرتے تھے۔

اگرچہ مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں جماعت احرار کی اندرونی کارروائیوں کے متعلق کچھ کہوں خصوصاً جبکہ میرا اس جماعت سے کوئی باقاعدہ تعلق نہ تھا اور میں قلبی طور پر ان کا ہمنوا ہونے کے

باوجود "حلقۂ بیرون" ورہی تھا، تاہم زمانہ گزر جانے کے بعد راز کی بات بھی راز نہیں رہتی اس لحاظ سے میں عرض کرتا ہوں کہ سید دو مرتبہ اپنے رفقاء کے خلوص کے سامنے جھکے اور اپنی رائے کو قربان کر دیا —— پہلا بڑا مرحلہ وہ تھا جس کا تعلق کانگریس کے انقطاع سے تھا —— مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سید صاحب اس اقدام سے متفق نہ تھے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ وقتی سیاست کو انگریزی استعمار کے خلاف جہاد کے اصولی اور مرکزی سوال پر تقدم حاصل نہ ہونا چاہیئے، فرقہ وار امور کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے مگر یہی فرقہ وار امور اصولی سوال کے سامنے رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں —— احرار کی یہ کشمکش دو تین مہینے تک جاری رہیں جن میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور حضرت سید صاحب الگ رائے پر تھے —— مگر افضل حق مرحوم کی ملائمت، نرمی، طریق استدلال، تحمل اور وقتی سیاسی جزیات کا علم آخر بخاری کو قائل کر کے رہا۔ مگر درحقیقت بخاری قائل ہوئے نہیں انہوں نے قربانی کی —— اور بیس تیس برس گزر جانے کے بعد اب شاید بہت سے لوگ کو یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ احرار کی وقتی سیاست نے بالآخر انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا —— مسلمان قوم کا پلیٹ فارم تو بہرحال مسلم لیگ کے پاس رہا اور احراری سیاست پر وقت پرستی کا الزام لگا رہا۔

دوسرا نازک موقعہ مسجد شہید گنج کے حوادث کی صورت میں سامنے آیا —— یہاں بھی میری معلومات کے مطابق سید صاحبؒ کی نظر مسجد کی تقدیس پر تھی اور دوسرے رفقاء بڑی حد تک (بجا طور پر) اس کو سازش سمجھتے تھے (اور وہ سازش تھی بھی) —— مگر سید صاحبؒ کا قلب سیاسی موقعہ شناسی یا مصلحت کوشی کو برداشت کر ہی نہ سکتا تھا —— ان کی نظر بنیادی اور مرکزی عقائد میں پیوست رہتی تھی —— اور میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مرکزی عقائد سے ہٹ کر مجلس احرار نے بالآخر نقصان اٹھایا۔

پھر بھی سید صاحبؒ، بالعموم مجلس احرار میں اپنی اس راست روی اور مرکزیت کی وجہ سے، بہت جلد غالب رائے کو اپنے حق میں ہموار کر لیتے تھے اور سب رفقاء کو معلوم ہے کہ احرار کی اصلی قوت سید صاحبؒ ہی تھے۔

اس مختصر مضمون میں سید صاحبؒ کے کمالات معنوی کے متعلق تفصیل سے لکھ نہیں

سکتا ـــــ اور شائد اس موضوع پر لکھنے کے لئے ان کے قریبی احباب کا مجھ سے زیادہ حق ہے تاہم ان کی گفتگو اور تقریر کے متعلق چند ارشادات کرنے کی گنجائش پاتا ہوں۔

عام خیال کے متعلق سید صاحب کا سب سے بڑا کمال ان کی خطیبانہ ساحری میں مضمر تھا، اور یہ غلط بھی نہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحبؒ کی مجلسی گفتگو بھی ان کی خطابت کے برابر برابر جادو جگاتی تھی ـــــ اور جمہور سے قطع نظر، طبقہ، علماؒ وزعما میں وہ اپنے انداز گفتگو کی وجہ سے ہی ایک فائق مقام کے مالک بنے ہوئے تھے۔

سید صاحبؒ کی گفتگو ہر مجلس اور ہر مقام کے مطابق ہوتی تھی چنانچہ علماؒ کی محفل میں کتاب وسنت کے موضوعات پر جب وہ بات کرتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص شب و روز کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا ہے، بڑے بڑے عالم ان کے سامنے دم بخود بیٹھے رہتے تھے، اس طرح اہل ادب کی محفل میں ان کی باتوں پر ادبی لطافت کا کچھ ایسا تسلسل ہوتا تھا کہ مخاطب اپنے آپ کو زعفران زار کے ماحول میں پاتا تھا۔ برجستہ عربی فارسی اردو پنجابی کے اشعار ان کی گفتگو میں مناسب مقام پر خود بخود آپہنچتے تھے اور جب سیاستدانوں کی مجلس میں ہوتے تو ان کی سیاسی معلومات کا بھی گہرا نقش بیٹھتا تھا (اگرچہ وہ سب سے زیادہ اسی جماعت سے متوحش ہوتے تھے خصوصاً اس زمانے کے مسلمان سیاستدانوں کی صحبت میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ ان بدبختوں کے دل پر خدا کے سوا ہر شے کا خوف غالب ہے۔

غرض سید صاحبؒ ہر مجلس میں مناسب موقعہ نہایت بلیغ گفتگو کیا کرتے تھے اور اس کا بڑا اثر ہوتا تھا ـــــ مگر سید صاحبؒ کی گفتگو میں بلاغت کا سب سے بڑا پہلو ان کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور طنز کا کٹیلا پن تھا ـــــ اور ان کا یہ وہ ہتھیار تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا، اور وہ اپنے خداداد ملکے کی بدولت ہر مجلس میں شریک غالب بھی ہوتے تھے اور راحت محفل بھی ـــــ ہا مرحوم افضل حق کی یہ حالت تھی کہ سید صاحبؒ جب طویل دورے پر باہر چلے جاتے تو فرمایا کرتے:۔

"شاہ جی دے بغیر ماڑیاں کھولے کھنڈر معلوم ہوندے نیں!"

اور کبھی کبھی کوئی صورت پیدا کر کے ان کا دورہ کٹوا بھی دیتے اور پھر اپنی محبت آمیز شرارت پر

بہت خوش ہوتے۔

مختصر یہ کہ سید صاحبؒ کو گفتگو کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا اور ان کے قبولِ عام میں اس چیز کا بھی بڑا حصہ تھا، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ سید صاحبؒ کا سب سے بڑا کمال ان کا خطیبانہ اندازِ تقریر تھا جس سے وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کے مجمع کو کئی کئی گھنٹوں تک مسحور کئے رکھتے تھے شاید پچھلی دو تین صدیوں میں ان سے بڑا شیوا بیان خطیب کوئی ظہور میں نہیں آیا ہوگا ——— اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو واضح اور مسلم ہونے کی وجہ سے محتاجِ ثبوت نہیں، سید صاحبؒ کی خطابت کے خصائص کا ادبی و فنی تجزیہ اگر کیا جائے تو لامحالہ ان کی ——— ORATORY کو دنیا کے بڑے بڑے آریٹرز کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھنا ہوگا ——— یونانیوں اور رومنوں کی خطابت کا فن، اپنے اسلوب کے اعتبار سے دو مختلف لہروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یونانی خطابت، اپنی کمال کے لئے ایسی شخصیتوں کی طلب گار تھی جس کا سب سے بڑا جوہر دانش ہوتا تھا، رومنوں کی خطابت اپنی بلوغ کے لئے ایسے وجود کی طلب گار تھی جس کا سب سے بڑا جوہر تدبر اور رعب سلطنت داری تھا ——— یہ تو ظاہر ہے کہ خطابت کا ایک اہم پہلو مخاطبوں کے جذبات اور تعصبات کا ادراک اور شعور ہوتا ہے مگر خطابت ہر قوم اور ہر ملک کے مطابق جدا جدا خصوصیات بھی رکھتی ہے۔ مثلاً انگریزوں کی خطابت میں سب سے زیادہ اپیل کرنے والی چیز جمہوری احساس اور معاشرے کی مادی بہبود اور اس سے مطابقت رکھنے والا جذبات آمیز عقلی استدلال ہوتا ہے۔ قدیم عربوں کی خطابت میں بدویانہ آزادی قبیلے کا فخر و غرور جس کی شاعرانہ نثر یا اجزا میں ڈھال کر پیش کرنا ہی سب سے بڑا کمال تھا۔

افسوس ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کی خطابت کی کوئی تاریخ موجود نہیں، تاہم تاریخوں میں کچھ کچھ اشارے ضرور مل جاتے ہیں، لیکن اکثر اس کا ذکر، ذاکرین اور واعظین کی فہرستوں میں پایا جاتا ہے مغلوں سے پہلے کے چند بڑے آدمی فخر مدبر اور الباب الجنان کے مصنف ملا فرذوسی وغیرہ کی خطابت کی کچھ روداد مرتب ہو سکتی ہے ———

آخری دورِ مغلیہ میں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے اور وہابی تحریک میں شاہ اسمٰعیل شہید وغیرہ نے بڑا نام پیدا کیا، یوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالرحیم بھی اچھے مقرر تھے اور بہار سے زمانے میں

سابقاً مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، عبدالماجد بدایونی اور بعد میں بہت ہی ممتاز نام مولانا ابو الکلام آزاد کا ہے ——— یہ نامکمل فہرست خطیب علماء کی ہے اس میں مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کو شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان لوگوں کی خطابت کا رنگ جدا ہے

حضرت سید صاحب مرحوم کی خطابت دراصل ایک قدیم و عظیم روایت سے تعلق رکھتی ہے۔ ——— سیّد صاحبؒ سے پہلے، قریبی زمانہ میں نامور ترین بزرگ مولانا اشرف علی تھانوی تھے، سید صاحبؒ کی خطابت کا تعلق ایک خاص حد تک انہی سے قائم کیا جا سکتا ہے۔

حضرت تھانوی کی خطابت کا اہم خاصہ، وقت کی طوالت اور اس کے باوجود دلچسپی کا قائم رکھنا تھا۔ حضرت سید صاحبؒ کے یہاں بھی یہی خصوصیت کارفرما تھی اور اگرچہ حضرت تھانوی کی تقریروں میں بھی ادب، شعر اور بذلہ و ظرافت کا ایک خاص رنگ تھا مگر آواز کی گونج اور شخصیت کا جو جلال حضرت سید صاحبؒ کو میسّر آیا وہ انہی سے مخصوص تھا۔

اس کے علاوہ حضرت تھانوی کے موضوعات عموماً ٹھنڈے ہوتے تھے ——— ان میں کہانی کا سا لطف ہوتا تھا مگر حضرت سید صاحبؒ کی تقریروں کا موضوع جوش انگیز ہوتا تھا اور اس میں رجز کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

اسی لئے میں حضرت تھانوی کو کامیاب واعظ کہوں گا اور حضرت سید صاحب کو کامیاب بلکہ غیر معمولی خطیب قرار دوں گا، حضرت تھانوی کی تقریر صرف ان کے معتقد سنتے تھے مگر حضرت سید صاحب کو ایسے اجتماعات سے واسطہ پڑتا تھا جس میں اختلاف رکھنے والوں کی موجودگی ایک یقینی بات تھی، اس لئے سید صاحب کی خطابت کو زیادہ سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

یہ تفصیل میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ ہر چند کہ حضرت سید صاحب ہندوستان کی ایک قدیم روایت خطابت کے وارث تھے مگر دراصل ان کی خطابت ادوار اور قرنوں کی حدوں سے بلند تر اور ارفع تر تھی ——— اور اس میں تاثیر، تفریح اور تلقین کی ایسی صورتیں موجود تھیں جن کے لئے صرف حضرت سیّد صاحبؒ کی شخصیت کو قدرت نے موزوں سمجھ کر منتخب کیا تھا اور بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سید صاحب کی خطابت میں عجب عناصر جمع ہو گئے ہیں ——— اگرچہ ان کی خطابت کو انگریزی خطابت سے کوئی قریبی تعلق نہ تھا اس معاملے میں انہی کے زمانے کا ایک دوسرا یکتا خطیب

ابو الکلام آزاد، حضرت سید صاحبؒ کے مقابلہ میں ارفع کمالات کا مالک نظر آتا ہے کیونکہ اس کی تقریر میں دانش، رعب و اب عربی حریت اور فرانسیسی انگریزی انداز استدلال کے سب عناصر جمع ہوتے تھے۔

حاصل کلام یہ تھے حضرت شاہ جیؒ جن کی شخصیت اور کمال کے چند نمایاں نقوش میں نے یہاں مرتب کر دیئے ہیں ؂

منشی احمد دین

شاہ جیؒ کی کہانی

مضمون نویسی میرا کام نہیں اور نہ اس کی مجھ میں صلاحیت ہے۔ ایسی حالت میں سید عطاء اللہ شاہ ایسے مجاہد کامل کی زندگی کے حالات پر قلم اٹھانا اپنی حیثیت اور قابلیت سے زیادہ ابھرنے کے مانند ہے یہ مضمون اگر شرمندۂ اشاعت ہوا تو ہزاروں لوگوں کی نظر سے گزرے گا بمضمون میں کہاں غلطی ہے اور کہاں نہیں اس پر بھی نظر جائے گی۔ ایسی حالت میں شاہ صاحب کے پردے میں اپنا چہرہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا زیب نہیں دیتا۔

تاہم جرأت کر رہا ہوں، شورش بھائی کا حکم ہے اور فرض کی ادائیگی بھی ضروری ہے علاوہ بریں مجھے اپنے ایک دوست راہبر اور بزرگ کو اپنی عقیدت کے پھول بھیجنے ہیں۔

شاہ جی زندہ تھے تو اُن سے آزادی کے بعد ملاقات کا امکان خارج از خیال تھا، کبھی کبھار زبانی سلام و پیام ہو جاتا لیکن جس دن سے اُن کی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعے آنکھوں کے سامنے آئی ہے وہ مجھے بھولتے نہیں "روز آتے ہیں میرے دل کو تسلی دینے"

ابتدائی زمانہ

سال تو مجھے یاد نہیں رہا۔ البتہ ۱۹۱۹ء سے کئی سال قبل کا زمانہ تھا جب میری

نظروں کے سامنے اُن کی نورانی کی تصویر آنے لگی۔ گو میری عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ گھر سے کام پر جانے کے لیئے میرا ایک راستہ تھا۔ دوپہر کے بعد اکثر اس راستہ میں ان کا اور میرا گذر آمنے سامنے سے ہوتا۔ میری اُن سے کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ میں ان کے نام ہی سے واقف تھا۔ اُس زمانے کے سیّد عطا اللہ شاہ کی قلمی تصویر جو آج بھی میرے سامنے ہے کچھ اس طرح سے بیان کر سکتا ہوں:۔

پانچ فٹ چھ انچ کا ایک دبلا سا مگر مضبوط نوجوان، رنگ گندمی چہرہ کشادہ اور چمکدار آنکھیں بڑی بڑی مگر چمکیلی، ناک سیدھی مگر مناسب، پیشانی کشادہ معمولی چھوٹی چھوٹی داڑھی جو سرخ و سفید چہرے پر پیاری معلوم ہوتی تھی۔ زلفیں شانوں تک تیل میں بسی ہوئیں تیل کے نشان اُن کی شیروانی کے کندھوں پر اکثر ہوتے۔ یہ نوجوان بازاروں سے گذرتا ہوا لوگوں کی نظروں کو ضرور کھینچتا چلا جاتا تھا۔ چونکہ شاہ صاحب حافظِ قرآن تھے اس لیئے اکثر لوگ اُن کو حافظ جی کہتے تھے۔

شاہ صاحب مولانا غلام مصطفےٰ صاحب مرحوم کے مدرسہ دینیات میں بغرض تعلیم پاتے اور مولانا مفتی عبدالصمد صاحب مرحوم سے سبق پڑھتے۔ اسی زمانے میں شاہ صاحب کبھی کبھی بعد از نماز جمعہ مسجد میاں جان محمد میں وعظ فرماتے مگر یہ زمانہ ان کی نوآموزی کا تھا۔

قبلہ شاہ صاحب کے خاندان کے لوگ اور بزرگ زیادہ تر امرتسر ہی میں رہائش پذیر تھے۔ اور کاروباری زندگی میں مصروف تھے۔ شاہ صاحب کا اپنے رشتہ داروں سے بہت اچھا تعلق تھا ان میں سے اکثر سے میری ملاقات تھی۔ جناب شاہ صاحب کے والد بزرگوار حافظ سیّد ضیاؤالدین صاحب موضع ناگڑیاں ضلع گجرات میں قیام پذیر تھے۔ کبھی کبھی شاہ صاحب والد صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیئے جاتے تھے۔

قومی زندگی کا آغاز

۱۹۱۹ء کے فوراً بعد جب امرتسر کے لوگ مارشل لا اور جلیانوالہ باغ کے حادثہ جانکاہ سے بُری طرح نڈھال تھے۔ یکایک لفظ خلافت سننے میں آیا۔ اس وقت مولانا محمد داؤد غزنوی

پہلے بزرگ تھے جو میدان میں نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کو مسئلہ خلافت سمجھانا شروع کیا ساتھ ساتھ دولت عثمانیہ ترکی کے خاتمہ کا ماتم بھی تھا، یہ زمانہ عالمِ اسلام پر چاروں طرف سے مصیبتوں اور آفتوں کا زمانہ تھا۔ جزیرۃ العرب اور دیگر مقامات مقدسہ غیروں کے قبضہ میں تھے۔ جب اس اجمال کی تفصیل مسلمانوں کو سنائی جانے لگی تو مسلمان عوام کے اندر صدمہ اور جوش کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

حضرت شاہ صاحب اُس وقت صرف مذہبی وعظ فرماتے تھے وہ مولانا غزنوی کے کے ساتھ شریک نہ ہوئے البتہ کبھی کبھی مولانا غزنوی کے نظریہ پر شاہ صاحب مخالفانہ انداز بھی اختیار کر لیتے۔ مجھے شاہ صاحب نے بتایا کہ ایک بار مولانا داؤد صاحب نے خود کوشش کر کے مجھ سے ملاقات کی اور کئی گھنٹوں کی ملاقات میں موجودہ مسئلہ کو کھول کر بیان کیا، تب شاہ صاحب قائل ہو گئے پھر کیا تھا پھر تو امرتسر کے مسلمانوں کی کایا ہی پلٹ گئی۔ شاہ صاحب کا عہد جوانی اور ساتھ ساتھ جوشِ ایمان اور قوتِ بیان —— ایک آگ لگ گئی۔

میرے لئے سیاسی جلسوں میں شمولیت کا پہلا موقع تھا مسئلہ خلافت اور انگریز حکومت کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کے دلوں کے زخموں پر نمک کا کام دیتی تھیں۔ امرتسر ابھی ابھی زخم کھا کر نکلا تھا مگر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور مذہبی وعظوں نے ہندو مسلمان سب کے بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا۔ اتنے میں ۱۹۱۹ء کا دسمبر آگیا اور کانگرس کا سالانہ جلسہ زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو امرتسر میں منعقد ہوا، ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی حکیم اجمل خان صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

یہ دسمبر امرتسر کے لئے تو بارانِ رحمت ثابت ہوا کہ ہندوستان کے تمام لیڈر امرتسر پہنچ گئے جو جیلوں میں تھے وہ رہا کر دیئے گئے۔ علی برادران بھی جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر وارد ہوئے تو یہ زمانہ علی برادران کے عروج کا زمانہ تھا۔ مولانا شوکت علی کی صدارت میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مولانا محمد علی نے حالات حاضرہ اور عالم اسلام کی تباہی و بربادی پر تقریر کی۔ اس جلسہ میں جناب شاہ صاحب نے تقریر فرمائی اور دس لاکھ روپیہ چندہ کے لئے اپیل کی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور روپیہ کی فراہمی شروع ہو گئی۔ مولانا ظفر علی خان اس جلسہ

میں موجود تھے مگر حکومت کی طرف سے ان کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ زمانہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان پر انگریزوں کے انتہائی عتاب کا تھا۔ مگر اسی اجتماع میں ان کو تار ملا کہ مولانا کی زبان بندی ختم کر دی گئی ہے ——— تب امرتسر کا یہ قومی ہفتہ پوری شان سے منایا گیا۔ یہیں شاہ صاحب کا گہرا تعلق علی برادران سے ہو گیا ——

کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا دورۂ پنجاب ہوا یہ دورہ زیادہ تر مذہبی تھا اور مولانا مسلمانوں سے بیعت جہاد لے رہے تھے۔ لاہور کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد رانا فیروز الدین نے (جو اس وقت خلافت کمیٹی پنجاب سیکرٹری جنرل تھے)، اعلان کیا کہ جو مسلمان مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے اس مجمع کے آخر میں شاہ صاحب حوض کے قریب ہی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی مولینا عبدالقادر صاحب قصوری بھی تھے۔ شاہ صاحب نے سنا تو سخت بے چین ہوئے۔ مولانا عبدالقادر صاحب سے کہا کہ دیکھو سب کام خراب ہو رہا ہے یہ کہہ کر شاہ صاحب نے ایک چھلانگ لگائی اور لوگوں کے گویا سروں سے گزرتے ہوئے منبر تک پہنچ گئے صدر خاموش تھا ان سے کہا کہ میں ان [illegible] اس اعلان کی وضاحت کروں گا —— مولانا عبداللہ قصوری خاموش رہے۔ شاہ صاحب نے اپنی خداداد قرأت اور بلند آواز سے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کر لیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ مولانا آزاد بھی محو حیرت شاہ صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے شاہ صاحب نے اس عظیم الشان مجمع کو چند منٹوں کے اندر اندر اپنی گرفت میں لے لیا اور اس نقطہ کی وضاحت فرمائی کہ جو لوگ پہلے کسی مرشد سے بیعت ہیں ان کی اس بیعت سے اثر نہیں پڑتا وہ بیعت ارشاد تھی اور یہ بیعت جہاد ہے"

اتنا کہہ کر اپنے ہاتھ مولانا آزاد کے ہاتھوں میں دے دیئے اور کلمات بیعت کا دور شروع کیا۔ شاہ صاحب پہلے پڑھتے پھر تمام مجمع پڑھتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تمام در و دیوار سے یہی آواز آ رہی ہے اور خشوع خضوع کا یہ عالم تھا اس وقت بلاشبہ قرن اول کا یہ واقعہ یاد آ گیا جب حضور صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مدینہ منورہ میں انصار سے بیعت لی تھی۔ ایسا منظر پھر زندگی میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ بس

واقعہ کے بعد شاہ صاحب کا تعلق مولانا آزاد سے ہوگیا۔

علی برادران امرتسر میں رہا ہو کر پہلی بار آئے تو اس وقت ان کا نعرہ مسلمانوں کے لئے ایک ہی تھا ہجرت یا جہاد کیونکہ مسلمانانِ عالم پر ایسا تاریک دور تھا کہ انہیں کوئی راستہ نہیں ملتا تھا برطانیہ پہلی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد اتنا مغرور تھا کہ وہ کسی کے خاطر میں نہ لاتا تھا۔ برطانیہ کا وزیر اعظم جنگِ عظیم کا فاتح یہودی تھا اُس نے قیصر کی حکومت کو تو پاش پاش کیا ہی تھا مگر عرب کے بھی کئی ٹکڑے کر کے رکھ دیئے۔ اس کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کا کوئی خطہ ایسا نہ تھا جو آزاد نہ تھا ایران، افغانستان، عرب، مراکش، الجزائر، مصر تمام بلادِ اسلامیہ برطانیہ یا ان کے اتحادیوں کے زیر تصرف تھے فلسطین پر جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو فاتح فوجی افسر کے سینہ پر تمغہ آویزاں کرتے ہوئے برطانیہ کے یہودی وزیر اعظم نے کہا تھا کہ یہ آدمی صلیبی جنگ کا فاتح ہے اس نے فلسطین کو فتح کیا ہے"

حالانکہ دورانِ جنگ میں برطانیہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ فتح کی صورت میں عرب اور مقاماتِ مقدسہ آزاد رہیں گے اور یہ جنگ مذہبی نہیں ہے سیاسی ہے لیکن وعدہ ہی کیا جس کو انگریزوں نے پورا کیا ہو۔

ایک وعدہ برطانیہ نے شریف حسین حاکم مکہ سے کیا تھا کہ خاتمہ جنگ پر شریف حسین کو وحدت عرب کا بادشاہ بنایا جائے گا۔ یہ دونوں وعدے اپنی جگہ پر، اور برطانیہ کے دھوکہ اور فریب کی تاریخ اپنی جگہ پر۔

انگریزوں اور امریکنوں نے مل کر یہودیوں کا وطن بنانا فلسطین کو شروع کیا جس کی داستان علیحدہ کتاب کی محتاج ہے اور آج وہ وطن موجود ہے جو تمام عرب کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے، مذکورہ بالا سوالوں پر حضرت شاہ صاحب کی پوری نظر تھی۔ جب وہ اپنی طویل تقریر میں وجد کے عالم میں آتے تھے تو ان آنے والے تاریخی واقعات کا اشارہ بھی فرماتے تھے۔

ہجرت

حضرت شاہ صاحب کی زندگی کے حالات مختصر ہی کیوں نہ بیان ہوں گے۔ ہو کچھ

رہیں گے اگر تحریک ہجرت کا ذکر ان کے ساتھ نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس تحریک کے روح رواں شاہ صاحب ہی تھے۔ گو اس قافلہ کے ہراول جناب عزیز ہندی تھے جنہوں نے پہلے پہل اس کا بیڑا اٹھایا۔ اس بات کی تفصیل آج میں کافی حد تک بیان کرنے کی پوزیشن میں ہوں جو حقیقت حال پر مبنی ہوگی۔ میرے بعد اب کوئی دوسرا آدمی زندہ بھی نہیں جو اس تحریک کے بنیادی پہلو پر روشنی ڈال سکے۔

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد ہمیشہ سے ہندوستان کے انقلاب کی پناہ گاہ رہی ہے اور افغانستان میں جب غازی امان اللہ خان برسر اقتدار آئے تو آزادیٔ ہند کے راہنماؤں کی ایک گونہ تسکین ہوئی۔ کیونکہ امان اللہ خان آزادیٔ ہند کے حامی تھے۔ مگر ان کی مجبوری تھی کہ ان کے دادا کے زمانہ ہی سے شاہِ افغانستان انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ عملاً برطانوی سفیر مقیم کابل کی حکومت افغانستان میں تھی۔ بادشاہ برائے نام ہی تھا امان اللہ نے آتے ہی پہلا حملہ جب انگریزی سرحد پر کیا تو اس وقت انگریزی فوج بہت کم تھی اور پنجاب میں تھی۔ حکومت ہند کے لئے یہ وقت بڑا مشکل تھا اس افغانی حملہ کی وجہ سے ایک تو عملاً مارشل لاء اٹھ گیا۔ دوسرے پنجاب کی شورش کے باعث انگریزوں کو امان اللہ سے عارضی صلح کرنا پڑی۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو انگریزوں کا پنجاب کو پریشان کرنے کا فیصلہ ابھی بہت باقی تھا۔ اس کا ایک فائدہ ہندوستان کو یہ بھی ہوا۔ کہ حکومت برطانیہ کی پالیسی ہندوستان کی طرف عارضی طور پر کچھ نرم پڑ گئی۔

ان تمام حالات کے باوجود ۱۹۲۰ء کا ہندوستان سخت آزمائش سے گزر رہا تھا اس کو کوئی راستہ نہ ملتا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ یہی وہ دور ہے جب ہجرت کی تحریک ربایک شروع ہوگئی اور اس کا اثر مسلمانوں پر بے پناہ ہوا۔ حضرت شاہ صاحب نے کافی غور و فکر کے بعد اس میں ہاتھ ڈالا کیونکہ حکومت افغانستان سے اپنی طرف سے ہجرت کرنے والوں کو بلایا اس سے امید کی یہ کرن پیدا ہوئی کہ شاید حکومت پر کچھ دباؤ پڑ جائے اور وہ مسلمانانِ ہند کے مطالبات پر توجہ دے سکے۔ اب شاہ صاحب نے ہجرت کی تحریک میں جان ڈالنی شروع کی۔ پنجاب۔ سندھ اور صوبہ سرحد کے اندر تو

یہ قابو سے باہر ہو گئی اور حکومت انگریزی سخت گھبراہٹ میں پڑ گئی۔ سپیشل گاڑیاں بھی چلنی شروع ہو گئیں۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر ہملٹن گرانٹ نے تو ایک قافلہ کو ہاتھ جوڑ کر روکنے کی کوشش کی مگر مسلمان سر پر کفن باندھے جا رہا اور اپنی لاکھوں کی جائیداد کو چھوڑ کر بوطن چھوڑ رہا تھا جب یہ تحریک زوروں پر تھی تب سرکار انگریزی کی مشنری حرکت میں آئی اور سینکڑوں کی تعداد میں انگریز کے ایجنٹ مسلمان ان قافلوں میں شامل ہو گئے تاکہ انتشار پیدا کر سکیں

حکومت افغانستان نے اپنی بساط کے مطابق مہاجروں کا استقبال کیا اور اور ان کو جاتے ہی زمین وغیرہ دے دی کہ یہ اپنی روزی وغیرہ کا کچھ بندوبست کریں۔ مگر انتشار پسندوں نے پہلے ان سے ہی مہاجرین کے اندر بددلی پیدا کرنی شروع کر دی حالانکہ راستہ میں غیر علاقہ کے افغانوں نے اپنے اسلامی جذبہ کا بڑھ چڑھ کر ثبوت دیا۔

اسی دوران میں ہندوستان کی تحریک خلافت کے راہنما مولانا شوکت علی نے شاہ امان اللہ خان کو ایک زبانی پیغام بھیجا۔ یہ پیغام لے جانے والا آدمی ابھی تک زندہ ہے۔ جس نے شاہ امان اللہ کو یہ پیغام دے کر اس کا ردِ عمل معلوم کرنے کی کوشش کی جو خاموشی کی صورت میں ملا۔ مولانا شوکت علی نے شاہ کو یہ پیغام دیا کہ :-

آدمی، روپیہ سب طرح سے ہم انگریز کے خلاف تمہاری مدد کریں گے۔ مگر ہندوستان کی زمین کا ایک انچ بھی نہیں دیں گے" یہ پیغام سن کر امان اللہ خان دم بخود رہ گئے۔

دوسری طرف انگریزی نے افغانستان کی خود مختاری مان لی جس کے لئے کابل کی حکومت کو اشارہ مل چکا تھا مگر ساتھ ہی کابل کی حکومت کو اشارہ مل گیا کہ حکومت ہند سے تعلقات بہتر کرنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ مہاجرین کو ہندوستان واپس بھیج دو۔ ان دونوں باتوں نے حکومتِ کابل کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اس نے مہاجرین کی طرف جو دستِ شفقت دراز کیا تھا وہ واپس لے لیا۔ تب مہاجروں کے لاکھوں کے اجتماع کے اندر پریشانی اور انتشار شروع ہوا۔ پھر وہ طبقہ بھی مہاجرین کے اندر ہی تھا۔ اس نے

بھی فائدہ اٹھایا۔ اس طرح یہ تحریک ہجرت ناکام ہوئی مگر افغانستان آزاد ہو گیا۔

اس ناکامی کے ساتھ ہی مہاجرین کے قافلے واپس آنے شروع ہوئے اور افغان سرکار کا شکوہ شروع ہو گیا۔ بات بھی یہی تھی کہ افغانستان والوں نے جس طرح دعوت دی تھی پھر ویسا سلوک نہیں کیا۔ وہ بھی مجبور تھے۔ ان کی سیاست اس کی اجازت نہ دیتی تھی اس تحریک کا اثر شاہ صاحب کی طبیعت پر بھی ہوا۔ انہوں نے اپنا قیام امرتسر کی بجائے گجرات، پنجاب میں تبدیل کر لیا۔

تحریک عدم تعاون اور قومی تعلیم

حضرت شاہ صاحب شروع میں تو عدم تشدد اور عدم تعاون کے قائل نہیں تھے بلکہ اس کے خلاف اُن کی کئی ایک تقریریں میں نے سنی ہیں۔ لیکن اگست ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سپیشل اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ جہاں گاندھی جی نے اپنا لائحہ عمل کانگریس کے سامنے رکھا۔ اس کام میں گاندھی جی تن تنہا تھے۔ صرف مولانا آزاد اُن کے ساتھ تھے۔ جن کے ساتھ گاندھی جی کی نئی نئی ملاقات ہوئی تھی

عوامی ایجی ٹیشن کے لئے شوکت علی اُن کے ساتھ تھے باقی سب لیڈر خلاف تھے۔ بلکہ اجلاس کے صدر لالہ لجپت رائے بھی اس پروگرام کے خلاف تھے۔ شاہ صاحب اسی اجتماع میں مولانا آزاد کی تقریر سے متاثر ہو کر اس پروگرام کے حق میں ہو گئے۔ جب کلکتہ سے لوٹے تو وہ ایک نئے سانچہ میں ڈھلے ہوئے تھے ـــ شاہ صاحب میں انگریز دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز کی ڈپلومیسی اور اس کی تلوار نے تمام مسلمانانِ عالم کو خون کے آنسو رُلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاہ صاحب یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اگر ہندوستان انگریز کی غلامی سے آزاد ہو تا ہے تو عالم اسلام کی غلامی کی زنجیریں سب کی ٹوٹ کر گر جائیں گی لیکن ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلمان کا اتحاد بنیادی بات ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو سب کام بیکار ہیں چنانچہ کانگریس کی راہنمائی میں ترک تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا۔ جمعیت العلمائے ہند نے پولیس اور فوج کی نوکری کے حرام ہونے کا

اعلان بھی کردیا گاندھی جی نے کہا کہ وکیل وکالت کا پیشہ چھوڑ دیں۔ اسکول اور کالج کی طالبعلمی چھوڑ دیں۔ اس فقرے پر اب سارے ملک میں کام ہونے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم اپنی تعلیم ترک کرکے درسگاہوں سے باہر آگئے تب نیشنل تعلیم کے لئے مختلف کالج اور سکول قائم ہونے جن میں قومی شروع ہوئی جس کا مقصد تھا، آزادی کی جنگ کے لیے سپاہی اور لیڈر پیدا کرنا۔

حضرت شاہ صاحب نے گجرات میں آزاد ہائی سکول کی بنیاد رکھی جیسی اُن کی طبیعت تھی ویسا ہی کام ہوا، ایک طوفان اٹھا اور گجرات جیسے ضلع سے جو سب سے زیادہ رجعت پرست مانا گیا ہے ایک لاکھ روپیہ سکول کے لئے جمع ہوگیا۔ عمارت تیار ہوگئی، ہزاروں کی تعداد میں طالب علم حصولِ علم کے لئے اس سکول میں داخل ہوئے۔ مولانا آزاد خاص کر اسی سکول کی وجہ سے گجرات تشریف لے گئے اور اہل گجرات نے اُن کا شاندار استقبال کیا۔

ایک لطیفہ

یوں تو شاہ صاحب رونق محفل تھے ہی، خلوت ہو یا جلوت، سکہ انہی کا چلتا تھا مگر قدرت نے جمع عام میں فتح کا سہرا انہی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ آزاد ہائی سکول کا چندہ کرتے کرتے شاہ صاحب کا دورہ وزیر آباد کے شہر میں ہوا جو گجرات کا ہی حصہ ہے مگر وزیر آباد کے شاطروں نے شروع سے ہی طے کر رکھا تھا کہ اس شہر میں کسی کا قدم نہ جمنے پائے، خواہ وہ کتنا نیک مقصد لے کر ہی کیوں نہ آیا ہو۔ اس سازش میں بھی انگریز پرست شامل تھے۔ جب پہلی بار گاندھی جی بھی اس شہر میں وارد ہوئے (حالانکہ وہ صرف پنجاب پر کئے گئے مظالم کی تحقیقات کے لئے گئے تھے) تو کسی نے بھی ان کو اپنے گھر پر ٹھہرانے کی جرأت نہ کی تھی۔ وزیر آبادی مسلمان کا تو یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی مہمان قومی یا مذہبی کام کے لئے باہر سے آیا ہے تو اس کی خوب خاطر تواضع کرتا اور جب پبلک جلسہ ہو یا مسجد کے اندر نماز جمعہ کا خطبہ ہو تو عین اسی حالت میں آپس میں دست و گریبان

ہو جاتا، مگر جہاں کو کوئی گزند نہ پہنچا لیکن اس طرح جلسہ کے امن پر باد کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب وزیرآباد تشریف لے گئے اور نماز جمعہ کے لئے شاہ صاحب سے درخواست کی گئی کہ آپ ہی پڑھائیں۔ شاہ صاحب کو اس شہر کے لوگوں کا کردار معلوم تھا مگر انہوں نے قبول کر لیا اور خطبہ کے ابتدائی حصّہ میں ہی مسلمانوں کو اتنا گرما دیا کہ سوائے شاہ صاحب کی بات سننے کے کسی کا اور کسی طرف خیال نہ گیا۔ شاہ صاحب نے نماز سے قبل ہی چندہ کر لیا اور روپیہ قابو کر کے اپنے ایک آدمی کے سپرد کر دیا کہ وہ لے کر گجرات چلا جائے تب نماز جمع ادا ہوئی نماز کے بعد جب ان شیطانوں کو پتہ چلا کہ وہ پھر بھی باہر جا چکا ہے تو وہ آ کر شاہ صاحب کے پاؤں پر گر گئے کہ ہم ہارے اور آپ جیتے۔ یہ قصہ شاہ صاحب کی زبانی میں نے سنا تھا۔

ابھی آزاد ہائی سکول کا کام زوروں پر تھا اور شاہ صاحب دن رات اسی میں مصروف تھے کہ امرتسر تشریف لے گئے ان کی ہمشیرہ کی شادی تھی۔ وہ ان کی تیاری کے لئے آئے تھے۔ امرتسر کے لوگوں نے نماز جمعہ کے بعد حضرت شاہ صاحب کا وعظ مسجد خیرالدین مرحوم میں رکھا یہ وعظ ان کی گرفتاری اور تین سال قید کا باعث ہوا۔ اس تقریر کا موضوع تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی ٹکر، جس میں آخری شکست فرعون کی ہوئی شاہ صاحب نے آزادئ ہند کی تشبیہ پر ختم کیا۔ شاہ صاحب کا طرز بیان اور پھر مضمون کی دلچسپی نے اہل امرتسر کو مبہوت کر دیا۔ اس کا اثر حکومت نے بھی لیا۔ دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت مقدمہ چلا کر تین سال قید سخت کی سزا دی ـــــ غالباً یہ پنجاب کا دوسرا مقدمہ تھا۔ اس سے قبل پانی پت کا مقدمہ چل رہا تھا یہ تحریک آزادی کی آزمائش کا زمانہ تھا کہ جو بھی گرفتار ہو وہ مقدمہ میں نہ تو صفائی پیش کرے اور نہ وکیل کرے، صرف ایک بیان دے کر عدالت کا فیصلہ سن لے۔ اس وقت یہ بہت اہم بات تھی اور شاہ صاحب کے لئے بھی یہ دن مشکل ہی تھا۔ مگر شاہ صاحب نے بیان میں چند آیات قرآنی تلاوت فرما کر بیان ختم کر دیا۔ اس کا اثر عدالت کے کمرہ میں ایسا ہوا جیسا کہ ماحول ہی بدل گیا ہو۔ سزا کے بعد شاہ صاحب لاہور سنٹرل جیل میں پہنچا دیئے گئے جہاں کچھ سنئے پولیٹکل قیدی پہلے

سے موجود تھے۔ اُس زمانے کی جیل کی خوراک خدا کی پناہ۔ آدمی کھا نہیں سکتا تھا۔ لاہور جیل کا داروغہ پنجاب کا مشہور جابر و ظالم جیلر تھا جس کو نواب بیگ کے نام سے یاد کرتے تھے، جب وہ شخص جیل کے اندر داخل ہوتا تو خدا کو بھول جاتا تھا

شاہ جی کا بیان ہے کہ پہلے دن کھانے کی قطار میں بیٹھا تو دو روٹیاں اور دال مجھے کے ایک برتن میں ڈال دی۔ حال یہ تھا کہ اگر دونوں ہاتھ کھول کر وہ روٹی ہاتھوں پہ نہ لی جاتی تو زمین پر دو ٹکڑے ہو کر گر جاتی۔ یہ روٹی چنے اور گندم کے آٹے کی ہوتی مگر اس میں آٹے سے زیادہ کچھ اور ہی ہوتا اور کچی رکھی جاتی تاکہ وزن ٹھیک رہے۔ میں نے دال کو دیکھا تو اس میں پانی زیادہ تھا۔ تب میں نے کوشش کی کہ پانی تھوڑا گرا دیا جائے کچھ دال کے دانے نیچے سے مل جائیں گے۔ تو روٹی کھا سکوں گا۔ میں رفتہ رفتہ پانی گراتا گیا اور اس انتظار میں رہا اب دال نظر آتی ہے مگر سب پانی ختم ہو گیا اور دال نہ ملی۔ اُدھر جیل کے بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔ کوئی دوسری صورت سامنے نہ تھی نمک مرچ یا کسی دوسری چیز کا ملنا قطعاً مشکل تھا اُس شام صرف صبر و شکر کے ساتھ صبح کرنی پڑی اس کے بعد یہ قافلہ کچھ ماہ بعد پنجاب کے سرحدی ضلع میانوالی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

میانوالی ڈسٹرکٹ جیل

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

میانوالی جیل میں ایک بعد دوسرا رنگ آزادی کی راہ اختیار کرتا ہوا پہنچا۔ اور یہ قید اہل علم و دانش کی اور سیاسی مفکروں کی مجلس بن گئی۔

گاندھی جی نے سول نافرمانی انفرادی طور پر شروع کی۔ میانوالی جیل میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عبدالمجید صاحب سالک، مولوی اختر علی خاں صاحب، صوفی اقبال احمد انصاری پانی پتی، مولانا بقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، عبدالعزیز صاحب انصاری، مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب امداد ان کے علاوہ مشہور کانگرسی بزرگ مولانا عبداللہ چوڑی والے، لالہ شنکر لال دیش بندھو گپتا وغیرہ لوگ تھے۔ باقی والنٹیر کوئی ڈیڑھ سو کے قریب تھے، میں بھی ایک رضاکار کی حیثیت سے سزایاب ہوا اور امرتسر سے میانوالی جیل میں ایک گروہ کے ساتھ پابجولاں بھیج دیا گیا کچھ دن بعد میری پہلی ملاقات جناب شاہ صاحب سے ہوئی یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔ مجھ جیسے نوآموز کے لئے یہ ماحول زندگی کا سرمایا بنا شاہ صاحب نے بکمال مہربانی مجھے قرآن کریم ناظرہ پڑھایا میں بالکل نابلد اور جاہل نوجوان تھا ان کی فیض صحبت نے میری جیل کی زندگی میں تربیت فرمائی جس کا میں شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں رکھتا۔ اس کے بعد زندگی بھر کے لئے ایک دلی تعلق قائم ہو گیا۔ جب کبھی امرتسر سے باہر دورے پہ جاتے تو واپسی پہ اپنے دورے کے خاص خاص واقعات مجھے بٹھا کر سناتے جو آج مجھے حفظ ہیں۔ ہم رہا ہوئے تو زمانہ بدل چکا تھا۔ کانگرس کی تحریک کو بند ہوئے دو سال گزر چکے تھے اور ملک کے اندر فرقہ وارانہ سرگرمیاں جاری تھیں۔ خلافت اور کانگرس تحریک کے مقابلے پر رجعت پرست مسلمان اور ہندو میدان میں اتر چکے تھے جن کو کم و بیش حکومت کی معاونت حاصل تھی۔

اہل گجرات نے شاہ صاحب کا شاندار استقبال کیا اور کوشش کی کہ وہ گجرات شہر میں ہی قیام کریں مگر وہ اپنے امرتسر شہر میں ہی آکر مقیم ہوئے۔

شاہ صاحب ہندو مسلم اتحاد کے دل سے قائل تھے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی سیاسی مقصد نہ بھی ہو تو بھی ایک اچھی شہری زندگی کے لئے نیک ہمسایہ کے طور پہ ہمیں گزر بسر کرنی چاہیئے۔ وہ ۲۳ء سے کر ۴۷ء تک پنجاب خلافت کمیٹی ہی کے ممبر رہے اور قومی کاموں کے لئے وہ باہر دورے پہ جاتے تھے کیونکہ ان کی مانگ سارے ملک میں ہمیشہ رہتی تھی جس کو وہ بخوبی پوری بھی نہیں کر پاتے تھے —— شاہ صاحب مسلمانوں کے اندر رسومات قبیح کے سخت خلاف تھے اور اس پہ ہمیشہ اپنی تقریروں میں زور دیتے جو شریعت حقہ کے خلاف تھیں۔ بعض مقامات پہ دولت مندوں سے اس کا جھگڑا بھی ہو جاتا مگر وہ اپنی بات پہ پہاڑ کی مانند قائم رہتے۔

خانقاہ ڈوگراں۔

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ایک آدمی بالکل غریب مفلوک الحال لاہور ہی میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور خانقاہ ڈوگراں چلنے کے لئے شاہ صاحب کو مجبور کرنے لگا۔ وہ انکار کرتے رہے مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ شاہ جی کو اپنے ساتھ ہی لے گیا جب شاہ صاحب تیسرے دن واپس تشریف لائے تو انہوں نے حسبِ دستور مجھے یہ بتایا کہ :-

جب میں اس بستی پہنچا تو وہاں کسی کو معلوم نہ تھا، کیونکہ مجھے لے جانے والا آدمی ہی وہ بالکل اکیلا تھا اور بستی غالباً ساری کی ساری راجپوت مسلمانوں کی تھی جن کو مذہبی وعظ وغیرہ سے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ میں ایک مسجد میں ٹھہرا۔ اُسی آدمی نے خود ہی ٹین بجا کر اعلان وعظ کیا۔ جلسہ کے لئے جو جگہ تجویز کی وہ ایک تکیہ تھا اور اس کے باہر ایک بڑا درخت تھا۔ اُس کے نیچے انتظام کیا گیا۔ جب میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو وہاں عجیب منظر تھا کوئی پچاس آدمی زیادہ سے زیادہ ہوں گے اور کوئی سو گز کے فاصلہ پہ ایک مداری اپنا کھیل وغیرہ دکھا رہا تھا جہاں ڈیڑھ سو آدمی تھے اس کیفیت کو دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کروں، یکایک مجھے خیال آیا کہ تو ہزاروں آدمیوں کی حاضری میں تو خوش ہو کر جذبہ کے ساتھ بولتا ہے مگر یہاں بھی تو خلقِ خدا ہی ہے۔ اگر اللہ کا پیغام ان چند آدمیوں کو سنائے گا تو کیا تیرا کچھ بگڑ جائے گا اس خیال کا آنا تھا کہ میرے جسم میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور میں نے دل میں دعا کی کہ مولا کچھ سامان یہاں بھی کر دے کہ تیرے بندوں میں تیرا پیغام پہنچا سکوں۔ اتنے میں ایک پولیس والا آیا اس نے ایک مداری کو جو دور تماشا دکھا رہا تھا بھگایا جو لوگ وہاں تھے وہ اب میری تقریر میں شامل ہو گئے۔ اب حاضری

دو سو کے قریب ہو گئی تب میں نے اپنے وعظ کا ڈھنگ بھی بدلا آدھ گھنٹہ کے اندر اندر گاؤں کے بڑے بڑے زمیندار راجپوت سب کے سب آ کر اس وعظ میں شریک ہو گئے۔ تب میں نے تقسیم وراثت پر قرآن حکیم کا فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا اور یہ بھی کہا کہ پنجاب کے زمیندار مسلمان جس میں سید، پٹھان، مغل، راجپوت، جاٹ سب شامل ہیں ۱۸۵۷ء سے کر آج تک جتنے بندوبست ہوئے ہیں ان سب نے قرآن سے انکار کر کے ہندو قانون یعنی رواج کو مانا ہے ایسی حالت میں ہم میں سے کون مسلمان ہے اور کون نہیں اس کا فیصلہ تم کسی مفتی شرع سے جا کر کروا لو ۔۔۔

اس بحث کا شروع ہونا تھا کہ زمیندار طبقہ اٹھا اور آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ :-

"ایک مولوی ہماری بے عزتی کر رہا ہے" اس پر شاہ صاحب بھی حالتِ جنون میں تبدیل ہو گئے اور فرمایا کہ :-

قرآن حکیم کے مکمل قانون کا انگریز کی عدالت میں کھڑے ہو کر انکار کرنا وہ بھی اس زمین جائیداد کے لئے جو اسی کی عنایت سے تمہارے پاس ہے اس پر ناراض ہوتے ہو کہ ایک معمولی مولوی ہماری بے عزتی کرتا ہے، تھوڑا سوچ لو میں لاہور سے چل کر آیا ہوں اور ریل کا کرایہ میں نے اپنی جیب سے دیا ہے واپسی کا میری جیب میں ہے۔ تمہاری مسجد کی روٹی میں نے کھائی نہیں پھر تمہارا مجھ پر دباؤ کیسا؟ رہا زمانہ جہالت کی یاد ذات کا سوال تم راجپوت یا جاٹ ہو تو میں سید ہوں پھر بھی تم سے اونچا ہوں۔ ان سب باتوں کو چھوڑ کر جب میں اللہ کا کلام سنانے کے لئے کھڑا ہوا ہوں تو پھر جواب دہی تو اس کے سامنے ہے تمہاری ہستی ہی کیا ہے؟

تین گھنٹے کی مسلسل تقریر کے بعد شاہ صاحب کی فتح ہوئی اور یہ طبقہ زمینداران بھی دنگ ہوا پھر تو شاہ صاحب کی حق گوئی اور جادو بیانی نے وہ منظر پیش کیا کہ آخر شاہ صاحب بھی خوش ہو کر اس بستی سے شام کو لوٹے۔

شاہ صاحب کی روزانہ زندگی کے واقعات کچھ اسی قسم کے ہیں اور ہر واقعہ ایک سبق لئے ہوئے ہے۔ قدرت نے اُن کو خاص کام کے لئے بھیجا تھا جو اُنہی کا حصہ تھا

مولانا محمد یٰسین

باتیں ہماری یاد رہیں گی

ایک دفعہ ان کے سامنے کسی نے خواجہ حافظ کی مشہور غزل کے یہ چند اشعار پڑھے

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئینِ سروری داند

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا است
نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

فرمایا کہ یہاں خواجہ حافظ رہ گئے اور حزیں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ پھر حزیں کے حسب ذیل اشعار پڑھے:۔

نہ ہر کہ طبل و علم ساخت سروری داند
نہ ہر کہ تاخت بہ لشکر سکندری داند!

خیالِ سایہ نشینانِ قدِ یار جدا است
وگرنہ ہر شجرے سایہ گستری داند

علوِ فطرت و طبعِ رسا خداداد است

نہ ہر گیاہ ہے کہ رویدہ صنوبری داند
زہر دہان و لب نکتہ دل نشیں شود
نہ ہر کہ خطبہ بخواند پیغمبری داند

حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری مدظلہ کی خدمت میں حاضر تھے راقم کو بھی رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ شیخ محمد اکرام ایم۔ اے کا "ارمغان پاک" دیکھا، فرمایا ذرا شعرا کی فہرست پڑھو، راقم نے حزیں بنارسی کا نام پڑھا تو کہا اس کا منتخب کلام سنائیے۔

راقم نے حزیں کا سارا کلام جو ارمغان پاک میں منتخب تھا سنایا، فرمایا جس شخص نے حزیں کے کلام کا انتخاب کرتے وقت حسب ذیل اشعار نظر انداز کر دیئے ہیں۔ اس نے حزیں سے انصاف نہیں کیا ہے، بہر حال اپنا اپنا ذوق ہے،

پھر یہ اشعار سنائے:۔

علاج بادستی ہا مبارک سینہ چاکی را
فتوح بیہودہ دگل در گریباں کردہ می آید
حزیں امشب نگاہ رہزن میخانہ پیداشش
ز مستی تکیہ ہر جانب بہ مژگاں کردہ می آید

پھر حزیں کے لوح مزار کے حسب ذیل اشعار سنائے۔

زباں دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغام شنید ایں جا
حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید ایں جا

یہ تو قلندری کی ایک بات تھی۔ اب سالک کی سنیئے (یعنی نظام الدین اولیاؒ کی،

شرط است کہ با امر خدا دم نہ زنی
کیں نوع کہ گفتی نہ تو مردی نہ زنی

گل را چہ مجال است کہ پرسد ز کلال
از بہر چہ سازی و چرا می شکنی

بیماریوں کے ہجوم اور مصائب کی یلغار میں اس کوہِ استقامت کے معتقدات میں ادنیٰ لغزش بھی رونما نہ ہوئی۔ مزاج پرسی کرنے والے کو خندہ پیشانی سے الحمدللہ کہہ کر جواب دیتے فرماتے "ہاں بھائی! الحمدللہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ اس سے بدتر حالت بھی تو ہو سکتی ہے اور میں تو ادھر سے "شر" کا قائل ہی نہیں ہوں، کوئی اللہ تعالٰے ہمارے دشمن یا شریک ہیں جو ہمیں شر اور ایذا پہنچائیں۔ ادھر تو خیر ہی خیر ہے۔ صرف ہمارا استعمال بعض چیزوں کو شر بنا دیتا ہے۔ وہاں تو خیر ہی خیر ہے۔ وہ جو کچھ ہمارے لئے کرتے ہیں بہتر ہوتا ہے۔ گو وہ ہمارے فہم سے بالاتر کیوں نہ ہو"

اس کے بعد ایک مجذوب کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ ان کی خدمت میں ایک رئیس حاضر ہوا اس نے عرض کیا "حضرت کچھ پریشانیاں ہیں، دعا کرو۔" حضرت مجذوب نے فرمایا "یہی پریشانیاں کہ خدا آپ کی بات نہیں مانتا یعنی جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا۔ تو آپ اس کی بات مان لیجئے جو اس کے زیادہ لائق ہے پریشانیاں ختم ہو جائیں گی، مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا بھائی اس کے سوا چارہ نہیں۔ الحمدللہ کہنے ہی میں خیر ہے۔ حضرت قلندر پانی پتی نے اس مسئلہ پر اعتراض کیا تو حضرت نظام الدین اولیا نے کیا خوب جواب دیا

گہے راست کند او صورت مردی و زنی
گہے بشکند جامۂ جاں راز تنی
کس نیست کہ پرسد استادِ قضا را
از بہر چہ سازی و چرا می شکنی

* * *

فرمایا میری دوستی اور دشمنی ایک دفعہ ہوتی ہے۔ اگر ایک دفعہ دوست سے گزند پہنچ جائے یا کوئی دوست بن کر مکاریوں اور فریب کاریوں کا ہدف بنائے تو عمر بھر اس پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ "چناں روم کہ دگر بگرد ما نرسی"

یہ طیفہ مشرابیہ کے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔ مکمل شعر یہ ہے ؎

شندیم خاک رہت گر بہ درد ما نرسی

چناں رویم کہ دیگر بگرد ما نرسی

کسی ایک اور محفل میں جب اپنے اس نظریہ کا اظہار فرمایا تو ارشاد ہُوا۔

دل نیست کبوتر کہ پرد باز نشیند

از گوشہ بامے کہ پریدیم پریدیم

والخیر، شما بہ سلامت۔ بس اسے کنارہ کشی سمجھئے یا دشمنی، میری طرف سے صرف اتنا ہوتا ہے۔ الحمد للہ کہ میں نے آج تک نہ کسی کے متعلق بُرا سوچا ہے اور نہ بُرا کیا ہے۔ انگریز اور مرزائی کے، جہاں تک بس چلا ان کے متعلق بُرا سوچا بھی اور کیا بھی!

"عمر بھر کبھی اعتماد نہیں کیا!" اس فقرے کو بڑے زور دار لہجے میں فرما رہے تھے، راقم نے چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ کمال مند ہے" تو فرمایا اے جاہل مند نہیں یہ ایمان ہے، حدیث میں کیا پڑھا ہے؟

لا یلدغ المومن من حجرا دلعب

مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنک نہیں کھاتا۔

٭ ٭ ٭

فرمایا لوگ تعجب کرتے ہیں کہ میں کہاں سے کھاتا ہوں؟ ہائے اصغر کس وقت یاد آئے

میں رند بادہ کش بھی ہوں بے نیاز جام و ساغر بھی

رگ ہر تاک سے آتی ہے کھنچ میری قسمت کی

میرا تو ہمیشہ خدا کی ڈھیری پہ ہاتھ رہا ہے، میرا رزق میرے پیچھے دوڑتا ہے، کبھی قبول کرتا ہوں اور کبھی رد کرتا ہوں، میں تو اپنے اللہ کا کوڑھی ہوں، مجھے وہ صرف رزق دیتا ہی نہیں بلکہ میری ٹھوڑی سے پکڑتا ہے اور میرے منہ میں ڈالتا ہے۔

بے مگس ہرگز نہ باشد عنکبوت

رزق را روزی رساں پر می دہد

دنیا میں چار قیمتی چیزیں محبت کے قابل ہیں۔ مال، جان، آبرو، ایمان، لیکن جب جان پر کوئی مصیبت آئے تو مال قربان کرنا چاہیئے اور آبرو پر کوئی آفت آئے تو مال اور جان دونوں کو۔ اور اگر ایمان پر کوئی ابتلا آئے تو مال، جان اور آبرو سب کو قربان کرنا چاہیئے اور اگر ان سب کے قربان کرنے سے ایمان محفوظ رہتا ہے تو یہ سودا سستا ہے۔"

※ ※ ※

فرمایا شریف کبھی بزدل نہیں ہوتا، کمینہ کبھی بہادر نہیں ہوتا۔ کمینے پر جب کوئی ابتلا آتی ہے تو دشمن کے سامنے ایڑیاں رگڑتا ہے۔ اور شریف۔ جب دشمن اس کے قابو میں آتا ہے تو اسے معاف کر دیتا ہے اور نہ ماضی کے کسی واقعہ پر اسے مطعون ہی کرتا ہے میاں (وہ اپنی زبان میں حضور صلعم کو میاں کے نام سے پکارتے) کی شرافت اور بہادری دیکھئے، جب حضرت عمرؓ نے ایمان لانے کے بعد عرض کیا "حضرتؐ کعبہ میں کیوں نماز نہیں پڑھتے؟" تو فرمایا

"تیری قوم نہیں پڑھنے دیتی"

حالانکہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے رکاوٹ تو حضرت عمرؓ تھے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ آپ نہیں پڑھنے دیتے تھے، سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا شرافت ہے۔"

اس کے بعد چند کمینے سیاسی لیڈروں کا ذکر آیا اور چند کمینہ صفت صحافیوں کا جو لوگوں کے ماضی کے بخیئے ادھیڑتے ہیں اور بزعم خویش اسے حب الوطنی خیال کرتے ہیں، چنانچہ اسی مناسبت سے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

خون کہ مشک گشت دلش می شود سیاہ
زاں سفلہ کن حذر کہ دولت رسیدہ است — غنی

انار دانہ پختہ شود بکند اند پوست را
لئیمہ گر بزرگ شود بر سخاند دوست را — صائب

ہر کہ صدر نشیند عزیز شد کہ غبار
گر بدیدہ فتد طوطیہ شود بود — یحییٰ

سفلۂ خوش پوشش را بر مسندِ خود جا مدہ
کفش گہر زریں بود بر سر نمی باید نہاد

٭ ٭ ٭

اس عالم کی بے ثباتی اور ناپائیداریٔ حیات کے متعلق حضرت کے ملفوظات نہایت دلچسپ اور علمی ہوتے تھے، اس موضوع پر غالب ان کا بڑا معاون ثابت ہوتا، راقم نے مختلف مجلسوں میں اس موضوع پر حسب ذیل اشعار سنے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مصرعہ ثانی کو کچھ اس رنگ سے پڑھتے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسیر دامِ خیال ہو جاتا۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

دوسرے مصرعہ میں جس نفی و اثبات کا ذکر ہے اس کے پڑھنے میں ایک عجیب سماں پیدا کرتے ہے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

یہ حیات دنیوی ان کے نزدیک مرگ کا درجہ رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنے کلام میں بھی اس طرح ذکر کیا ہے، مردیم و در انتظار مرگیم۔ فرماتے یہ کوئی حیات بے لاحول ولاقوت، ہمیں تو اس حیات کے مسئلہ میں ابو طالبؔ کلیم کی تعبیر پسند ہے۔

بدنامیٔ حیات دو روزے نبود بیش
آں ہم کلیم با تو چہ گویم چساں گزشت
یک روز صرفِ بستنِ دل شد بایں و آں
روز دگر بکندنِ دل زایں و آں گزشت

کلیم نے حیات نہیں کہا بلکہ تہمت حیات سے تعبیر کیا ہے۔"

* * *

اپنی نشست گاہ میں تشریف فرما تھے، ان دنوں روس کے مصنوعی سیارے فضا میں پرواز کر رہے اور اشتراکی مبلغ لوگوں کو یہ باور کراتے پھر رہے تھے کہ اب رو ئے مذہب اسلام آسمان پہ کوئی نہیں جا سکتا، حضرت مرحوم کے سامنے کسی نے اس کا ذکر کیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا:

ہم تو انسان کے اعلیٰ علیین پہنچنے پر ایمان لائے بیٹھے ہیں، یہ چاند اور ستارے تو راستے میں ہیں لیکن مجھے اس کامیابی (فضائی تسخیر) کوئی مسرت ہے نہ تعجب، ہم تو تب مانیں گے جب یہ موت کا کوئی علاج کر دکھلائیں اور کسی آدمی کے متعلق یہ فیصلہ کردیں کہ اب وہ نہیں مرے گا تو پھر میں انہی کو سجدہ کروں۔

مدت سے لئے پھرتا ہوں اک سجدۂ بے تاب
ان سے کوئی پوچھے وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں

* * *

کبھی کبھی اپنے احوال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے:

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

* * *

شاہ صاحب کی قرآن کریم سے شیفتگی اور والہانہ محبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ استثنائی صورتوں میں قرآن مجید کے علاوہ کسی دوسری کتاب کے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے آپ کا عقیدہ تھا کہ میرے لئے جو کچھ ہے قرآن مجید میں موجود ہے اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں پر نگاہ کر سکتی ہے تو میں دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے صرف کتاب الٰہی پر اپنی توجہ کیوں نہ مرتکز کروں، میں تو قرآن کا مبلغ ہوں میری باتوں میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی۔

خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ کے ایک جولاہے مرید کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ وہ ہر سال حضرت خواجہ کی خدمت میں ایک لنگی ہدیۃً لایا کرتا تھا، ایک سال ناغہ کرنے کے بعد دوسرے سال دو لنگیاں ہدیہ لایا، حضرت نے گزشتہ سال غیر حاضری کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کیا کہ گزشتہ سال لنگی مکمل نہیں ہو سکی تھی اس لئے حاضر نہ ہو سکا، تو فوراً حضرت نے لنگیوں کو آگ لگوادی اور فرمایا

"جہڑی شئے یار کنوں نکھیڑے اونکوں بھاہ
لا!"

یعنی جو چیز یار سے جدا کرے اسے آگ لگادو، میں بھی یہی کہتا ہوں جو چیز مجھے قرآن سے جدا کرے اسے آگ لگادو۔

چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

٭ ٭ ٭

شاہ صاحبؒ کے ایک عقیدت مند عالم دین حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرکے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ وہ اپنے پاس پاکیزہ سفر کے تاثرات بیان کر رہے تھے، دوران گفتگو انہوں نے ایک حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا کہ جب تک حج بیت اللہ کا سلسلہ جاری ہے اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، حج و طواف جب لوگ چھوڑ دیں گے تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی"۔ اس حدیث کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے رشید الدین وطوات کا حسب ذیل شعر پڑھا۔

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است
عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

٭ ٭ ٭

اوصاف حمیدہ اخلاق عظیمہ کا مجسمہ تھے، اپنی شخصیت کو ابھارنے کا خیال تک نہ لاتے

ہمیشہ دوسروں کے محاسن کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کرتے، خود بینی سے احتراز فرماتے، اکثر کہا کرتے "میں تو گندگی کا ڈھیر ہوں، اللہ میاں نے سفید چادر ڈال کر اوپر عطا اللہ لکھ دیا ہے، ارے بھائی ہم دوسروں کے عیب کیا دیکھیں ہمیں تو اپنے عیبوں سے فرصت نہیں ملتی۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

دوسروں کے عیب تلاش کرنا کوئی آدمی کا کام ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ دو باتوں میں دین کا خلاصہ ذکر کر گئے ہیں ؎

مرا پیر دانائے مرشد شہاب
دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آں کہ بر غیر بد بیں مباش
دگر آں کہ بر خویش خود بیں مباش

❖ ❖ ❖

سادہ طریق زندگی حضرت مرحوم کو بے حد پسند تھا، اسباب کی فراوانی، تکلفات کے بندھنوں کو قہرِ خداوندی سے تعبیر کرتے "افرنگی صوفے، ایرانی قالین" انہیں بہوراتے، حجاج کرام سے جب عربوں کے عیش و عشرت کے واقعات سنتے تو بے حد افسوس کا اظہار کرتے اور اپنی گرجدار آواز میں فرماتے "کروڑ لعنت ہو اس رقم پر جہاں سے فرنگی کا لطف ڈھل کر آ رہا ہے۔ دیکھو عربوں کو کس کثرت سے اسباب عیش و تنعم فراہم کر رہا ہے تاکہ یہ مشکل پسند شتربان کسی کام کے نہ رہیں"

عیش کوشی، آرزوؤں کا ہجوم، کثرتِ حاجات، خدا سے بعد کے اسباب شمار فرماتے ایک دفعہ صوفی شاعر میرؔ کا یہ شعر ؎

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

پڑھتے ہوئے فرمایا کہ حاجتیں جس قدر کم ہوتی ہیں بندہ خدا کے قریب ہوتا جاتا ہے اور

کوئی حاجت نہ ہو تو خدا ہے:

اپنے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اگر میرے ساتھ بیوی بچوں کا دھندا نہ ہوتا تو میں کسی دریا کے کنارے خاک و خس کی کٹیا میں زندگی گزارتا، وقت ضرورت اعدائے دین، دشمنان اسلام پر حملہ آور ہوتا اور پھر اپنی کٹیا میں آ پناہ لیتا"

اس کے بعد جامی، ابن یمین، احمد رضا کے چند اشعار سنائے جنہیں طوالت کے پیش نظر چھوڑ رہا ہوں، صرف جامی کے اشعار عرض ہیں ۔

نگے زیر فلکے باد
نے غم دزد نے غم کالا
گز کے بوریا و پوستکے
دل کے سوختند و ستکے
این قدر بس جامی را
عاشق رند و لاابالی را

٭ ٠ ٭

ایک عقیدت مند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ کہیں ملازمت کا امیدوار تھا اس نے اپنی آمد کا مقصد عرض کیا اور ایک آفیسر کے نام سفارشی مکتوب کی خواہش کا اظہار کیا، جواباً شاہ صاحبؒ نے فرمایا۔

" بھائی میں تو نوکریاں چھڑانے والا پیر ہوں، اگر ملازمت کے لئے کسی سفارش کی ضرورت ہے تو کسی سجادہ نشین یا کسی مرزم یا کسی بڑے لیڈر کے پاس جاؤ، ہماری آشنائی تو اس کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ کہیں ملازم ہوں اور آپ کے اعلیٰ افسر کو معلوم ہو جائے کہ یہ عطاء اللہ شاہ کا ملنے والا ہے تو فوراً آپ پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی اور آپ ملازمت سے سبکدوش ہو کر آرام سے گھر میں بیٹھے ہوں گے"

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میرا بھانجا فوج میں بھرتی ہو گیا میں اس کی والدہ کو ملنے کے لئے گیا جو میری پھوپھی زاد بہن تھی وہ اپنے بیٹے کے غم میں رو رہی تھی۔ میں نے اسے کہا دیکھو بہن! اگر تیرا

رہتا ہفتے کے اندر واپس آوے تو میرا کیا انعام ہو کچھ انعام طے پا گیا میں نے اسی روز اس کو ایک خط لکھا (وہ اس وقت بنگال کی کسی چھاؤنی میں تھا)

"عزیزم! آپ لبی مناسب جگہ پہنچ گئے ہیں۔ اپنے کام کی رفتار سے مجھے مطلع کرتے رہنا وغیرہ وغیرہ"

نیچے میں نے دستخط کئے

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری"

خط سنسر ہو کر اس یونٹ کے انگریز کرنل کو پہنچا۔ اس نے فوراً میرے بھانجے کو بلایا اور پوچھا کون ہے عطاء اللہ شاہ"؟ اس نے بتایا تو کرنل نے اسے واپس نہیں جانے دیا بلکہ اس کا سامان وغیرہ منگوا کر فوراً ہی چھاؤنی سے نکل جانے کا حکم دیا"

اس کے بعد سفارشی مکتوب لینے والے کو فرمایا "بھائی! ہمارا نام تو اس کام کے لئے ہے۔ اگر کہیں ملازم ہو جاؤ تو پھر میری خدمات حاضر ہیں۔

اے ہم نفساں! آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہمرہ ما دشمن خویش است

قاضی احسان احمد شجاع آبادی

فتوحاتِ بخاریؒ کا ایک ورق

تحفظِ اعیانِ مذہب اور امیرِ شریعت

انگریز نے اپنی مشہور رسوائے عالم پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے تحت متحدہ ہندوستان میں جہاں دیگر فتنوں کو جنم دیا وہاں اس نے اپنے مخصوص منصوبے کے پیشِ نظر ایک نہایت ہی خطرناک کھیل کھیلا، اپنے خود کاشتہ پودا کے زیرِ سایہ تربیت یافتہ قاسم علی احمدی "ایڈیٹر فاروق" قادیان سے ایک کتاب لکھوائی جو "انیسویں صدی کے مہرشی" کے نام سے ۱۹۲۳ء میں فاروق منزل قادیان سے شائع ہوئی۔

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی دنیائے آریہ سماج میں ایک زلزلہ سا آگیا، واقعی کتاب شرفا کے مجمع میں پڑھے جانے کے قابل نہیں، اس میں دیانند کی زندگی پر نہایت ہی گھناؤنے انداز میں تبصرے کئے گئے، بدبخت آریوں نے بجائے اس کے کہ کتاب کے مصنف کے پیرو مرشد مرزا غلام احمد کی زندگی کو زیرِ بحث لاتے، انہوں نے سید الاولین والآخرین رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اطہر و اقدس پر نہایت ہی سوقیانہ انداز میں تنقید شروع کی، مرزائیوں کو مسلمانوں کی ایک شاخ سمجھنے کا یہ ایک اندوہناک نتیجہ تھا آریوں کی ایک اشتعال انگیز تحریروں سے مسلمانوں میں غم و اضطراب کی لہر دوڑ گئی، ایک کتابچہ "رنگیلا رسول"

کے نام سے شائع ہوا جس کا مواد بھی مسلمان فرقوں کی باہمی چپقلش اور زبان وقلم کی تیز لویں اور مخنوں نے مہیا کیا، اس کتابچہ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی گئی، لیکن اس وقت کے ہائیکورٹ کے جج دلیپ سنگھ نے کتابچہ مذکور کے ناشر راج پال کو اس عذر پہ بری کردیا کہ قانون میں داعیانِ مذاہب کے تحفظ ناموس کے لئے کوئی دفعہ موجود نہیں، ایسے وقت جب کہ قانون بے بس ہو اور کفر و استہزا کرنے والوں کے لئے کوئی ذریعہ باز پرس موجود نہ ہو اہلِ حق کا اضطراب و الم ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔

حضرت امیر شریعت دامت برکاتہم نے اسلامیانِ ہند کو ہر شہر اور قریے میں یہ دعوت دی کہ یا تو سرورِ دو عالم ؐ کو برا کہنے والی زبان نہ رہے یا اس توہین کو سننے والے کان نہ رہیں۔

تحفظ ناموس سید المرسلین کی دعوت اور زبان حضرت شاہ صاحبؒ کی۔ آپ کی تقریروں کے معاً بعد گرفتار کیا گیا۔ ملک کے ہر گوشے میں شاہ صاحب کی آواز پہنچ گئی، ایک شخص خدا بخش نامی نے راجپال پر حملہ کیا، لیکن ناکام رہا اور اسے چودہ سال کی سزا ہو گئی، پھر ایک اور شخص عبد العزیز نے مضطرب ہو کر حملہ کیا وہ بھی ناکام رہا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی گرفتاری سے تحریک انتہائے عروج پر پہنچ گئی، انگریز کو اپنے آئین میں خامی کا اعتراف کرنا پڑا اور تعزیرات ہند میں تحفظ ناموس داعیان مذاہب کی دفعہ بڑھانی پڑی، گویا حضور خاتم النبیینؐ کی رحمۃ للعالمینی کے صدقے میں دوسری قوموں اور فرقوں کے داعیوں کے ناموس کی حفاظت ہو گئی۔

حضرت شاہ صاحب کی تقریر سے متاثر افراد میں ایک شخص علم الدین بھی تھا جس نے نشۂ عشق مصطفویؐ سے سرشار ہو کر راجپال پر ایک کاری وار کر کے اس کو کیفر کردار تک پہنچایا، غازی علم الدین شہید کے مقدمے میں بھی ایک بہت بڑا درسِ بصیرت ہے، وکلاء آئینی موشگافیاں کرتے تھے اور شاہ صاحبؒ معراجِ عشق کی راہ دکھلاتے تھے۔ وکلا کی رائے تھی کہ علم الدین اپنے مسلک کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے اعتراف قتل کرے اور کہے کہ:

"میں نے بسلامتی عقل و خرد اور بقائمی ہوش و حواس قتل کیا ہے، اگر مجھے اب

رہا کر دیا جائے اور کوئی شخص میرے آقاو مولا کی توہین کرے تو پھر اس طرح اسے قتل کر دوں گا"!

اس طرح ایک سچے مسلمان کی تصویر سامنے آجائے گی، لیکن انگریزی آئین کے شیدائیوں نے شاہ جی کی تائید نہ کی۔ پھر بھی علم الدین شہید تختۂ دار تک نشۂ عشقِ نبوی میں سرشار اقرار و اظہار صداقت کرتا رہا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت شاہ صاحبؒ کی مساعی اور غازی علم الدین کی قربانی نے آریوں کے منصوبے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیئے اور تقسیم ملک تک پھر کسی ناپاک قلم وزبان کو ایسی جسارت نہ ہوئی۔ فالحمد للہ علی ذالک!

تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۵۳ء

اور

امیرِ شریعت

تحریک ختم نبوت جو مرزائیت پر آخری ضرب کاری ہے جس کے بعد مرزائیت کھل کر مسلمانوں کے مقابلے پر نہ آسکی شاہ صاحبؒ کی غیر معمولی مساعی کی ایک جھلک ہے۔

ایک وقت تھا جب مرزائی اپنے خطرناک عزائم کی تشہیر کھلم کھلا کرتے اور ان پر قدغن لگانے کا کسی میں حوصلہ نہ تھا وہ ریاست کے اندر ریاست کے تصور اور پاکستان کو ایک مرزائی اسٹیٹ بنانے کے خواب ہی کیوں نہ دیکھ رہے ہوں، ان کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی تحریک ختم نبوت کے بعد اگرچہ بظاہر مرزائیوں پر اس وقت کی حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوئی مگر حالات نے انہیں مجبور کر دیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد شمع رسالتؐ کے پروانے اور عزت و ناموسِ رسالتؐ کے دیوانے زیادہ عرصے تک انہیں من مانی نہیں کرنے

دیں گے۔ چنانچہ مجبوراً انہیں پینترا بدلنا پڑا جس کا اندازہ آپ موجودہ خلیفہ کے متضاد بیانات سے لگائیے :۔

ا مسلمانوں سے ہمارا اختلاف بنیادی ہے

حضرت مسیح کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، آپ نے فرمایا یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کی ذات، رسول کریم صلعم، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ غرضیکہ آپ نے تفصیل سے بتایا ایک ایک چیز میں ان سے (مسلمانوں) سے اختلاف ہے"

(تقریر خلیفہ قادیان مرزا محمود اخبار "الفضل"

جلد نمبر ۱۹ نمبر ۱۳

اس کے برعکس وہ بیان جو خلیفہ صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں دیا، ملاحظہ فرمایئے :۔

مسلمانوں سے ہمارا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے

سوال :۔ کیا احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان اختلافات بنیادی ہیں ؟

جواب :۔ اگر لفظ بنیادی کا وہی مفہوم ہے جو ہمارے رسول کریمؐ نے اس لفظ کا لیا ہے تب یہ اختلافات بنیادی نہیں ہیں بلکہ فروعی ہیں۔

سوال :۔ اگر لفظ بنیادی عام معنوں میں لیا جائے پھر ؟

جواب :۔ عام معنوں میں اس کا مطلب "اہم" ہے لیکن اس مفہوم کے لحاظ سے بھی اختلافات بنیادی نہیں ہیں بلکہ فروعی ہیں

(تحقیقاتی عدالت میں مرزا محمود کا بیان ص۱۶)

تمام مسلمان کافر ہیں

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود (مرزا) کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے مسیح

موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں"۔
(آئینہ صداقت ص۳۵ مصنفہ مرزا محمود احمد خلیفہ قادیان)

اب وہ بیان جو مرزا محمود احمد نے تحقیقاتی عدالت میں دیا ملاحظہ فرمایئے۔

سوال:- کیا آپ مرزا غلام احمد صاحب کو ان ماموریں میں شمار کرتے ہیں جن کا ماننا مسلمان کہلانے کے لئے ضروری ہے؟

جواب:- میں اس سوال کا جواب پہلے دے چکا ہوں کوئی شخص جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں لاتا دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔
(ص۲۸ تحقیقاتی عدالت میں بیان)

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ ہے تحریک مسعود ختم نبوت کی فتح عظیم، یہ ہے شہدائے ختم نبوت کے خون بہا کی دنیا میں جزا، اور یہ ہے امیر شریعت مدظلہم کی ضرب کاری جس سے مرزائیت کا ایوان استبداد دھڑام سے زمین پر آرہا۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

وہ ٹولہ جو مسلمانوں کے ایمان و عقائد کو بجبر و اکراہ تبدیل کرنے پر تُلا ہوا ہو اور جس کی تکفیر سے کوئی مسلمان محفوظ نہ رہا ہو وہ اُن مسلمانوں کو جو مرزا صاحب کو نبی نہ مانتے ہوں اب دائرہ اسلام خارج قرار دینے سے انکاری ہو۔ مرزائیت کی موت سے مترادف نہیں، مرزائیت اپنی موت آپ مر گئی اور شاہ صاحب اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے، انہوں نے جہاں اپنے بدترین دشمن انگریز کو پسپا کیا وہاں اس کی خطرناک ذریت کو بھی اپنے ہاتھوں دفن کر دیا، گویا شاہ صاحب سیاسی و مذہبی دونوں لحاظ سے اپنی زندگی ہی میں کامیابی سے ہمکنار ہو گئے سیاسی لحاظ سے باشندگان ملک کو سفید فام آقاؤں کے سیاہ آئین سے چھٹکارا دلوایا اسی طرح مذہبی لحاظ سے انگریز سے زیادہ خطرناک، مذہب و ملت کے سب سے بڑے دشمن مرزائی ٹولے کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

مسئلہ وراثت

اور

امیر شریعت

ایک وقت تھا کہ جائداد کا وارث کنبے میں باپ کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا تھا، دوسری اولاد حق وراثت سے محروم رہ جاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جائداد کے ٹکڑے ہونے اور ریاست کے بٹوارہ میں پیچیدگی کے باعث ایسے صریح مسئلہ سے انحراف برتا جاتا اور جائداد منقولہ وغیر منقولہ بڑے لڑکے کے نام منتقل کر دی جاتی۔

غیر منقسم ہندوستان میں جلسوں اور کانفرنسوں میں وراثت کی شرعی تقسیم کے متعلق سب سے پہلے جس مرد مجاہد نے آواز اٹھائی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ـــــ ایک عوامی خطیب اور بیباک مقرر تھا۔ مسلمان زمیندار اور رؤساء کے لئے یہ ایک اجنبی اور ساتھ ہی خطرناک آواز تھی، دولت و اقتدار کے نشے میں سرشار رئیسوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قرآن کو غلاف میں لپیٹ کر گھروں میں رکھ دو۔ ہمیں اس کی تعلیمات کی ضرورت نہیں۔

غریب جس کی حیات وموت کا دارومدار سرمایہ دار کے اشارۂ ابرو یا جنبش زبان میں ہوتا ہے اس کا ہمنوا تھا، اس مسموم اور زہریلی فضا میں

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین

کا قدیم سبق دہرایا ـــــ ان کے ایمان وایقان کی حد کو پہنچے ہوئے انحراف جو ان کی موت وحیات کا مسئلہ بن چکا تھا کے خلاف محاذ قائم کرنا اس کے اثرات و نتائج سے بے خبر اپنی دھن میں مگن رہنا یہ صرف حضرت شاہ صاحبؒ کی مسحور کن شخصیت کا غیر معمولی اثر تھا۔ ورنہ بغیر دولت و اقتدار اور ناساعد و ناموافق حالات میں جب صرف ایک چیز کا رونا نہ ہو بلکہ سیاست و مذہب معیشت و معاشرت، ثقافت و تعلیم ایک غیر ملکی قوم اولی الامر بن کر عہدہ قضاء و عدالت پر متمکن ہو وراثت جیسے اہم مسئلے کی تبلیغ اور بیگانوں کی علاوہ یگانوں کا ہدف طعن و تشنیع بننا جان جوکھوں کا کام نہیں تو اور کیا ہے غرضیکہ

شاہ صاحبؒ

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

نے جہاں سیاسیات میں فرنگی اقتدار کو للکارا وہاں مذہبیات میں رسوم و رواج جو ہندوؤں کی مخلوط سوسائٹی کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پاچکی تھیں اور ناموں تک اثر انداز ہو چکی تھیں، اعلانِ بغاوت کیا۔ ثقافتِ فرنگی کے خطرات سے اپنی قوم کو آگاہ کیا، معاشرت و بہبود کے اسرار و رموز سکھائے۔

آپ نے کتاب و سنت کی مقررہ حدود کے اندر کسی رکاوٹ اور چیلنج کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور یہ نہ دیکھا کہ آپ کا محارب و مقابل کون ہے، وہ باطل کے مقابلے میں یکسر فرزانہ، حق کے میدان میں سربکف دیوانہ شاید اقبالؔ کے اس شعر کی عملی تفسیر ہے۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بالآخر وہ وقت آیا جب خدائے عزوجل نے شاہ صاحب کی کوہ پیمائی اور دشت نوردی کا صلہ یوں دیا کہ انڈین پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر کماری لجیاوتی نے اعلان کیا کہ ہمیں وراثت کا حصہ دلوایا جائے ورنہ ہم مسلمان ہوتی ہیں، سارا ایوان ششدر رہ گیا، کسی سے معقول جواب نہ بن پڑا تو پرنسپل چھبیل داس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بعض اوقات لڑکا کراچی کا اور لڑکی کلکتے کی ہوتی ہے۔ اس صورت میں انتقال اراضی اور تقسیم وراثت میں حد درجہ تکلیف ہوتی ہے، لجیاوتی نے جواب دیا کہ جگر کا ٹکڑا جدا کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، زمین کا ٹکڑا انتقال کرنے میں مشکلات مانع ہیں، انڈین پریس تامل و تذبذب میں پڑ گیا کہ لجیاوتی کی زبان میں کون بول رہا ہے، یہ آواز کچھ مانوس سی معلوم ہوتی ہے۔

باز گو از نجد و از یارانِ نجد
تا در و دیوار را آری بہ وجد
کز برائے صحبتے عشق سے لہا
باز گو رمزے ازاں خوشتجا لہا

الغرض پاکستان بن گیا اور پرانے حاشیہ نشینان اسلام جو اپنی طرز فکر اور طرز بیان و استدلال میں بے نظیر و بے عدیل تھے کو یہ قانون بنانا پڑا کہ آئندہ پاکستان میں وراثت کی تقسیم شریعت کے مطابق ہو گی جن کا انڈین پارلیمنٹ میں یہ اعلان ہوتا تھا کہ ہم رواج کے پابند ہیں شریعت ہمیں منظور نہیں، جو قائداور ہر خیل حکومت پاکستان کے اس قانون کی تعمیل سے عہدہ برآنہ ہو سکے کیونکہ اقتدار خود ان کا غلام تھا۔۔۔ وہ آج مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اور زرعی اصلاحات کے بعد جب زمین کو اپنے ہاتھ سے جاتے دیکھا تو وراثت کی حقدار ماں، بیٹی اور بہن بھی یاد آگئی، بفضلہ تعالےٰ شاہ صاحبؒ نے اپنی حیات میں ہی اپنے مشن کی تکمیل دیکھ لی

فالحمد للہ علیٰ ذالک

حافظ علی بہادر خاں،
ایڈیٹر "دورِ جدید" دہلی

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

انسانی زندگی یوں سوچو تو ہے ہی کیا۔ کمتر از حباب دریا ہے۔ لیکن کچھ زندگیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جن کے لئے کروڑوں انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں سے یہ آواز نکلتی ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی ایسی ہی عزیز ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستانی رفقاء ان سے مل کر آتشِ غمِ فراق ٹھنڈی کر لیتے ہیں۔ مگر بھارت کے دل افتادوں سے کوئی پوچھے کہ ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ ان کی پرانی صحبتوں کی یاد کس طرح آتی ہے۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانے کیا یاد آیا!

جن لوگوں نے پاک و ہند کی آزادی کے لئے جہاد کیا تھا۔ ان میں آج کتنوں ہی کے

جذبات یہ ہوں گے کہ موجودہ آزادی کی زندگی سے وہ جہاد کی زندگی بہتر تھی۔ جب پر ہر قدم پر امتحان تھا اور ہر مرحلے پر کڑی آزمائش تھی۔ اس وقت کا خیال آتا ہے کہ ڈونگری بمبئی کے وسیع میدان میں ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کا انتظار ہے۔ کیونکہ ہم ان کی تقریر کا اعلان کر چکے تھے۔ مگر یہ نہ پولیس کو معلوم تھا اور نہ ہی عوام کو کہ شاہ صاحب کہاں ہیں۔ پولیس وارنٹ لئے ان کے پیچھے پیچھے تھی اور وہ یکایک پلیٹ فارم پر کسی گوشے سے نکل آتے تھے۔ اس جلسے میں بھی ہم ان کو بھیس میں سے لائے اور ایک خاص پلان کے تحت پلیٹ فارم پر پہنچا دیا۔ پھر پولیس کی کیا مجال کہ پلیٹ فارم پر تقریر کے دوران گرفتار کرے۔ اس جلسے میں آزادی کی تحریکات کے مخالفین بھی تھے انہوں نے ایک پٹھان احراری رضا کار کے چھرا مار کر انتڑیاں نکال دیں۔ وہ اسی جگہ جاں بحق تسلیم ہو گیا۔

> شاہ صاحب کی اس تقریر کا کمال یہ تھا کہ اس کے قتل کے باوجود جلسے میں نظم قائم رہا۔ اور تقریر جاری رہی تقریر ختم ہوتے ہی شاہ صاحب کے گرد ایسا جلوس چلا کہ پولیس حیران رہ گئی۔ موٹروں پر موٹریں تھیں۔ ان میں بٹھا کر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انہیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ——— حالانکہ مجھے شاہ صاحب کی معیت کا فخر اس طرح حاصل نہ تھا جس طرح احراران پنجاب کو۔ لیکن جو کچھ بھی روح پرور تجربات مجھ دور افتادہ رفیق کو بھی حاصل ہوئے۔ ان کے بیان کرنے کے لئے ایک کتاب درکار ہے

ان کی طبیعت میں مزاح تھا۔ لیکن جب وہ سنجیدہ مسائل میں اپنی رائے پیش کرتے تو نہ صرف اصابت اور معاملہ فہمی کا بہترین مظاہرہ کرتے۔ بلکہ اس میں درد دل بھی شامل کر دیتے تھے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ میدان خطابت ہی کے شہسوار تھے۔ اور آزادی کی تحریکات میں ذہنی قیادت کا رول ادا نہیں کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ خطابت کے کمال نے ان کی دیگر صلاحیتوں کو شہرت

سے ہم کنار نہیں کیا۔

اب میں بھارت میں ہوں اور وہ پاکستان میں۔ اس لئے پاکستان کے رفقاء ہی بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کے مخصوص حالات اور بیماریوں کے سخت حملوں کے درمیان ان کی ذہنی قیادت کس حد تک بروئے کار آسکی۔ اور اب وہ ان کی ذہنی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہیں یا نہیں؛ لیکن ہمارے لئے ان کی معیت کے تجربوں کی یادیں ہمیشہ مشعل راہ رہیں گی۔

میری پہلی ملاقات ان سے بلگام خلافت کانفرنس میں ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا عبدالقادر قصوری کا گروپ بڑے زور وشور سے علی برادران گروپ کے مقابلے پر آیا تھا۔ یہ بہت پرانی باتیں ہیں اور اندیشہ ہے کہ نہ معلوم جہادِ حریت کے کتنے معرکے جن میں شاہ صاحب اور ان کے ہم جیسے رفیقوں نے ایک رول ادا کیا تھا۔ جدید مورخین کی بے اعتنائی یا تعصب کے باعث نسیاً منسیاً ہو جائیں۔

ضرورت ہے کہ عطاء اللہ شاہ صاحب کے دوروں اور قیادت کے تمام واقعات قلمبند کئے جائیں۔ اور اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہو تو خود شاہ صاحب کی مدد سے ان کو قلمبند کیا جائے۔ یقیناً جنگ آزادی کا یہ ایک اہم ترین باب ہوگا۔ میں رفیقانِ احرار سے اپیل کروں گا کہ اس بارے میں فوری اقدام کریں۔ کیوں کہ اقبال کی طرح یہ نعرہ لگانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

کہیں سے آبِ بقائے دوام دے ساقی

ماشاء اللہ حضرت شاہ صاحب کے کتنے ہی رفیق اہل قلم ہیں اور ان میں سے بعض کو وسائل بھی میسر ہیں۔ وقت اڑا چلا جارہا ہے۔ العجل۔ العجل۔ الساعۃ بعد الساعۃ! ابھی تو شاہ صاحب زندہ ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے اہم تاریخی واقعات میں ان کی چشم دید شہادت حاصل ہو سکے گی۔

ایک اور خطرہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جہادِ حریت کی تاریخ کی تدوین وتالیف میں حقائق وواقعات کو بدلا جارہا ہے۔ کئی قسم کے ایسے اخراف کام کر رہے ہیں جو بعض شخصیتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں اور بعض واقعات کو اپنے مخصوص تعصبات کے سانچے میں ڈھالا جارہا ہے اس لئے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی حیات ہی میں وہ تاریخ مدون ہو جائے۔ جس میں

ان کا رول اتنا نمایاں رہا ہے۔

مجلس احرار کی تحریک کی تحریک کے ساتھ خصوصاً بے انصافی کی جا رہی ہے۔ حالانکہ جہاد کا جو تصوّر دماغوں میں ہے اس کا صحیح اندازہ اسی تحریک میں نظر آیا تھا اور حضرت شاہ صاحب اس کے ممتاز ترین رہنماؤں میں سے ایک ہیں

اسی طرح ختمِ نبوّت کی تحریک کو اگر شاہ صاحب کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مسخ ہو جاتے۔ نیز ملک میں سامراج کا پانچواں کالم بہت طاقتور اور موثر ہو جاتا۔ شاہ صاحب کی تقریروں نے اس فتنے کا بروقت سدباب کر دیا۔ تحریک آزادی کے غیر مسلم علمبرداروں نے شاہ صاحب کی اینٹی قادیان تحریک کے سیاسی اثرات کا کبھی احساس نہیں کیا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ مسلمانوں کا داخلی مذہبی اختلاف ہے۔ جس کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ قادیانی تحریک کا ایک خطرناک نعرہ یہ تھا کہ انگریز اولی الامر ہیں۔ اس لیے ان کی اطاعت اور ان سے وفاداری اسلامی فرض ہے۔ بعض مفکرین نے تو زبردست دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ قادیانی مذہب کی بنیاد ہی سامراج نے قائم کی تھی اور مرزا غلام احمد اس کا صرف آلۂ کار تھے۔

اس بارے میں شاہ صاحب کا رول اتنا نمایاں ہے کہ کوئی ان کی گرد کو نہیں پہنچا۔ وفات سے قبل ہی بیماری اور دیگر وجوہ سے اس پلیٹ فارم کا ان سے چھن جانا بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ تاہم وہ اس دینی و سیاسی فتنے کی کافی بیخ کنی کر چکے ہیں اور احراری رفیقوں نے ان کی قیادت میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں

ایک اور پہلو شاہ صاحب کی زندگی کا نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ احرار نے حکومتِ الٰہیہ کی جو تحریک شروع کی تھی۔ اس میں بھی شاہ صاحب کا قائدانہ رول تھا۔ ملک کی تقسیم کے باعث اس تحریک پر زوال آ گیا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس کا احیاء ضروری ہو گا

مراد آباد کی ایک احرار کانفرنس میں جو خطبہ صدارت میں نے ایک کتاب "نظام حکومتِ الٰہیہ" کی شکل میں پیش کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کی پر زور تائید کی تھی۔

اس کانفرنس میں حضرت والا مئۃ ڈھاتک کر پنڈال میں گھسنے لگے۔ مراد آباد کے احراری

رضا کاروں نے روک کر داخلہ کا ٹکٹ مانگا۔ لیکن جب شاہ نے چہرہ کھولا تو وہ متحیر رہ گئے۔ اس طرح شاہ صاحب نے مراد آباد کے رضا کاروں کا امتحان لیا تھا۔ جس میں وہ لوگ کامیاب ثابت ہوئے اور شاہ صاحب نے ان کی بہت تعریف کی۔

ایک خاص بات عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاسی و مذہبی زندگی کو دوسرے اکثر لیڈروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ کہ ملک کے بہترین خطیب ہونے کے باوجود وہ عہدوں اور ممبریوں کی تمناؤں سے بالاتر رہتے تھے۔

کانگریس اور جمعیت العلماء پر جب مصیبت کا وقت آتا تھا تو وہ شاہ صاحب کی طرف امداد کے لئے دوڑتے تھے۔ لاہور میں جب جمعیت علماء کے اجلاس پر قبضہ کرنے اور صدر اجلاس حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اچھال دینے کا منصوبہ دشمنوں نے بنایا تھا۔ تو شاہ صاحب نے ہی احرار کے سرخپوش مجاہدین کو حکم دیا اور انہوں نے مخالفین کے کے حملہ آوروں کا ذراسی دیر میں قلع قمع کر کے جمعیتہ علماء کے لئے میدان صاف کر دیا

اسی طرح حافظ محمد ابراہیم کے الیکشن کے معرکے میں جب یہ حال تھا کہ :۔

مدد کو دوڑ دو صنم اب کفن کو آگ لگی !

تو اس وقت عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کی قیادت کام آئی تھی۔

سلطان ابن سعود کے خلاف جب برطانیہ کے پٹھو شریف حسین کی حمایت میں سارے ملک میں شور برپا کر رہے تھے اور کسی لیڈر کی مجال نہ تھی کہ اس فضا میں تقریر کر سکے۔ مگر عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس وقت بھی ہزارہا جذباتی مخالفین کو اپنی خطابت سے ایسا شیشے میں اتارا کہ وہ تقریر سن کر زار و قطار روتے تھے۔

بمبئی میں جب ایک عظیم الشان احرار کانفرنس منعقد ہوئی تو کانفرنس کے وسیع پنڈال کے تمام راستوں کی سرکاری پارٹیوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ اس کے بڑے انتظامات تھے کہ لوگ کانفرنس میں شرکت نہ کرنے پائیں۔

لیکن اس کانفرنس میں شاہ صاحب کی تقریر ہونے والی تھی۔ مخالف پارٹیوں کے یہ منصوبے ایک طرف اور شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان دوسری طرف۔ ہزارہا مسلمان آگئے

اور تقریر کامیاب ہوگئی۔

حضرت شاہ صاحب کی ان فاتحانہ مہموں کا تذکرہ اتنا طویل ہو سکتا ہے کہ اخبار کے صفحات میں ان کے لئے گنجائش نہ نکل سکے۔ اس لئے مشتے از خروارے چند واقعات پیش کر دیئے ہیں۔ یہ کرہ زمین اپنے محور پہ ہزاروں گردشیں کرنے کے بعد بھی ایسا خطیب نہیں پیش کر سکے گی۔

قلندرانہ مزاج کے ساتھ ہی سوز وگداز کا یہ عالم کہ جب تقریروں میں قرآن کی کوئی آیت پڑھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی آسمان سے نازل ہو رہی ہے۔

ایک بار مخالفوں کے زبردست اجتماع میں لوگوں کا خیال تھا کہ آج عطاء اللہ شاہ بخاری پر ضرور حملہ ہوگا۔ لیکن جب انہوں نے تقریر شروع کی تو جلسے کا رنگ دیکھتے ہوئے اول عام اصولی باتیں بیان کیں۔ پھر آہستہ آہستہ جلسے کے جذباتی ماحول پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اوّل جو باتیں کہی گئی تھیں وہ تمہید ثابت ہوئیں۔ ایسی تصریحات کیں جنہوں نے مخالفوں کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ کیونکہ پانسہ پلٹ چکا تھا جلسے کی ساری پبلک شاہ صاحب کے ساتھ ہو چکی تھی۔ تقریر کیا تھی۔ آرٹ تھا اور آرٹ بھی شاہکار۔ جب شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا:۔

بیا در ید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

افسوس کہ سرکاری مورخین نے انقلاب کی اس عظیم الشان شخصیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن انشاء اللہ ایسے ارباب قلم حلقہ احرار میں پیدا ہوں گے۔ جو سرکاری مؤرخین کی اس غلطی کی تلافی کر دیں گے۔ اور شاہ صاحب کی طرف سے انہیں جتا دیں گے کہ:۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

افسوس کہ اس عدیم الفرصتی کے باعث اور زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ جناب بابا نیاز کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔ "دور جدید" میں تحفہ بادیہ کے عنوان سے

جو سلسلہ جاری ہے اس میں شاہ صاحب کی زندگی کے تذکرے مفصل ہوں گے۔ فی الحال یہ اشارات کافی ہیں۔ ؎

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل!

نصر اللہ خاں عزیز

بطلِ حریت

۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک میرا اور شاہ جی کا سیاسی مسلک ایک ہی تھا۔ میں نے ان کے ساتھ سفر بھی کیا ہے، حضر میں بھی شامل رہا ہوں۔ ان کی تقریریں بھی سنی ہیں، ان کی کشتِ زعفران محفلوں میں بھی بیٹھا ہوں۔ ان سے مسائل میں اختلاف بھی کیا ہے اور اتفاق بھی، کانفرنسوں میں ان کی خطابت کے جوہر بھی دیکھے ہیں اور نجی مجلسوں میں ان سے معاملات پر گفتگو بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں ان کے متعلق اپنی معلومات کو حیطۂ تحریر میں لے آؤں۔

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

میں نے شاہ صاحب کو پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جبکہ ۱۹۲۵ء میں ترکِ موالات کر کے میں لائلپور سے گجرات آزاد مسلم ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر بن کر گیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے انتقال کی خبر سے ہندوستان کے اسلامی حلقوں پر غم و اندوہ کی تاریک گھٹا چھائی ہوئی تھی اور دعائے مغفرت کے لئے آزاد مسلم ہائی سکول کی عمارت کے قریب ایک پرانی ویران سی مسجد میں ایک اجتماع منعقد ہو رہا تھا۔ میں شاہ صاحب سے متعارف نہیں تھا۔ جب لوگ قرآن مجید کی تلاوت کر چکے تو میں نے دیکھا کہ ایک مولوی صاحب جن کے سر پر کھدر کی کلپاک تھی جو اس زمانے مرحوم علی برادران و منغ کی تقلید میں

عام طور پر خلافتی نارنگی پہنتے تھے موٹے کھدر کے کپڑے، کندھے پر شربتی رنگ کی چادر چھوٹی سی داڑھی، عمر ہوگی کوئی تیس برس کی منبر پر چڑھے اور نہایت پرسوز لہجے میں خطبہ مسنونہ پڑھ کے ایک انداز خاص سے قرآن مجید کی تلاوت کر کے حضرت شیخ الہندؒ کے فضائل و خدمات اسلامی کا تذکرہ کیا اور ایصال ثواب کے لئے لوگوں سے کہا کہ تم نے جو قرآن پڑھا ہے، اسے مجھے تفویض کردو تاکہ میں اسے حضرتؒ کی روح پرفتوح کو پہنچانے کے لئے اللہ سے دعا کروں، لوگوں نے خوشی سے اثبات میں جواب دیا اور ایصال ثواب کی یہ مجلس برخواست ہوگئی میں نے دریافت کیا یہ کون صاحب ہیں؟

جواب ملا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہیں

میں نے شاہ صاحبؒ کا نام اس سے پیشتر سن رکھا تھا، کیونکہ انہیں کی کوششوں سے آزاد مسلم ہائی سکول قائم ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی آتش نفس خطابت سے زندہ دلان گجرات کے دلوں میں ایثار و عمل کی آگ لگا دی تھی، طلبا سکولوں سے نکل نکل کر آ گئے تھے اور عورتوں نے اپنی بالیاں کانوں سے اتار اتار کر دے دی تھیں اور اس طرح ہائی سکول قائم ہو گیا تھا، ان کی تقریروں کی بڑی دھوم تھی، اس کے بعد گجرات میں شاہ صاحبؒ کی تقریروں کو سننے کا بارہا اتفاق ہوا، جہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور وہ غالباً تین برس کے لئے جیل بھیج دیئے گئے، گجرات میں ان کی خطابت کی ایسی تاثیر تھی کہ ضلع گجرات کے حکام ان کو گرفتار کرنے کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہ ہوئے، اور وہ ایک دوسرے ضلع کی تقریر پر گرفتار کر لئے گئے، جب وہ جیل سے نکلے تو ہوا کا رخ پلٹ چکا تھا، آزادی حریت کی تحریک کی ندی اتر چکی تھی، ہندوؤں و مسلمانوں کے فسادات شروع ہو چکے تھے، انگریز کے اقبال کا سحر اپنا کام کر چکا تھا اور طائران قفس اپنے جال کے پھندے خود بن رہے تھے، اس عالم میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے، ہندوؤں میں کتنے ہی لیڈر ایسے تھے جن کو انگریزی غلامی سے زیادہ مسلمانوں کے غلبے کا غم کھانے لگا تھا اور مسلمانوں میں کتنے ہی رہنما تھے جو ملک کی آزادی سے زیادہ ضروری مساجد کے سامنے باجہ بجانے کو روکنے کو ترجیح دیتے تھے، انگریزی حکومت مطمئن ہو چکی تھی عالم اسلام کی مصیبت پر آنسو بہانے کا دور ختم ہو چکا تھا، مگر سید عطاء اللہ

شاہ صاحب ان مردانِ عزیمت میں سے تھے، جن کے پائے استقلال کو لغزش نہیں ہوئی تھی ان کی توجہ اب بھی انگریزی اقتدار کی طرف تھی، لیکن اس توجہ میں بعض ضمنی ملی مسائل بھی شامل ہو گئے گئے تھے۔ میں ۱۹۲۳ء میں پنجاب سے نکل کر اخبار مدینہ بجنور کی ادارت سے وابستہ ہو کر یوپی چلا گیا اور شاہ صاحبؒ کی تقریروں کو سننے کا موقع ایک مدت تک نہ ملا۔ یہاں تک کہ ایک روز میں نے سنا کہ شاہ صاحب نگینہ تقریر کے لئے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ بجنور کے دوستوں نے فرمائش کی کہ شاہ صاحبؒ کو بجنور لایا جائے، ان کو دعوت دینے کی دعوت مجھے دی گئی، شاہ صاحبؒ خوشی سے اس زحمت کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور ہم نے ایک مدت کے بعد پھر ان کی خطابت کے جوہر دیکھے۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب سے ان کانفرنسوں میں ملاقات ہوتی رہی جو دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں ہوتی رہتی تھیں، ان مواقع پر کم ہی بولتے تھے۔

شاہ صاحبؒ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی حدود کو خوب سمجھتے تھے۔ اور ہر مسئلہ میں گفتگو کرنے کو شانِ قیادت کا لازمہ۔ مگر شاہ صاحبؒ اس قسم کی غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔

وہ اپنا ایک اصولی مسلک طے کر لیتے اور طے کردہ مسلک پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہو جاتے۔

اپنی خداداد خطابت کو اس کی پشتی رفتہ میں استعمال کرتے۔

ان کا مقام تبلیغ اور دعوت عمل کا ہے

غور و فکر اور فیصلہ کرنا اُن کے رفقہ کا کام ہے۔ جن کو ان کے نزدیک خدا نے اس کی صلاحیت بخشی ہے۔

جب ان کی جماعت کسی مسئلہ کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر وہ اس کی تبلیغ کے لئے خود کو ہمہ تن وقف کر دیتے

اور

اس معاملہ میں ان سے دریا کے طبع کی روانی کو نہ کوئی خطرہ روک سکتا ہے اور نہ مصائب

تکلیف کی چٹانیں اس کی راہ میں حائل ہو سکتی تھیں۔

ہمیشہ جہاد کی صفِ اول میں رہتے تھے اور ہر تحریک کی پہلی زد کو اپنے سینے پر سہتے تھے۔ چنانچہ ملک کی کوئی ایسی قومی، ملکی، ملی تحریک نہیں اٹھی جس میں انہوں نے قید و بند کو لبیک نہ کہا ہو۔

سید مظفر علی شمسی
سیکرٹری آل پاکستان تحفظ حقوق شیعہ

شاہ جی

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہ صرف خطابت کے شہنشاہ تھے۔ بلکہ پروردگار عالم نے انہیں رزم و بزم میں امتیازی شان عطا کر رکھی تھی۔ ایک شفیق بزرگ اور غمگسار دوست، وہ سراپا محبت ہی محبت تھے۔ درگزر اور معاف کرنا انہیں ورثا میں مومن تھا۔ ان میں اتنی خوبیاں تھیں کہ ہر خوبی ان پر ناز کرتی تھی۔ قدرت نے انہیں جمیل حسن کے ساتھ حسین دل بھی بخشا تھا۔ ریل ہو یا جیل رزم ہو یا بزم۔ جلوت ہو یا خلوت وہ باغ و بہار تھے۔ دنیوی غم ان سے یوں بھاگتا تھا جیسے لاحول سے ابلیس۔ وہ ارادہ کے پکے تھے۔ مصائب و آلام برداشت کرنے میں مزہ آتا تھا۔ ان کی زندگی کا محبوب شغل انگریز سے نفرت اور خاتم النبیین صلعم سے محبت تھا۔ یہی ان کا سرمایہ حیات و آخرت تھا۔ وہ زندہ رہے تو اسی لئے اور مرے تو اسی خاطر۔ وہ اکثر فرمایا کرتے کہ اس پہ مر رہا ہوں جس پہ جینا بھی زندگی ہے اور مرنا بھی زندگی۔ انگریز کے دورِ سلطنت میں متحدہ ہندوستان بقول شاہ جی کے ایک عظیم قید خانہ تھا اور وہ مرغِ نو گرفتار کی طرح پھڑکتے رہتے تھے وہ دن ان کے لئے کس قدر شاندار تھا۔ جس دن ان کا دشمنِ ملّی فرنگی یہاں سے گیا۔

قیام پاکستان کے بعد

شاہ جی نے قائد ملت خان لیاقت علی خاں صاحب مرحوم کے ملکی تائید میں دفاع واستحکام وطن عزیز کے لئے جو طوفانی دورے کئے۔ ہر موڑ پر دشمنان وطن کو ڈانٹا اور انہیں خبردار کیا کہ رسول عربی صلعم کے نام پر حاصل کی گئی سرزمین کی طرف جو نگاہ بد اُٹھے گی اسے نکال دیا جائے گا اور جو ہاتھ لپکے گا اسے کاٹ دیا جائے گا۔ وہ ایک صاف دل اور صاف گو قائد تھے۔ انہیں مذہب اور وطن دونوں سے پیار تھا۔ وطن انگریز سے چھیننا اور مذہب دشمنان رسالت سے محفوظ کرنا ان کا نصب العین تھا ان کی زندگی میں دونوں کام ہوتے اور یہ ملت اسلامیہ کا مایۂ ناز سردار اطمینان، اور کامیابی کے ساتھ اس دار فانی سے سرخرُو اٹھا۔

عوام میں ہردلعزیزی

شاہ جی ایک محبوب راہنما تھے۔ ان کا براہِ راست عوام سے رابطہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی جماعت مجلس احرار سے عوام اکثر ناراض ہوتے مگر شاہ جی سے بدظن نہ ہوتے۔ دنیا گواہ ہے کہ مجلس احرار پر مسجد شہید گنج سے زیادہ نازک وقت نہیں آیا۔ بقول شاہ جی شہید گنج کا سارا ملبہ احرار پر گرایا گیا۔ مگر اس زمانے میں بھی شاہ جی کی تقریروں میں لاکھوں کا مجمع ہوتا تھا۔ اور عہد حاضر کا خطیب اعظم ساری ساری رات اسے لئے بیٹھے رہتا۔ انہیں کبھی رُلاتا اور کبھی ہنساتا رہتا۔ سامعین مزے سے تقریر سنتے تھے۔ حتیٰ کہ مؤذن نے اذان دی اور شاہ جی نے شیدائی مؤذن کو دیکھ کر کہا سے

دی مؤذن نے آذان وصل کی شب آدھی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

شعلہ بیان خطیب

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں قادیان میں احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ اتنا بڑا اجتماع آج تک دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ شاہ جی صدر تھے۔ ضلع گورداسپور کے تمام مختلف الخیال مسلمانوں نے اس تبلیغی کانفرنس کو کامیاب کرانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لاکھوں مہمانوں کے قیام کا انتظام کرنے والے ہزاروں رضاکار موجود تھے۔ میں دینا نگر کے رضاکاران کا کمانڈر تھا۔ اس حسین و جمیل پنڈال میں جو ایک شہر بنا ہوا تھا۔ ہم لوگ باری باری پہرہ دیتے تھے۔ کیمپ میں اطلاع ملی کہ ریل کی پٹری پر ایک مولوی صاحب خون آلود حالت میں پڑے ہیں۔ میں رضاکاروں کو لے کر وہاں پہنچا۔ مولانا گاڑی سے گرے تھے۔ میں اس نیم مردہ لاش کو لے کر قادیان پہنچا۔ اور مختلف ہسپتالوں میں گیا۔ مگر کسی سے اس مظلوم کی مرہم پٹی نہ ہو سکی۔ بالآخر بندہ مجبوراً چارپائی اٹھائے جلسہ گاہ میں لایا۔ شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ اس عجیب و غریب جلوس کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے بات بتائی۔ انہوں نے میری وساطت سے عوام کو داستان سنائی۔ لوگوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا بغیر علاج کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاہ جی نے انا للہ پڑھا اور ایک سرد آہ بھری۔ پھر بپھرے ہوئے شیر کی طرح میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سلسلۂ تقریر جاری کیا۔ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی قربانی عظمیٰ بیان کی تو عوام میں کہرام مچ گیا۔

یہی وہ تاریخی تقریر تھی جس پر گورداسپور میں مقدمہ چلا۔ دیوان سکھ آنند مجسٹریٹ دفعہ ۲۰ نے چھ ماہ قید کی سزا دی۔ مگر مسٹر کھوسلہ سیشن جج نے اس قید کو تا برخاست عدالت میں بدل دیا۔ اور وہ تاریخی فیصلہ دیا کہ آج تک ایسی دستاویزات بہت کم نظر آتی ہیں۔ یہ مقدمہ کئی ماہ زیر سماعت رہا۔ ہزارہا لوگ ملک کے طول و عرض سے تاریخ پر گورداسپور آیا کرتے تھے اور شاہ جی ہر پیشی پر عدالت کے باہر احاطۂ کچہری میں نماز پڑھاتے اور وعظ کرتے اور اپنے

مؤقف کی وضاحت کرتے

ماہِ صیام کا آخری جمعہ بھی اس مقدمے میں مقدمہ میں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جمعۃ الوداع کی نماز پڑھنے کے لیے سارا ملک گورداسپور پہنچ گیا ہے۔ کئی میلوں میں پھیلی ہوئی شاہی گراؤنڈ کھچا کھچ بھر گئی۔ بقول روزنامہ "ٹریبون" چار لاکھ مسلمانوں نے شرکت کی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد عوام نے شاہ جی کی بیعت کی۔ شاہ جی کو ایک لاری کی۔ ایک سرا پگڑی کا ان کے ہاتھ میں تھا اور پھر پگڑی کے ساتھ پگڑی بندھتی گئی اور چاروں طرف پگڑیوں کا ایک جال پھیل گیا۔

لطائف اور دلچسپ گفتگو

شاہ جی نے لطائف سے اس مقدمہ میں جان ڈال رکھی تھی۔ روزانہ شیخ شریف حسین صاحب ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر عبدالمجید کے ہاں احباب کا مجمع لگا رہتا تھا۔ شاہ جی مزے لے لے کر سامعین کو خوش کرتے اور یہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ اس مقدمے میں مسٹر کرم چند سرکاری وکیل تھے بڑے ہوشیار اور لسان۔ شاہ جی کو ان سے اللہ واسطے کی ضد تھی۔ روزانہ ان پر کوئی نہ کوئی پھبتی کس دیتے اور وہ عدالت سے فریادی ہوتے۔ ایک دن مشہور بزرگ مرد رشاہ گیلانی عدالت میں کھڑے گواہی دے رہے تھے اور مسٹر چند کرسی پر بیٹھے تھے۔ گیلانی صاحب بوڑھے آدمی تھے۔ جب بات کرتے ان کے منہ سے تھوک نکلے اور سرکاری وکیل کے سر پر پڑے۔ وہ بار بار گیلانی صاحب کی طرف دیکھیں۔ مگر بھلا گیلانی صاحب کی تھوک کب رکے۔ اس سارے نظارے کو شاہ جی دیکھ رہے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور عدالت کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "جناب! بے شک مجھے جیل بھیج دیجئے۔ میں صفائی نہیں دیتا۔" عدالت نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ گیلانی صاحب نے وہ سیر تھوک سرکاری وکیل کے سر پر مل دیا ہے۔ جس سے اس کی صفائی ہو گئی ہے۔ اب مجھے صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ سرکاری وکیل فوراً کرسی سے اٹھے اور کہا واقعی گواہ کا رویہ قابلِ اعتراض ہے۔ اس پر شاہ جی نے اپنے رومال سے سرکاری وکیل کے سر کو صاف کیا اور رومال دے کر انہیں کہا کہ "ایں رومال است تحفہ ما" — جس پر عدالت میں اچھا خاصا مزاح ہو گیا سو

۔ ایں رد ملالی است تحفہ ما

انہی سرکاری وکیل صاحب کو بات بات پہ IRRELEVANT کہنے کی عادت تھی۔ شاہ جی نے ان کا نام ہی مسٹر اررلونٹ سپورٹ رکھ دیا تھا۔ مسٹر محمد علی ایم اے کی شہادت ڈلہوزی میں ختم ہوئی ہم لوگ جب واپس آتے تو ہمارے آگے سرکاری وکیل کی کار تھی۔ راستہ میں کہیں پہاڑ گرا ہوا تھا۔ ٹریفک رک گئی اور سرکاری وکیل نے اتر کر کہا "یہ کیا ہوا" اس پہ تو کوئی بولا نہیں۔ مگر شاہ جی نے نہایت معصومیت سے ہاتھ جوڑ کر فرمایا "حضور! یہ پہاڑ بھی اررلونٹ ہے۔ سرکاری وکیل شرمندہ ہو گیا۔ اور پہاڑ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

اگر چھرا جائز ہے تو گولی کیوں نہیں

سلطان ابن سعود پر عین احرام میں ایک حاجی نے چھرے سے حملہ کر دیا۔ تو سلطان کے محافظ نے چھرا مارنے والے کو گولی سے اڑا دیا۔ لاہور کے ایک جلسے میں شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ کسی نے دوران تقریر سوال کر دیا۔ کہ شاہ صاحب! کیا حرم مقدس میں گولی چلانا جائز ہے۔ کوئی اور ہوتا تو گھبرا جاتا۔ مگر شاہ صاحب نے فوراً جواب دیا۔ اے میاں! جب چھرا مارنا گناہ نہیں تو گولی چلانا کیوں جائز نہ ہو۔ معترض شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا

شاہ جی اور مولانا حسرت موہانی

حافظ محمد ابراہیم بھارت کے وزیر زراعت لیگ ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور کانگرس کے یوپی میں وزیر بن گئے۔ مسلم لیگ نے چیلنج کیا کہ اگر ہمت ہے تو کانگرس ٹکٹ پر الیکشن لڑو حافظ صاحب نے استعفےٰ دے دیا اور کانگرس کے ٹکٹ پر الیکشن کے لئے میدان میں بڑے بڑے زور کا رن رہا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی توپیں میدان میں پہنچ گئیں۔ پنڈت نہرو اور مولانا

آزاد اور جمعیت العلماء کے تمام رہنما کانگریسی امیدوار کی امداد کر رہے تھے۔ ادھر مولانا حسرت موہانی اور خاں لیاقت علی خاں مرحوم صاحب لیگ کے سٹیج سے ہزاروں کو خطاب فرما رہے تھے۔ بجنور میں جلسہ تھا۔ ایک دن پہلے شاہ صاحب حافظ ابراہیم کی امداد کو پہنچے۔ مقابلے پر مولانا عبدالسمیع تھے جو کہ لیگ ٹکٹ پر تھے۔ دونوں پارٹیوں کے جلسے ایک دن ایک وقت اور ایک ہی مقام پر تھے۔ سامعین کی تعداد کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔ کانگریس کے جلسے میں شاہ جی نے تقریر کرنا تھی اور لیگ کے جلسے میں مولانا حسرت موہانی نے۔ دونوں جلسے بالمقابل تھے۔ شاہ جی نے جو قرآن کی تلاوت کی تو ساری دنیا کانگریس کے جلسے میں آگئی۔ حتیٰ کہ مولانا موہانی بھی لیگ کا سٹیج چھوڑ کر کانگریس کے سٹیج پر پہنچ گئے۔ شاہ جی نے جب انہیں آتے دیکھا تو مسکرا کر عوام سے کہا۔

میاں! بڑے میاں کو آنے دو۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔

مولانا حسرت موہانی نے کہا۔ تمہیں دعوتِ حق دینے آیا ہوں۔

شاہ جی نے کہا ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن ......

مولانا نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ شاہ جی! ہزار تقریر کرو۔ مگر تمہارا امیدوار کامیاب ہو کر وزیر نہیں بنے گا۔

شاہ جی۔ مولانا! آپ اس حسرت میں انتقال فرمائیں گے۔ آپ وزارت کو رو رہے ہیں۔ آپ کا امیدوار تو ممبر بھی نہیں بنے گا۔ اس پر سارا مجمع ہنس پڑا۔

جیل میں بھی مردِ غازی

آدمی کا صحیح نقشہ جیل میں ہی نظر آتا ہے۔ اور اصل حقیقت جیل میں ہی ظاہر ہوتا ہے ہم نے بڑے بڑے قائدین کو دیکھا ہے کہ جیل کے باہر ان کا تقدس اور ٹیپ ٹاپ مختلف ہوتی ہے۔ مگر جیل میں حرص و ہوا کے پتلے نظر آتے ہیں۔ مگر شاہ جی کے اندر اور باہر ایک ہی وضع تھی۔ بلکہ جیل میں ان کا کردار ایک مردِ غازی، اور فقیرِ بے نیاز کا کردار ہوتا تھا۔

خوش خلقی اور محبت کے ورثہ دار تھے۔ ان کے ہمراہ قید قید نہ تھی بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم لوگ پک نک پہ آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ہر طبقے میں دوست تھے۔ بڑے اور چھوٹے کی ان کے ہاں کوئی تمیز نہ تھی۔

اہل بیت رسالت سے عقیدت

قادیان میں جب میں نے اور میرے رفقاء کار نے مجالس عزا بہ سلسلہ علیہم حضرت سید الشہدا علیہ السلام کی بنیاد رکھی۔ شاہ جی نے مقامی جماعت کو ہدایت کی کہ وہ مجالس عزا میں تعاون کریں۔ چنانچہ مولانا عنایت اللہ صاحب امیر مجلس احرار اسلام قادیان نے ان مجالس کو کامیاب بنانے کے لئے میرے ساتھ دن اور رات ایک کر دیا شاہ جی کی کوئی تقریر ایسی نہ ہوتی تھی۔ جس میں وہ اہل بیت رسالت کے فضائل بیان نہ کریں۔ وہ اپنی تقریر کو شہادت حسین علیہ السلام سے مزین کیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ حنفی المذہب تھے مگر فضائل حیدر کرار رضؓ جب بیان کرنے پر آتے تو تفضیل کی حدود پر پہنچ جاتے۔

قائد اعظم کے بعد شاہ جی

گو آج ہم میں شاہ جی نہیں مگر ان کا مشن ان کے معتقدین کے لئے مشعل راہ ہے۔ قائد اعظم کے بعد وہ پہلے محبوب رہنما ہیں جن پر سارا ملک رو دیا اور ہر طبقے نے تعزیت کی اور ان کی موت کو قیامت قرار دیا۔

شاہ جی کی خدمات جلیلہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی زندگی کا ورق ایک تاریخ ہے۔ تحفظ ختم نبوت کے لئے ان کی قربانیاں یادگار عالم ہیں۔ شاہ صاحب نے مذہب و ملت کے لئے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ جن سے شاہ جی تاقیامت زندہ رہیں گے۔

☆ ☆ ☆

محمد علی جالندھری

فقر و استغنا کا پیکر

حقیقت کا اعتراف

میرا یقین ہے کہ شاہ صاحب کو بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے میں ۱۹۳۵ء میں اس وقت ان کا شریک کار ہوا جبکہ مسجد شہید گنج کی تحریک میں مخالفت کا زور تھا، چند دن کی خاموش تحقیق کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ انگریزوں اور پھر اپنے لوگوں کی سازش سے یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے تو میں حق کی حمایت کے لئے جماعت میں شریک ہوا۔

حضرت شاہ صاحب نے بہت متوکلانہ زندگی گذاری ہے۔ تعلیم کے بعد اکثر احباب کی خواہش تھی کہ آپ ہمارے ہاں سکونت اختیار کریں، بہت سے ساتھیوں نے مکان اور زمین کی پیش کش کی مگر آپ مسکراتے رہتے کبھی فیصلہ نہ فرماتے کسی دوست نے عرض کیا کہ زمین کا خرید نا اور آباد کرنا میرے ذمہ آپ ہاں کریں، اس وقت ایک مربعہ کی قیمت سولہ صد روپے تھی فرمایا خرچ کر نیا دوں گا پھر ان کے اصرار کے باوجود جواب نہ دیا اور اب وہاں ایک مربعہ کی قیمت پانچ ہزار روپے ہے جہاں وہ خرید کر دینا چاہتا تھا۔

دنیوی خواہشات اور شاہ جی رح

ایک معتقد زمیندار نے ایک قطعہ اراضی کی پیشکش کی، مگر آپ نے حسب عادت گفتگو کا رخ

بدل دیا۔ کچھ عرصہ بعد میری اس زمیندار سے ملاقات ہوئی، میں نے اراضی حضرت شاہ صاحب کو دے دینے کے متعلق ان سے گفتگو کی۔ اور جب ملتان آیا، اپنا کارنامہ سمجھ کر یہ واقعہ حضرت شاہ صاحب سے بیان کیا تو فرمایا تم نے ان سے کیوں کہا، آپ کا کہنا میرا کہنا ہے، گویا میں مانگ رہا ہوں۔ بھائی لوگ کہا ہی کرتے ہیں، اگر میں چاہتا تو ہر شہر میں میرا مکان اور ہر ضلع میں میری زمین ہوتی

مالی مفاد سے لاپرواہی

کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی جلسہ میں شرکت کے لئے میں اور امیر شریعتؒ ایک ساتھ گئے ہیں۔ منتظمین نے مجھ سے مشورہ کیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں سفر خرچ کتنا پیش کیا جائے۔ شاہ صاحب نے اپنی فراست سے سمجھ لیا کہ میں نے کوئی رائے دی ہے، ناراض ہو کر فرمایا محمد علی۔ آخری عمر میں مجھے بے ایمان کر کے مارنا چاہتے ہو۔ تم نے مقدار رقم کی رائے دی ہے، حالانکہ میں نے تمام عمر اس کا خیال بھی نہیں کیا، آمد و رفت کا کرایہ گھر سے لے کر چلتا ہوں اور خواہش بھی نہیں کرتا کہ کوئی ضرور دے گا، اگر اللہ تعالٰے نے کسی کے ذریعے دے ہی دیا تو میں نے دیکھا بھی نہیں کہ کیا دیا۔

شاہ جی کے کردار کا ایک حسین پہلو

ایک جلسہ میں بعض منتظمین کو شک ہُوا کہ جس کے سپرد شاہ صاحب کا سفر خرچ ادا کرنا تھا اس نے پورا نہیں دیا بلکہ خیانت کی ہے، اب انہوں نے تحقیق کی یہ صورت نکالی، عرض کیا کہ جو سفر خرچ پیش کیا گیا ہے اس میں ایک نوٹ کو تیل لگا ہوا ہے لایئے ہم اسے بدل دیں، مسکرا کر فرمایا، اللہ تعالٰے کی پردہ دری کی اجازت نہیں دی، سب خاموش ہو گئے۔

شاہ جی کو کتنا احساسِ فرض تھا؟

ایک صاحب کو معلوم تھا کہ شاہ صاحب سفر خرچ کی رقم نہ دیکھتے ہیں نہ گنتے ہیں۔ اس وقت چاندی کے روپے عام تھے، صاحب جلسہ نے جتنے کھوٹے روپے تھے وہ سفر خرچ کے طور پر

سے دیئے۔ جب اسٹیشن پر جا کر ٹکٹ خریدنے لگے تو معلوم ہوا سب کھوٹے ہیں، آئندہ سال پھر اسی صاحب جلسہ نے جلسہ کی دعوت، فرمایا اگر دین کے کام کے لئے اس لئے نہ گیا کہ وہاں کھوٹے سکے ملتے ہیں تو میری اور اس کی ذہانت میں کیا فرق رہا۔

جس مکان میں انتقال فرمایا اس وقت اس کا کرایہ چالیس روپے ماہوار ہے، ایک زمانے میں یہ ۱۲ ہزار روپے کا ملتا تھا۔ مکان کے مالک حاجی عبدالرحمن صاحب ملتانی آپ کے پیر بھائی جماعتی دوست اور شیدائی تھے، حضرت شاہ صاحب کے پاس دو ہزار روپے کم تھے، نہ کسی سے قرض لیا نہ حاجی مرحوم سے ادھار کے متعلق فرمایا، حاجی صاحب کے انتقال کے بعد ایک دن فرمایا کہ دو ہزار کی کمی کے باعث بارہ ہزار میں نہ خرید سکا اب اس کی قیمت پچاس ساٹھ ہزار روپیہ ہے میں نے عرض کیا مجھ سے فرمایا ہوتا میں قرض دے دیتا، مسکرا کر فرمایا "تم جماعت کے حساب سے دیتے، میں جماعت سے ایک پیسہ لینا بھی بطور قرض کے پسند نہیں کرتا"۔ میں نے عرض کیا میں اپنے پاس سے دے دیتا۔ فرمایا اللہ تعالےٰ کو منظور نہیں تھا، ایک دفعہ ایک قطعہ اراضی بہت ہی موزوں جگہ پر ملتا تھا، میں نے بہت ہی اصرار کیا، فرمایا میرے پاس قیمت نہیں ہے، قرض دینے پر اصرار کیا مگر قبول نہ فرمایا۔

شاہ جی بطور ایک امین کے

ملک کے اہل ثروت دوست اپنی زکوٰۃ ہزاروں کی تعداد میں امیر شریعت مرحوم کے پاس بھیج دیتے کہ آپ اپنی صوابدید پر تقسیم کریں، ایسی رقم تھیلیوں میں بالکل علیحدہ رکھی رہتی، سال بھر اس میں سے بیوہ عورتوں، یتیموں اور تنگ دست سفید پوشوں میں تقسیم ہوتی رہتی

جب جماعت میں ایسی رائے پیش ہوتی جس میں آپ کی رائے خلاف ہوتی تو ایک دو دفعہ دلائل سے سمجھا کر خاموش ہو جاتے۔ اپنی بات منوانے پر اصرار نہ فرماتے، جب ان کی رائے کے خلاف احباب فیصلہ کر لیتے تو کبھی شکوہ نہ فرماتے۔

شاہ صاحب ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے کیونکہ شاہ جی کی دور رس نگاہیں آنے والے حالات بخوبی دیکھ رہی تھیں۔

چنانچہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں غیر جانبدار رہنے پر اصرار تھا، مگر سب سے زیادہ میں حصہ لینے پر مصر تھا، جب میٹنگ میں میں نے آپ کی رائے کے خلاف تقریر کی تو مسکرا کر تعجب سے فرمایا "اچھا" خیر فیصلہ انتخاب لڑنے کا ہو گیا، میرے حلقہ میں تقریر کرنے تشریف لے گئے، مغرب کے وقت سخت سنجار ہو گیا ۶ میل پر جا کر تقریر کرنا تھی اور وہیں قیام تھا، سخت سردی تھی، آدھ میل جا کر میری کار خراب ہو گئی، آدمی صرف دو تھے، ریگستانی راستہ تھا ۵ میل تک کار کو دھکیل کر لائے خود اترتے ہمارے ساتھ کار کو دھکا لگاتے، سیاہ کمبل اوڑھے ہوا تھا اور اپنے قلندرانہ انداز میں "لعنت بر پدر فرنگ" کا نعرہ کبھی کبھی لگا لیتے تھے۔ مجھ سے کوئی شکوہ نہ کیا۔

ہری پور ہزارہ میں آل انڈیا کانفرنس کے موقعہ پر مرکزی صدر کا چناؤ تھا۔ آپ نے حافظ گل بہادر آف بمبئی کا نام پیش ہوا، میں نے جناب شیخ حسام الدین کا۔ فرمایا بھائی محمد علی ہم نے جماعتی انتخاب میں کبھی رسہ کشی نہیں کی تم اپنی تجویز واپس لے لو، میری خواہش ہے کہ حافظ صاحب کو صدر منتخب کر لیا جائے، میں نے کہا کہ اس رسم یعنی کہ انتخاب متفقہ ہو اس طرح بھی پورا کیا جا سکتا ہے کہ آپ اپنی تجویز واپس لے لیں، ورنہ ووٹنگ ہو جائے، تین دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میری رائے قبول کر لیں، میں نے ہر دفعہ جواب دیا کہ آپ اپنی تجویز واپس لے لیں یا ووٹنگ کرا لیں، چوتھی دفعہ مسکرا کر فرمایا

"میں اپنی تجویز واپس لیتا ہوں"۔

جب کبھی ایسا موقعہ ہوتا کہ تقریر ہی مجھ سے اللہ تعالےٰ نے کوئی عمدہ بات کہلوا دی ہے تو جب اسے اپنی تقریر میں بیان فرماتے تو یوں اظہار فرما دیتے کہ

"مولانا محمد علی نے یوں فرمایا"۔

اور فرماتے کہ اگر بات دوسرے سے سن کر بیان کی جائے تو اس کا اظہار کیا جائے، کسی عمدہ بات کو اس کی طرف منسوب نہ کرنا بیان کی خیانت ہے۔

شاہ جی کے کردار کا ایک پہلو

میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ آپ میں حسد، عجب، کبر نام کو نہ تھا۔ البتہ خودداری کا پہاڑ تھے

کوئی شخص جس فن میں کمال رکھتا ہو، اس فن میں سوائے اپنی اولاد کے کسی اور کو برداشت نہیں کرتا لیکن حضرت شاہ صاحبؒ فن تقریر میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، مگر جب دوسرے شخص تو تقریر کرتے سنتے تو خوشی سے جھومتے اور چہرہ مبارک چاند کی طرح چمکتا، ماشاءاللہ فرماتے، اور فرماتے اب میری ضرورت نہیں، چنانچہ دو دفعہ ایسا ہوا، آپ کی تقریر کا اعلان تھا جلسہ میں ہجوم کی وجہ سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، لوگ چشم براہ تھے اور ان سے پہلے میری تقریر تھی، میری تقریر کے بعد اعلان کر دیا کہ اس تقریر کے بعد میں تقریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا جلسہ برخواست کرتا ہوں، انہوں نے ایسا ایک دفعہ نسبت روڈ لاہور اور دوسری بار کمپنی باغ سرگودھا میں ایسا کیا۔

شاہ جیؒ کی انکساری اور فراخدلی

اپنے آپ کو بڑا بنانے سے گریز فرماتے، جب لیاقت علی خان ملاقات چاہتے تھے اس وقت مرکزی جماعت کے صدر ماسٹر تاج دین اور صوبے کا صدر میں تھا، ہم نے بہت کوشش کی کہ آپ ملاقات قبول فرمالیں، لیکن آپ نے بار بار یہی جواب دیا کہ صدر کو ملاقات کرنی چاہیئے، دونوں صدروں میں سے کوئی مل لے، اللہ اللہ ایسے وقت جماعتوں میں ہر رکن یا عہدے دار کو پچھاڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر آپ ضابطہ پیش فرما کر پیچھے ہٹ جاتے اور فرمایا کرتے میں ایسی جماعت میں رہ نہیں سکتا جہاں کہنی مار کر دوسرے کو پیچھے کرنے کی عادت ہو۔

ملک اسلم حیات
صدر بار ایسوسی ایشن لاہور

بخاریؒ کی یادیں

وہ ہستیاں الٰہی کس دیس میں بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

تقسیم ملک سے پہلے ایک دن شاہ جیؒ کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے اچانک لحنِ داؤدی میں بلند آواز سے یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

مناں مجھ مست بن خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

حاضرین جھوم اٹھے اور اس تصوّر میں کھو گئے کہ واقعی جب شاہ صاحبؒ داغ مفارقت دے جائیں گے تو دنیا کی رنگینیوں پر کیا اثر پڑے گا، اب جب کہ تصوّر حقیقت میں ڈھل گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ کا دنیا سے اٹھ جانا کچھ عجب سا سانحہ ہو گیا ہے۔

وہ مردِ درویش جن کی ایک کڑک نے بڑے بڑے سرکشوں کو جھکا دیا، جس کی حق گوئی اور بے باکی کے آگے سلطنتِ برطانیہ کی طاغوتی طاقت نہ ٹھہر سکی جس کے زمزمے فضائے ہند میں تیزی سے گونجے، جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس پر ہر مکتبۂ خیال نے آنسو بہائے۔ والٹیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے بستر پر چھینکتا تھا تو یورپ کے تخت لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ یہی شاہ صاحبؒ کا حال تھا کہ ان کے نام سے برطانوی سامراج لرزہ براندام

ہو جاتا تھا۔

شاہ جی کی خدمت میں جو کوئی ایک دفعہ حاضر ہوا وہ ہمیشہ کے لئے اُنہی کا ہو گیا۔ میں جب پہلی دفعہ شاہ صاحبؒ سے ملا تو مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ شاہ صاحب سے میری بڑی پرانی جان پہچان ہے۔ کوئی بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک اور دوست نے شاہ جی سے پہلی ملاقات کے بعد بے ساختہ یہ شعر پڑھا،

تجھ سے اب مل کر تعجب ہے کہ عرصہ اتنا
آج تک تیری جدائی میں کیوں کر گزرا

انسان خواہ کتنا ہی بہادر ہو، کتنا ہی شہ زور ہو، موت کا سرد اور بے رحم ہاتھ اسے وقتِ موعود پر آ دبوچتا ہے۔

وہ ہستی جس نے سر سے لے کر پیر تک زندگی کی ساری عمارت اپنے ہاتھ سے کھڑی کی

جس نے اس عمارت کی ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے چُنی ہو۔

جس نے بادشاہوں کو دعوت مبارزت دی تھی،

جس نے وقت کے فرعونوں کو للکارا،

جو باطل کے خلاف صف آرا رہا،

جب موت اس کے پاس آئی تو وہ اس کے سامنے جھک گیا، دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی

شاہ صاحبؒ کی بیماری کی خبریں کئی ماہ سے سن رہے تھے، آخر وہ گھڑی آ گئی جب وہ عظیم شخصیت ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔

اب اس کی یاد باقی ہے، اس کے معرکوں کی گونج تاریخ کے صفحات میں سنی جائے گی۔ اس کی عظیم خطابت کے قصّے لوگوں کی زبانوں پر رہیں گے۔ اس کی بہادری کی داستان ضرب الامثال بنے گی۔ مگر جس نے دنیا کو اتنا کچھ دیا اس کی زندگی ہمیشہ دکھی رہی، وہ جن کے لئے لڑتا رہا انہوں نے وقت کی مصلحتوں کا ساتھ دیا اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے سے انکار کر دیا۔ مگر ایک دن آئے گا جب مؤرخ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے گا اور

اور پھر معلوم ہو گا کہ بخاری کے دل میں قوم کے لئے کتنا درد تھا اور وہ جو کچھ کہتا تھا اس میں کتنا خلوص تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کو خداوند کریم اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ ان کے مزار مقدس پر اپنے انوار برسائے کہ انہوں نے اپنی زندگی قوم پر نثار کی۔

پروفیسر خالد بزمی ایم۔ اے (عربی) ایم۔ اے (اسلامیات)

چند باتیں — چند یادیں

ڈک۔ ڈک، ڈک، ڈک۔ ڈک، ڈک۔

"برادران اسلام! آج رات کو ——— بعد نماز عشا ——— مسجد خیر الدین مرحوم میں ——— امیر شریعت سید عطاء اللہ صاحب بخاریؒ ——— تقریر فرمائیں گے۔ آپ حضرات کو چاہیئے کہ جوق در جوق تشریف لا کر جلسے کی رونق کو ——— دوبالا فرمائیں"

ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک

یہ ڈھنڈورے کے وہ الفاظ ہیں جو اکثر امرتسر کے بازاروں اور سڑکوں پر گونجا کرتے تھے اور جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریر ہے تو الفاظ ڈھنڈورے سے زیادہ لوگوں کی زبانوں کے ذریعے سارے شہر میں پھیل جایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ امرتسر میں جب بھی شاہ جی کی تقریر ہوتی تو مسجدوں میں خاص طور پر یہ خبر کسی خاص اہتمام یا انتظام کے بغیر ہی از خود ہر نمازی تک پہنچ جاتی تھی ——— اور اگر تقریر مسجد خیر الدین میں ہوتی تو لوگ اکثر عموماً عشا کی نماز وہیں ادا کرتے تھے تاکہ اسٹیج کے قریب ہی جگہ حاصل ہو جائے میں نے لوگوں کو شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے اس طرح ٹولیاں بنا کر جلسہ گاہ کی طرف جاتے دیکھا ہے جس طرح لوگ عموماً عید کی نماز پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ میں بھی اپنے بچپن ہی سے ہمیشہ ان ٹولیوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے بچپن سے تقریریں سننے کا شوق

بہت زیادہ تھا اور خصوصاً عطاء اللہ شاہ صاحبؒ کی تقریر کے لئے تو میرے والد اور بھائی صاحب بھی ضرور جاتے تھے۔ مختلف مشاہیر ملت کی تقریروں میں شامل ہونے کی عادت تو مجھے اپنے والد صاحب ہی سے ملی ہے جو خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر سید داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، چوہدری افضل حق، شیخ حسام الدین، مظہر علی اظہر، تاج الدین انصاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی تقریروں اور مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے مناظروں میں ضرور شامل ہوتے رہے ہیں۔

میں اتفاقی طور پر ان میں سے صرف مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور چوہدری افضل حق مرحوم کی تقاریر سے محروم رہا ہوں۔ میں نے جس شخصیت کی تقریریں زیادہ سنی ہیں وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہیں، گویا اس سلسلے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد لاہور میں شاہ جی کی جس قدر تقریریں ہوئی ہیں شاید ہی کسی تقریر سے غیر حاضر رہا ہوں گا۔

٭ ٭ ٭

شاہ جی کی ہر تقریر کے موقع پر بلا مبالغہ اگر لاکھوں نہیں تو کئی ہزار لوگ تو ضرور موجود ہوتے تھے اور ان کی تقریر جتنی دیر تک رہتی سامعین نہایت ذوق و شوق سے ہمہ تن گوش سنتے تھے، شاہ جی کی تقریر کے موقع پر رات کے تین تین چار چار بجے تک تو میں جاگتا رہا ہوں اور اس وقت کی بات ہے جب میں لڑکپن کی منزلیں طے کر رہا تھا، نہ جانے ان کی زبان میں کیا سحر اور دلکشی تھی کہ حاضرین میں سے نہ کسی کو نیند محسوس ہوتی تھی اور نہ کوئی ایک لمحے کے لئے اکتاہٹ محسوس کرتا تھا، اگر تقریر کو جادو کہا جا سکے تو بلاشبہ شاہ جی بہت بڑے "جادوگر" تھے۔

٭ ٭ ٭

میرے والد مکرم شیخ عبدالعزیز امرتسری اس واقعے کے راوی ہیں کہ ایک مرتبہ امرتسر میں کنھیا لال کے منڈوے میں مرزا بشیر الدین محمود کی تقریر تھی، شہر کے اکثر مولویوں نے مسلمانوں کو وہاں جانے سے روکا، چنانچہ مرزائیوں کے علاوہ وہاں شاید بہت ہی کم لوگ گئے، ابا جی

کہتے ہیں. میں نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی مرزا محمود آخر کیا کہتے ہیں۔ جب تقریر کا وقت ہوا اور مرزا صاحب نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر الحمد کی تفسیر بیان کرنا شروع کی تو نہ جانے اچانک عطاء اللہ شاہ بخاری کہاں سے نکل آئے اور انہوں نے للکار کر کہا کہ مرزا صاحب آپ قرآن کی تفسیر تو غلط نہ کیجئے۔ مرزا صاحب عطاء اللہ صاحب کو دیکھ کر سخت گھبرا گئے۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے اس جگہ کو بہت محفوظ سمجھ کر وہاں آئے تھے۔

وہاں اس وقت محمد اعظم تھانیدار اور بعض دوسرے کوتوال حفاظت پر متعین تھے۔ انہوں نے سرخ سرخ آنکھیں دکھائیں لیکن شاہ جی ان باتوں سے کب ڈرنے والے تھے۔ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ آخر لوگوں نے مرزا صاحب کو شاہ جی سے مناظرہ کرنے کو کہا۔ لیکن مرزا نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر کوتوال اور تھانیدار نے شاہ جی سے کہا۔

شاہ جی! مرزا صاحب آپ کے ساتھ مناظرہ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا ہے۔ اب ہم آپ سے صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کو یہاں سے جانے دیجئے۔ وہ اب یہاں تقریر بھی نہیں کریں گے۔

شاہ جی نے کہا۔ کیسے جانے دوں، اگر اس میں جرأت ہے تو سامنے کھڑے ہو کر بات کرے۔

اس کے بعد شاہ جی سینما ہال سے باہر آ گئے۔ وہاں اتفاق سے ایک تانگہ کھڑا تھا۔ شاہ جی نے اس پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی۔ اور آن کی آن میں سارا بازار ایک جلسہ گاہ بن گیا۔

دیکھا جائے تو شاہ جی کا یہ جذبہ، جرأت اور دلیری محض تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں تھی۔

* * *

شاہ جی اپنی رائے کے اظہار میں بڑے بیباک تھے۔ وہ بڑے بڑوں کے منہ پر بھی حق گوئی سے باز نہ آتے۔ اور اگر کہیں مذہبی یا سیاسی اختلاف ہوتا تو بغیر لگی لپٹی رکھے نہایت صاف صاف الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کر دیتے تھے۔

میرے والد صاحب بھی راوی ہیں کہ ایک دفعہ سخت سیاسی بے چینی کا دور تھا اور انگریز

کہ شکوک عوام کے جذبات بہت مشتعل تھے، شاہ جی نے اپنے مرشد اوّل پیر مہر علی شاہؒ مرحوم (گولڑہ) کے پاس گئے اور ان سے جہاد کے موضوع پر گفتگو کی۔ پیر صاحب فرمانے لگے: "اچھا میں دعا کروں گا"

شاہ صاحبؒ جو نہایت پرجوش الفاظ لے کر وہاں گئے تھے، یہ سن کر کہنے لگے،

"سرکار مجھے معاف کیجئے اگر ہر جگہ دعائیں ہی کافی ہوتیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بدر و احد کے میدانوں میں نہ جاتے۔

⁂

اسی طرح ایک مرتبہ مذہبی جلسہ ہو رہا تھا، مولانا نور احمد مرحوم (خطیب مسجد شیخ بڈھا) نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کے بیان میں کہا کہ آپؐ کو غصہ نہیں آتا تھا اس کے بعد جب شاہ جی تقریر کرنے کو اٹھے تو کہنے لگے میں مولانا (نور احمد مرحوم) کو اپنا استاد کہتا ہوں لیکن یہاں شاگرد استاد سے اختلاف کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ حضور صلعم کو غصہ نہیں آتا تھا، میں کہتا ہوں، غصہ آتا ہے، وہ بشر تھے اور غصہ بشر کی فطرت ہے۔ انسان میں غصے کی غیر موجودگی اس کی غیرت کے منافی ہے۔ ہمیں اپنی محبت و عقیدت میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ انسان تھے اور انسانی تقاضے ان کے ساتھ تھے اور یہی ان کی فضیلت ہے۔ کہ وہ انسان ہونے کے باوجود اس قدر بلند و بالا تھے۔

⁂

شاہ صاحب کی تقریر میں بعض اوقات بڑی دلچسپ اور معنی خیز نقلی روایات بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ کہنے لگے۔

"جب کبھی بخاری کی تقریر ہو تو ان مرزائیوں کو نہ جانے کیوں بخار چڑھ جاتا ہے"۔

اسی طرح ایک اور موقع پر کہنے لگے،

"مجھے تو آج تک مرزا کی نبوت کے متعلق سمجھ نہیں آئی وہ نبی تھے یا بعض بعض نبی خدا جانے کیا ہے؟

ایک سیاسی جماعت کے مقابلے میں ایک بار کہا۔

"ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں نہ ہمارے پاس زر ہے۔ نہ زمین ہے اور نہ زور ہے۔

+ + +

شاہ جی نے اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہونے سے پہلے امرتسر کے گول باغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ تم لوگ خدا جانے کن خوش کن خوابوں میں کھوئے ہوئے ہیں، میں کہتا ہوں۔ یہ وہ وقت ہے کہ میں مشورہ دوں گا۔

"سونا بیچو اور لوہا خریدو"

ان کا مطلب تھا کہ اپنے دفاع کا بندوبست کرو، لیکن افسوس کہ عوام نے ان کے ان الفاظ کی قدر نہ کی۔

+ + +

شاہ جی کی ایک تقریر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے وسیع و عریض میدان میں ہوئی۔ جب شاہ جی جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو اللہ اکبر تاج و تخت ختم نبوت، زندہ باد۔ عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

لیکن جب صدر اجلاس میاں ممتاز دولتانہ تشریف لائے جو ان دنوں سابق پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے تو انہیں عوام کا یہ دلی تپاک نصیب نہ ہو سکا۔

شاہ جی نے دولتانہ کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

+ + +

مولانا احمد علی مرحوم شاہ جی کے بڑے مداح تھے، ان دنوں ختم نبوت کی تحریک زوروں پر تھی اور حکومت وقت اس تحریک کو دبانے میں مصروف تھی، مولانا احمد علی مرحوم نے خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا:

حکومت کہتی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری فساد پھیلاتا ہے، ان اللہ کے بندوں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر عطاء اللہ شاہ فساد پر آمادہ ہو جائے تو مرزائیت کا قلعہ تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں

کہتا ہوں کہ اگر سرکار ہی شام کو حکم دے دیں تو صبح ہونے سے پہلے پہلے ربوہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔

مجھے بتاؤ کہ ایک طرف لاہور کا ڈپٹی کمشنر تقریر کرے اور ایک طرف عطا اللہ شاہ تقریر کرے تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟ اگر ایک طرف وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تقریر کریں اور ایک طرف عطا اللہ شاہ تقریر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟ اگر ایک طرف گورنر جنرل غلام محمد تقریر کریں اور دوسری طرف عطا اللہ شاہ تقریر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟

اور مولانا احمد علی کے جواب میں لوگ ایک آواز کہہ رہے تھے

عطا اللہ شاہ کو۔ عطا اللہ شاہ کو۔

ان مثالوں سے مسلمانوں کے دلوں میں عطا اللہ شاہ کی محبت و عقیدت کا اندازہ مشکل نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

شاہ جی کا جسم بہت رعب دار اور مضبوط تھا۔ ایک بار تقریر میں انہوں نے بتایا کہ کسی زمانے میں میری صحت اتنی اچھی تھی اور بازو اتنے موٹے تھے کہ میرے کوئی ہتھکڑی پوری نہیں آتی۔ چنانچہ انگریزی حکومت کو میرے لئے خاص طور پر الگ ہتھکڑیوں کا انتظام کرنا پڑا۔

٭ ٭ ٭

بعض مذہبی مسائل میں ان کی رائے نہایت دانشگاف اور دو ٹوک ہوتی تھی۔ کچھ مثالیں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک مثال اور سنیئے۔

ایک مرتبہ امرتسر میں ایک پیر قسم کے مولوی آئے اور مسجد جان محمد میں یہ تقریر کر گئے کہ حضورؐ نوری تھے، ان کو خاکی یا بشر کہنا ان کی توہین ہے۔

شاہ جی نے مسجد خیر الدین میں اس کا جواب دیا اور کہا: بھائی مانو یا نہ مانو میرے نانا حضور اکرم صلعم بشر ہی تھے۔ میں ان کی اولاد میں شامل ہوں۔ سارے سید ان کی اولاد میں شامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ عام بات ہے کہ نسل بدلا نہیں کرتی۔ انسان کی نسل ہی سے انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اگر حضور صلعم بشر نہ تھے تو میں یہاں تک کہہ دوں گا کہ جو لوگ

سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ کہاں سے آ گئے ہیں۔

٭ ٭ ٭

میں نے شاہ جی کی آخری تقریر دہلی دروازے میں سنی جو شاید لاہور میں ان کی آخری تقریر تھی۔ اس تقریر سے پہلے ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور کچھ عرصہ کے لئے افاقہ ہو گیا تھا لیکن اس تقریر کا بیشتر حصہ ایک خط پڑھنے اور اس پر تنقید کرنے میں گزر گیا۔ جو مرزائے قادیانی نے انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے لکھا تھا اور وہ شاہ جی کے ہاتھ لگ گیا تھا

٭ ٭ ٭

جو شخص بیک وقت لاکھوں انسانوں کے کانوں کیا دلوں تک اپنی آواز پہنچا سکتا تھا وہ اتنا بے بس تھا کہ دم آخر اپنے بیٹوں تک سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کیفیت کا مشاہدہ کر کے عرشی نے وہیں یہ شعر کہا۔

برق درد آسودہ بستر شدہ
شعلۂ جوالہ خاکستر شدہ

افسوس کہ وہ نادر روزگار شخصیت اب ہماری دنیا میں نہیں اور ہم ان کو اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اقبال احسن

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

حضرت امیرِ شریعتؒ عالم باعمل اور صوفی رمز شناس تھے، ہزاروں افراد نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنے نفس کی اصلاح کا اہتمام کیا۔ ان کی زندگی کے اس پہلو پر بہت کم حضرات کی نظر گئی ہے۔ اصلاح باطن میں انہیں کمال حاصل تھا، اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کو پیر عبدالقادر صاحبؒ المعروف حضرت رائے پوری سے فیض تھا، جادۂ تصوّف کے راہرو اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اس جہان میں حضرت رائے پوری کی نسبت سے بلا مبالغہ لاکھوں طالبانِ صادق نے روحانی منازل طے کیں "رائے پوری" کی خانقاہ سے برسوں تصوّف کا نورانی چشمہ رواں دواں رہا۔ یہ خانقاہ منازل سلوک میں اپنے وقت کی سب سے بڑی تربیت گاہ رہی ہے ؎

آنکس ست اہلِ بشارت کہ اشارت داند
نکتہا ہست بسی، محرم اسرار کجا است

شاہ جی نے پیری اور سجادگی کی دکان کبھی نہ سجائی، پیری مریدی کو کاروبار کا درجہ نہ دیا ان کی غیرت مند طبیعت کبھی کسی مرید سے ایک پائی کی روادار نہ ہوئی، ان کے ارادت مندوں نے بھولے سے بھی کبھی ان کی پیشوائی و اولیائی کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹا، شاہ صاحبؒ دقِ الٰہیہ اور کلیم بوذرؓ کے امین تھے۔ انہوں نے باروں کا کفن نہیں بیچا اور آبا کی قبروں کی اینٹوں کو فروخت

نہیں گیا، کیونکہ وہ دھن دولت کے بندے نہ تھے، وہ تو بطل حریت تھے، انہوں نے وادیٔ سیاست کے خارزار کی عمر بھر جادہ پیمائی کی، اپنے عقیدتمندوں کو بھی ساتھ لے کر چلے، انہوں نے مریدوں کے ہاتھ میں تسبیح کے بجائے کلہاڑی پکڑائی، غلامی کی زنجیروں سے نبرد آزما ہے، وہ قافلہ احرار کے سرخیل تھے، تو چوہدری افضل حق مرحوم دماغ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سالار میمنہ تھے تو قاضی احسان احمد سالار میسرہ، شاہ جیؒ کے رفقائے کار میں محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین تاج الدین انصاری، مولانا مظہر علی اظہر، صاحبزادہ فیض الحسن (افسوس کہ صاحبزادہ صاحب نے کئی برس سے وہ انداز ترک کر دیا ہے) اور شورش کاشمیری ابھی زندہ ہیں، یہ حضرات کسی بھی سٹیج سے تقریر کریں، مگر ان کی تقاریر "احراری خطابت" کی دھندلی یادیں تازہ کر دیتی ہیں۔

جنوں تو کہہ ہی دیتا بات ساری
خرد نے سوچ کر تحریف کی ہے

مجلس احرار اسلام کے سیاسی نظریئے سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن تحریک آزادی میں جو ان کا حصہ ہے اس سے انکار کرنا تاریخ پر ستم توڑنا ہے۔ "احرار کو کانگریس کا پٹھو کہنا دھاندلی ہے جبکہ ۱۹۳۱ء میں احرار کانگریس سے الگ ہو گئے تھے، کانگریس سے علیحدگی چوہدری افضل حق مرحوم کے نظریات کی بنا پر ہوئی تھی اور یہ بات بہ بانگِ دہل کہی جا سکتی ہے کہ چوہدری صاحبؒ مرحوم کانگریس کو ہندو امپیریلزم کا اسم خیال کرتے تھے اور ان کی درویشانہ سرشت میں ہندو سرمایہ داری کے خلاف سخت نفرت موجود تھی، چوہدری صاحب کو ان کے ناقد احرار کا مارکسی کہتے ہیں، یہ قطعی غلط ہے، میرے نزدیک ان کا ذہن توحید و رسالت مصر میں ابوذر غفاریؓ کے نزدیک تھا، چوہدری صاحبؒ کو جاگیرداری اور سرمایہ داری سے بغض کی حد تک چڑ تھی، ان کا نظریہ حیات اس شعر کے قریب تر ہے

دولت ہو جس نظام میں انسانیت کا نام
دنیا کا وہ نظام بدلنے کی فکر ہے

یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ اسلام پر دل و جان سے قربان ہونے کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی مجلس احرار تحریک پاکستان میں شامل نہ ہوئی، اس کی واحد وجہ جو تاریخی تجزیہ کے بعد مجھے

نظر آتی ہے وہ مسلم لیگ میں نوابوں کی موجودگی تھی، دوسرے پنجاب کے جاگیرداروں کو "احراری دماغ" نے ہمیشہ بخیل اور کوتاہ فکر گردانا، بہرحال یہ دوسرا المیہ ہے کہ ایک فعال جماعت نے تحریک پاکستان کی مخالفت کر کے اپنے تابوت میں خود آخری کیل ٹھونک لی، بہرحال ذکر تھا شاہ صاحب کا تو وہ بقول عبدالمجید عدم یزداں کی نشانی اور احرار کی جوانی تھے، شعر سن لیجئے۔

تو آدمی نہیں یزداں کی اک نشانی ہے
تیرے بڑھاپے میں احرار کی جوانی ہے

آخری ایام میں شاہ جی کا حلیہ کچھ اس طرح تھا، درمیانہ قد، دُہرا جسم، گندمی رنگ، چہرے پر بھری بھری سفید داڑھی، سر پر پٹھے، ان پر اوڑھی ہوئی انوار کیپ، کشادہ پیشانی، بھرا ہوا روشن کتابی چہرہ، عقابی آنکھیں جن میں غیرت اور خودداری کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں طبیعت میں جلال و جمال کا حسین امتزاج تھا۔

قلندرانہ ادائیں
سکندرانہ جلال

آواز میں شیرینی سے بڑھ کر جادو، "تلاوتِ قرآن پاک کے وقت ان کے گلے سے ایسی دل سوز آواز نکلتی تھی کہ سامعین جھوم جھوم جاتے تھے، دیہاتی سامعین کو کبھی کبھار ہیر وارث شاہ کے جادو بھرے اشعار سنا کر موہ لیتے تھے، تقریر فرماتے تو مجمع پر سناٹا چھا جاتا، موافق مخالف واہ واہ کے ڈونگرے برساتے اور مسحور ہو جاتے، ان کی شعلہ نوائی سے پنجاب کے دریاؤں میں بارہا تموج آیا، جمنا اور گومتی بھی کناروں سے باہر ہو گئے مجمبر سے ان کی گونج سنائی دی، سٹیج سے انہوں نے للکارا، ہمالیہ کی چوٹیاں دہل گئیں انگریز کا تخت ڈانواڈول ہوا، قادیانی نبوت لرز گئی، چالیس برس تک ان کی پاٹ دار آواز نے تہلکہ مچائے رکھا، مگر آخری ایام میں ان کی مجبوری اور لاچاری کا یہ عالم تھا کہ گویائی کے لئے ہلکی سی چنگاری کے محتاج تھے، نشتر میڈیکل کالج ملتان میں ان کی بے زبانی اور کرب دیکھ کر رونا آتا ہے کہ ہائے یہ وہ خطیب آتش نوا ہے کہ جس کی شعلہ نوائی اور آتش بیانی خرمن استعمار پر بجلی بن کر گرا کرتی تھی۔ ان کی آخری جھلک دیکھ کر راقم الحروف کے ذہن میں ان کے ہم وطن شاعر حضرت شاد عظیم آبادی کی غزل کا یہ مطلع یاد آ گیا تھا، یہ شعر

گویا جناب شادؔ نے پیر بخاری کے لئے کہا تھا

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

یاد رہے شاہ صاحبؒ (۲۴ ربیع الاول ۱۳۱۰ ہجری بمطابق ۱۸۹۱ عیسوی کو) جمعہ کے دن نور کے تڑکے پٹنہ (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام سید ضیا الدین احمد تھا پٹنہ میں آپ کا خاندان ممتاز، بزرگ اور محترم تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ بچپن میں ہمارے ممدوح شفقت پدری سے محروم ہو گئے، آپ کی پرورش ننھیال میں ہوئی آپ کا سلسلہ نسب ۳۶ ویں پشت میں امام حسن علیہ السلام سے ملتا ہے آپ کی پرورش کچھ ایسے ماحول میں ہوئی کہ مذہبی مطالعہ کے ساتھ ساتھ آپ کو اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق بھی میسّر آیا۔ آپ کا بچپن شاد عظیم آبادی نے عروج کا زمانہ ہے، شاہ صاحبؒ نے اپنے بچپن میں شاد کی آنکھیں دیکھی تھیں، اسی لئے تو شعر و شاعری کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا انہیں فارسی اور اردو اساتذہ کے ہزاروں اشعار یاد تھے، مولانا روم حافظ شیرازی، عمر خیام، مرزا غالب اور ڈاکٹر اقبال ان کے محبوب شعرا تھے، شاہ صاحبؒ خود بھی شعر کہتے تھے، ان کا تخلص ندیمؔ تھا، ان کا مجموعہ کلام سواطع الہلام کے نام سے شائع ہو چکا ہے بلعتیہ کلام میں شعری بانکپن کی جھلک نظر آتی ہے، اصل بات یہ ہے۔ کہ ان کی زندگی میں شاعری کو اضافی حیثیت حاصل تھی ان کا اصل میدان خطابت تھا۔

قلم را آں زباں نبود کہ سر عشق گوید باز
بیروں از حد تقریر است شرح آرزومندی

انہوں نے اردو کی عوامی خطابت کو عمر بھر چار چاند لگائے ہیں۔ وہ اس میدان کے ایسے بڑے شہسوار تھے کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ خطابت کے میدان میں اردو نے آج تک اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا، شاہ صاحبؒ کی سیاسی زندگی اور خطابت کا آغاز ۱۹۲۰ء کے ہنگامہ خیز دور میں ہوا ان کی شخصیت کے حسن و رعب اور شعلہ نوائی نے برصغیر پاک و ہند میں آگ لگا دی، انہوں نے اپنی اچھوتی طرز خطابت سے، اس وقت اپنا لوہا منوایا جب مولانا

ابوالکلام آزاد کی خطابت کا طوطی بول رہا تھا، جب مولانا محمد علی جوہر کی خطابت کی دھوم مچی ہوئی تھی تحریک خلافت کارنامہ تھا، آپ کی آتش بیانی سے مسلمان قوم بیدار ہوئی۔ ورنہ پوری کی پوری قوم ماضی کی شاندار روایات کے تصور میں گم تھی، یا حال کی شکست اور پس ماندگی میں مبتلا، ان کی شعلہ بیانی محض ان کی ذات کی نمود تھی، ان کی تقریر میں شاعرانہ دلفریبیاں بھی ہوتی تھیں اور ناصحانہ نکات بھی، عبرت کی داستان کے ساتھ ساتھ لطیفے اور چٹکلے بھی بیان ہوا کرتے تھے، تقریر میں محاوروں کی پابندی اور عام فہم مثالیں اس طرح بیان فرماتے گویا انگوٹھی میں نگینے جڑ رہے ہوں وہ گھنٹوں بے تکان بولنے کے عادی تھے، ان کے سامعین بارش میں بھیگنا گوارہ کر لیتے تھے لیکن تقریر چھوڑ کر نہ جاتے تھے۔ تقریر کی طوالت کبھی سامعین کی تھکاوٹ کا باعث نہ ہوئی ان کی گفتار میں جادو کی کیفیت اور سحر کا عالم ہوتا تھا، ان کے بدترین مخالف بھی ان کی تقریر کی گلریزیاں اور آتش بیانیاں سننے پائے گئے ہیں، بلکہ مخالفوں کو سر دھنتے دیکھا ہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی والے لکھتے لکھتے اکتا جاتے، ان کی انگلیاں تھک جاتیں، اخبار نویس ان کی گرما گرم تقریر کی رپورٹنگ سے عمر بھر عاجز رہے، شاہ صاحبؒ ایک منٹ میں ایک سو سے زیادہ الفاظ بولنے پر قادر تھے، ان کی خطابت کے چرچے برصغیر پاک وہند کے گوشے گوشے میں رہے ہیں۔ اپنی مصروفیاتِ زندگی کو انہوں نے ایک موقعہ پر یوں فرمایا۔

"زندگی ہی کیا ہے تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی، ایک چوتھائی جیل میں، جتنے دنوں جیل سے باہر رہا لوگ گلے کا ہار بنتے رہے۔ آج کلکتہ کل لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی، سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں ۳۶۶ تقریریں کی ہوں گی، میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا "واہ شاہ جی واہ" میں قید ہو گیا لوگوں نے کہا "آہ شاہ جی آہ" اور "واہ، آہ" میں ہم ہو گئے تباہ"۔

گذر گیا کہ درماندہ راہ یہ کہتا
اب اس فضا میں کوئی قافلہ نہ ٹھہرے گا

۱۹۳۴ء میں شیرانوالہ دروازہ کے باہر باغ میں انجمن خدام الدین کا پہلا اجلاس ہوا یہ تین روزہ کانفرنس تھی۔ اس میں شرکت کے لئے برصغیر کے سرکردہ علمائے کرام اور بنائے عظام تشریف

لائے تھے۔ ایک جلسے کی صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہؒ کاشمیری فرما رہے تھے۔ مولانا انور شاہؒ کا رتبہ علمائے دیوبند میں اور اس سے باہر بھی بہت بلند تھا۔ ہر مکتب خیال کے علماء ان کا احترام کرتے تھے مولانا انور شاہؒ کے پائے کا محدث ان کی وفات کے بعد بلادِ ہند میں پیدا نہیں ہوا اس کے علاوہ حضرت انور شاہ پہلوی (قدیم فارسی) کے بہت بڑے عالم تھے، علامہ اقبال نے جب ایران کا سفر کیا تو وہاں زردشتی مذہب کے پیروکاروں نے ان سے اپنی قدیم کتاب "پاژند" کے سلیس فارسی ترجمہ کی درخواست کی۔ حضرت علامہ نے جواباً کہا کہ اس کا ترجمہ مجھ سے تو ممکن نہیں، البتہ میرے ملک میں ایک ہستی ایسی ہے جو اس کام کو بحسن خوبی سرانجام دے سکتی ہے زردشتیوں نے ایک لاکھ ایرانی سکے" کی پیش کش کی، حضرت علامہ نے ہندوستان لوٹ کر حضرت انور شاہ صاحبؒ سے ذکر کیا، حضرت انور شاہ صاحبؒ نے جانتے ہو کیا کہا "لاکھ روپے کے بدلے میں میں کفر کی اشاعت کیوں کروں، انور شاہ اسلام کے لئے پیدا ہوا ہے اشاعت کفر کے لئے نہیں" بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ذکر تھا انور شاہ صاحبؒ کی صدارت کا۔ سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، ایسے لولوئے لالہ بکھیرے کہ مجمع کا مجمع جھوم گیا، تقریر دلپذیر کے اختتام پر مولانا انور شاہؒ نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا۔ "عطاء اللہ شاہ بخاریؒ صحیح معنوں میں امیر شریعت کہلانے کے مستحق ہیں" اتنا فرمایا اور اپنا ہاتھ بیعت کے لیے بڑھا دیا۔ شاہ جیؒ پر تو رقت طاری ہو گئی اور عرض کیا۔ نہیں مجھے اپنے ہاتھ پر بیعت ہونے کی اجازت دیں، مگر انور شاہ صاحبؒ نے اپنا ہاتھ شاہ جیؒ کے ہاتھ میں دے دیا، بس پھر کیا تھا۔ پورا مجمع حضرت امیر شریعت کے نعروں سے گونج گیا۔

نوبخت تماشائی

عہد آفریں بخاریؒ

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قیادت و سیادت کے خواہاں ہیں اور اس سلسلے میں انہیں کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر وہ قیادت کے کسی زینے پہ قدم دھر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ قیادت و سیادت کا سنہری چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں ایسے پیدائشی قائدوں کو بھی قیادت پہ قبضہ جمائے رکھنے کے لئے خاصی جدوجہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں وہ موروثی قیادت کو بحالہ قائم رکھ سکتے ہیں یا اسے تھوڑا بہت آگے بڑھا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں قیادت و سیادت کی مطلق خواہش نہیں ہوتی مگر قیادت خود ان کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔ اور سیادت کا تاج زمانہ ان کے سر پہ رکھ دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ تمام عمر اپنے آپ کو نہ قائد تصوّر کرتے ہیں اور نہ اپنی سیادت پہ کبھی ناز و تجبّر کو جائز سمجھتے ہیں۔ زمانہ بھر کے عام قائدین پہ عموماً اور پاک و ہند کے قائدین پہ خصوصاً اگر آپ نظر ڈالیں تو ان میں کی اکثریت یا پہلی قسم میں شامل ہے یا دوسری قسم میں۔ تیسری قسم کے لوگ خال خال کہیں نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی غیر منقسم ہندوستان کے بہت بڑے لیڈر تھے اور انہیں لیڈری کا کافی شوق بھی تھا۔ مگر قیادت کو حاصل کرنے کے لئے انہیں پہلے جنوبی افریقہ میں خاصی جدوجہد کرنا پڑی اور اس کے بعد ہندوستان میں انتہائی پرخطر

حالات کا سامنا کرنا پڑا تب کہیں جاکر وہ اپنی قیادت کی پگڑی سنبھال سکے۔ بارہا اس سلسلے میں انہیں جان کی بازی بھی لگانا پڑی، مرن برت رکھنے پڑے، مگر پھر بھی وہ حاصل کردہ سیادت کو آخر وقت تک قائم نہ رکھ سکے اور اپنے ہی ایک ہم قوم کے ہاتھوں سے مارے گئے۔

گاندھی جی کے بعد غیر منقسم ہندوستان میں جواہر لعل نہرو کا درجہ تھا۔ یہ دوسرے قسم کے قائدین میں سے تھے۔ ان کے والد موتی لال نہرو بہت بڑے سرمایہ دار اور بہت بڑے قائد تھے اور وہ قیادت جواہر لال کو ورثے میں ملی، مگر اس کو اپنے پاس رکھنے کے لئے انہیں جس قسم کی کوششیں کرنا پڑیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پیرس و لندن کے دھلے ہوئے کپڑے پہننے والے جواہر لال کو کھادی کا لباس عمر بھر کے لئے قبول کرنا پڑا اور ہر وقت جیل جانے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرنا پڑا۔ تقسیم کے بعد گو وہ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں، مگر اس وزارتِ عظمیٰ کو سنبھالنے کے لئے انہیں جس قسم کے پاپڑ بیلنے پڑے وہ بھی چشم بینا سے اوجھل نہیں۔ جواہر لال جیسے سلیم الطبع آدمی کو مینن جیسے کج بین و کج فہم آدمی کا روپ دھارنا پڑا تو صرف اسی قیادت کو سنبھالنے کے لئے اور شیخ عبداللہ کو اپنی اخوت و دوستی کے باوجود جیل بھیجنا پڑا یا انہیں سازشوں کے جھوٹے مقدمات میں پھنسانا پڑا تو صرف اسی قیادت کو سنبھالنے کے لئے، وہ جواہر لال جس کا خاندان اب تک فارسی زبان سے بے بہرہ نہیں اور جس کے گھر میں ہندی اب تک ایک نامانوس زبان ہے اسے اگر اردو زبان کی حمایت سے دست کش ہونا پڑا تو صرف اسی حاصل شدہ قیادت کو سنبھالنے کی خاطر۔ جبل پور جیسے فسادات سے صرف چشم پوشی نہیں بلکہ اس جیسے فسادات کی حمایت میں بیان دینا اور اسی جیسے فسادات بپا کرا دینا بھی صرف اسی قیادت کو سنبھالنے ہی کی خاطر ہے۔

مسلمان قائدین میں سے مولانا محمد علی، شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ بہت سے اصحاب پہلی قسم کے قائدین میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ ناظم الدین اور خان لیاقت علی خان دوسری قسم کے رہنماؤں میں شمار کئے جائیں گے۔ جن میں سے مولانا آزاد کو اپنی قیادت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری ہی قوم سے ہاتھ دھونا پڑے اور اتنی قربانی دے کر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اپنی کشتی قیادت کو پار لے گئے۔ خواجہ صاحب

کو جدوجہد کے باوجود کامیابی نصیب نہ ہوئی اور وہ میدان چھوڑ بھاگے ۔ قائد ملت کو گاندھی جی کی طرح اپنی ہی قوم کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا ۔

تیسری قسم کے قائدین میں صرف دو تین نام ہی لئے جا سکتے ہیں ۔ علامہ اقبال ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چوہدری افضل حق مرحوم ، رہے قائد اعظم محمد علی جناح تو ان کی زندگی کے دو دور ہیں ، پہلے دور میں جب وہ کانگرس کے رہنماؤں میں شامل تھے وہ پہلی یا دوسری قسم کے قائدین میں شامل تھے اور دوسرے دور میں جب وہ تحریکِ پاکستان کے قائد تھے ، یقیناً تیسری قسم کے قائدین میں شامل ہی نہیں تھے بلکہ وہ ان قائدین کے بھی قائد تھے اور حقیقی معنوں میں اگر قائد کے لفظ کا اطلاق کسی پر کیا جا سکتا ہے تو صرف ان تیسرے قسم کے قائدین پر ہی کیا جا سکتا ہے ۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی شخصیتوں کو عہد آفرین شخصیت کہا جاتا ہے ، گویا زمانہ نے انہیں نہیں بنایا بلکہ وہ زمانے کو بنانے والے ہیں اور عہد آفرین شخصیتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اپنے پرائے دوست دشمن سب ہی ان سے متاثر ہوتے ہیں ، اپنے محبت اور پیار کی وجہ سے ان کی خصوصیات کو اپناتے ہیں اور اعدا بر بنائے رشک و حسد ان کی خصوصیات اپنے اندر اس لئے پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی انہی کی طرح .. محبوب و محترم خلائق بن جائیں ۔

علامہ اقبال ایک پیغامی شاعر تھے اور انہوں نے قوم کو خودی اور صلابت کا پیغام دیا ۔ انہوں نے قوم کو اسلامیت اور سادگی کا سبق پڑھایا ۔ اب ان کے بعد جو شاعر بھی پیدا ہوا وہ عنوان بدل کر قوم کو کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیتا ہے تاکہ اسے بھی شاعرِ انقلاب ، ترجمانِ حقیقت یا ناطقِ فطرت کے خطابات سے یاد کیا جائے اور اگر بدقسمتی سے وہ کسی انجمن ستائش باہمی کا ممبر نہیں اور دوسرے اس کی تعریف نہیں کرتے تو وہ خود اپنی تعریف کرتا ہے خود ہی اپنے آپ کو مصور حقیقت ، لسانِ عبرت ، جہانِ غیرت یا شاعر شباب و انقلاب کہنے لگ جاتا ہے ۔ علامہ نے جس قسم کی ترکیبیں اپنی بات سمجھانے کے لئے ضرورتاً ایجاد فرمائیں یا تو وہ انہیں کو مستعار لے کر اپنی اغراض میں استعمال کرتا ہے ، یا اسی جیسی کچھ موضوع اور کچھ مہمل تراکیب خود ایجاد کرتا ہے تاکہ وہ بھی علاماؤں میں گن جا سکے ۔

یہی صورت ہمارے عہد آفریں بخاری کی تھی، نہ وہ کسی لیڈر کے گھر پیدا ہوئے نہ کسی سرمایہ دار کے گھر، نہ انہیں لیڈر بننے کا شوق تھا نہ قائد بننے کا۔ اپنے آپ کو ہمیشہ اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم اور خادم شمار کرتے رہے، نہ انہیں اپنی خطابت پہ ناز تھا نہ قرآن دانی پہ اور سیاست کی گاڑی کا پہیہ بننا تو وہ کبھی بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ابھی وہ طالب علم ہی تھے کہ قیادت کا تاج زبردستی ان کے سر پہ رکھ دیا گیا مگر یہ تاج تو الگ رہا انہوں نے عمامہ باندھنا بھی اس لئے چھوڑ دیا کہ کسی غلام کو عمامہ باندھنے کا کیا حق ہے۔ عمامہ ایک آزاد و خود مختار مولیٰ کی سنت ہے اور یہ تب باندھا جا سکتا ہے جب آدمی ظاہری اور ذہنی ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو۔

بخاری نے جب میدان خدمت میں قدم رکھا تو قیادت کے ہوا خواہوں نے بہت سے زینے طے کر لئے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قیادت کے یہ ہوا خواہ سب کے سب خلوص سے عاری تھے۔ حاشا وکلا ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ان میں بہت سے نیک نیت بھی تھے، مگر جہاں ان میں نیک نیتی اور نیک عملی تھی وہاں یہ انسانی کمزوری بھی کہ میدانِ قیادت میں لوگ ہماری امامت کو تسلیم کر لیں۔ بنا بریں ان میں سے اکثر نے اپنی اپنی قیادت کے لئے ایک ایسا حلقۂ اثر بنا رکھا تھا جس میں ان کی امامت مسلّم تھی اور وہ اس میدان کے اس سرے سے اس سرے تک کوس لمن الملک بجا رہے تھے۔

بخاری جب میدانِ عمل میں آئے اور کچھ ہی دنوں میں پرانے پرانے شاطروں کو پیچھے چھوڑ گئے تو کسی نے نیک نیتی سے اور کسی نے بدنیتی سے ان کا دامن پکڑ کر پیچھے کو گھسیٹنے کی کوشش کی، مگر اس کھینچا تانی میں جب معلوم ہوا کہ وہ حریف مرتبہ نہیں بلکہ حریف بدلہ ہیں تو سب نے اپنی قبائے قیادت میں اس سے گل بوٹے بنوانے شروع کر دیئے اور وہ باہمہ اور بے ہمہ اپنے نانا (بابا مُنَّا و امہاتنا) کی سنت پر عمل کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا اسے نہ کسی بوفلاف کی پرواہ تھی نہ کسی بوالحکم کی، حتیٰ کہ جب جنگِ آزادی کا سورج نصف النہار پر پہنچا تو صرف بخاری ہی ایسا آدمی تھا جس کی خطابت نے ہر شہری و ہر دیہاتی کے دل میں آزادی کی چنگاری روشن کر دی تھی۔ جس کی شعلہ بیانی نے ہر اہلِ زبان اور ہر بے زبان

کا دل موہ لیا تھا جس کی سحر بیانی نے ہر عاقل اور ہر لایعقل کی نظر بندی کر رکھی تھی۔ اور ہر آدمی کے دل میں صرف ایک ہی سوال باقی رہ گیا تھا۔

انگریز کب ہمارا ملک ہمارے سپرد کر کے یہاں سے جائیں گے

بخاری مع اپنے خداداد فن کے ہر اس انجمن کے ساتھ تھا جس کے دل میں آزادی اور توحید و سنت کے جذبات موجزن تھے۔ اور ہر اس مجلس سے الگ جو توحید و سنت سے الگ یا آزادیٔ وطن کے جذبات سے عاری تھی۔ عمر بھر اس کا یہی نظریہ رہا اور عمر بھر اس نے اسی نہج پہ اپنی وضع داری قائم رکھی۔

بخاری کے سوز و روں نے ڈھیروں قائد اور انبار وں خطیب و واعظ پیدا کئے اور ہمیشہ وہ ان سب کو اچھا کہتا رہا۔ اور اپنے سے دو قدم آگے چلاتا رہا۔ مگر ان سب کا انداز بیان صاف غمازی کرتا ہے کہ وہ بخاری کی تقلید کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار و اعزاز سمجھتے ہیں۔ رہا یہ ہاں وہ خطیب بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا ہے اور وہ قائد بڑا خوش نصیب خیال کیا جاتا ہے جسے سامعین میسر آجائیں اور اگر سامعین کی تعداد سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک پہنچ جائے تو لوگ خطیبِ اعظم کہلانے لگتے ہیں۔ مگر بخاری اس انداز کا خطیب تھا کہ اس کے مقلدین کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس خطیب کی خطابت کا اندازہ آپ خود کر لیں جس کی خطابت پہ ہزاروں خطیب اپنی انفرادیت قربان کر چکے ہیں۔

جیسے شاعری کے سلسلے میں اس عہد کو علامہ اقبال کا دور کہا جائے گا تا آنکہ مادرِ زمانہ کوئی دوسرا اقبال پیدا کرے یا اقبال سے بڑے درجے کے کسی شاعر کو جنم دے۔ اسی طرح خطابت کے سلسلے میں بھی اس عہد کو عہدِ بخاری ہی کہا جائے گا۔ تا آنکہ کوئی دوسرا بخاری پیدا نہ ہو یا اس سے بھی کوئی آگے قدم بڑھانے والا پیدا نہ ہو۔

عہدِ اقبال میں جس قدر شعرا ہیں خواہ وہ اقبال کے عقیدت مند ہیں یا مخالف سب کے سب شعوری یا غیر شعوری طور پہ اقبال کے مقلد ہیں۔ اسی طرح عہدِ بخاری کے خطیب خواہ وہ اس کے ہمنوا ہیں یا "بے نوا" سب کے سب شعوری یا غیر شعوری طور پہ بخاری کے ہی مقلد ہیں۔

مگر اس سلسلے میں اقبال اور بخاری دونوں مظلوم ہیں کہ ان کو سمجھنے والوں نے اسی طرح سمجھا جس طرح ایک روایتی ہاتھی کو پہچاننے والوں نے پہچانا تھا اور پھر لوگوں کو تبلایا تھا کہ ہاتھی تو چھاج ایسا ہوتا ہے، دوسرے نے کہا غلط، ہاتھی ایک کھمبے کی مثال ہے وغیرہ اسی طرح اقبال کے بعض مقلدین نے اقبال کی مقبولیت کو اس بات پر محمول کیا کہ ان کے کلام میں فارسی کی اچھی اچھی ترکیبیں موجود ہیں اور انہوں نے اپنی عمر اسی میں بتا دی کہ فارسی کی بہترین ترکیبیں اپنے کلام میں جمع کرتے رہے۔ بعض نے یہ خیال کیا کہ اقبال کی مقبولیت اس شوخی کی بنا پر ہے جو وہ ذات احدیت (جل جلالہ) کے سلسلے میں روا رکھتے ہیں اور ان لوگوں نے اس حد تک بارگاہِ خداوندی میں شوخیاں کیں کہ وہ بجائے ہنر کے عیب معلوم ہونے لگیں۔ بعض نے یہ سمجھا کہ شیطان کی تعریف علامہ کے کلام میں موجود ہے۔ لہٰذا انہوں نے ابلیس سے ایسا یارانہ گانٹھا کہ وہ خدا کی بجائے ابلیس کے بندے معلوم ہوتے ہیں۔

بعینہ اسی طرح بعض لوگوں نے بخاری کی مقبولیت کا باعث ان کے حسن صوت کو قرار دیا انہوں نے گا کر دورانِ خطابت اشعار پڑھنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ اگر گلا ساتھ بھی نہ دے تو بھی انہیں گانا ضرور ہوتا۔ بعض نے یہ سمجھا کہ بخاری برمحل اور باموقع نہایت اچھے اچھے شعر پڑھتے ہیں اس لئے ان کی خطابت مقبولِ خاص و عام ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس قدر اشعار ازبر کر لئے کہ ان کی تقریر پر یوسف سلیم چشتی کی شرح بانگِ درا یا شرح بال جبریل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بعض نے سمجھا کہ بخاری تاریخی واقعات کو زمانہ حال پر اس طرح چسپاں کر دیتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے واقدی اور ابوالفدا کے صفحے کے صفحے یاد کر ڈالے بلکہ نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کے اوراق بھی ازبر کر لئے۔

بعض لوگوں کا گمان اس طرف گیا کہ بخاری کی زبان بہت شستہ و رفتہ ہے اور انہوں نے بھی باوجود الثغ و الکن ہونے کے طلاقت لسانی کے وہ جوہر دکھانے شروع کئے کہ وہ رکیں تو آسمان بھی ان کے دیکھنے کو رک جائے۔ بعض حضرات نے خیال فرمایا کہ بخاری کی تقریر اس لئے پسند کی جاتی ہے کہ اس میں نکاتِ قرآنی بیان ہوتے ہیں

اور پھر انہوں نے جو بائے بسم اللہ سے کر والناس کی سین تک نکات بیان کرنے شروع کئے تو اللہ بس باقی ہوس!

غرض جس جس طرح کسی نے اپنے خیال کے مطابق بخاری کو سمجھا اسی طرح ان کی تقلید کی اور اپنے آپ کو بخاری بنانا شروع کر دیا۔ مگر بخاری بننا اس قدر آسان ہوتا تو آج بخاری کا اس قدر ماتم نہ ہوتا۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ عہد آفریں شخصیت سے صرف دوست ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ دشمن بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شعوری طور پر باوجود دشمنی کے بھی قدردان ہوتے ہیں اور غیر شعوری طور پر ان میں سے کچھ وہ کام کرنے لگتے ہیں جو اس عہد آفریں شخص کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ بخاری کے دو گروہ تو ایسے دشمن تھے کہ جن سے وہ کسی طرح بھی مصالحت کے لئے تیار نہ تھے انگریز اور مرزائی اور دو گروہ ایسے تھے کہ جن سے میدان تبلیغ میں انہیں بارہا ھل من مبارز کہنا پڑا، شیعہ اور بریلوی۔ شیعوں اور بریلویوں میں ان کے قدردان اب بھی موجود ہیں۔ مولانا مظہر علی اظہر، حافظ کفایت حسین اور مظفر علی شمسی وغیرہ حضرات کو شاہ صاحب سے جو عقیدت تھی وہ ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واضح ہے۔ مولانا ابوالحسنات مرحوم اور صاحبزادہ فیض الحسن صاحب سے ان کے تعلقات بھی کچھ پوشیدہ نہیں۔ انگریز سے شاہ صاحب کو جس قدر نفرت تھی اسی قدر انگریز ان کے قدردان بھی تھے۔

انگریزوں نے جس طرح ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں کلکتہ میں آزاد سبحانی اور کئی دوسرے آزاد پیدا کر لئے تھے اسی طرح شاہ صاحب کے مقابلے میں بہت سے خوش گلو اور لچھے دار مقرر تو پیدا کئے جا سکے مگر بخاری کوئی نہ بن سکا۔

مرزائیوں میں گو شاہ صاحب کے لئے خوش عقیدگی کی بجائے حسد اور تعصب ہے مگر شاہ صاحب کی تقریر کی مقبولیت سے متاثر ہو کر وہ بھی یہی پروپیگنڈہ کرتے ہیں، کہ ہمارا امام بڑا فصیح البیان مقرر ہے اور تو اور بعض دوستوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر راقم الحروف کو بھی شوق ہو گیا تھا کہ ان صاحب کی تقریر ایک بار سننی تو چاہیے، قادیان

پہنچا، تقریر سنی اور اس سے خالی الذہن ہو کر تقریر سنی کہ وہ مرزائی ہیں یا مرزائیوں کے امام ہیں۔ مگر افسوس کہ اس سلسلے میں میرا تاثر اتنا ضعیف اور رکیک ہے کہ اسے بیان کرنا بھی شاید تعصب پہ محمول کیا جائے اس واسطے اس سے احتراز کرتا ہوں۔

مرزائی مبلغین اکثر چھپ چھپا کر شاہ صاحب کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ بھلا شاہ صاحب کی تقریر کوئی سنے اور متاثر نہ ہو یہ تو ناممکن تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں میں اس تاثر کے کچھ نہ کچھ باقیات الصالحات اب تک بھی موجود ہیں۔ مرزائیوں میں لکھے پڑھے جاہلوں کی کثرت ہے۔ مگر پھر بھی علم ناپید نہیں۔ راقم الحروف کو حقیقت کے اعتراف میں کبھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی خواہ وہ حقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ قادیانی فرقے کے رئیس المبلغین اور استاد المناظرین مولوی اللہ دتہ جالندھری کو راقم انہیں مستثنات میں سے سمجھتا ہے جو اس کم مائگی کے زمانے میں نادر الوجود ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ اگر مولوی اللہ دتہ نہ ہوتے تو نہ شاید تفسیر صغیر وجود میں آسکتی اور نہ کبیر۔

اسی طرح یہ بھی راقم کی رائے ہے کہ اگر مولوی احمد یار نہ ہوتے تو لاہوری پارٹی کے تفسیری اور تبلیغی کاموں کی بھی نوعیت یہ نہ ہوتی جو اب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری ذاتی رائوں میں کچھ مذہبی تعصب کو دخل ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری معلومات ناقص ہوں اور پس پردہ دوسرے کچھ لوگ بھی کام کرنے والے موجود ہوں۔

بہر حال تذکرہ یہ تھا کہ قادیانی فرقے میں مولوی اللہ دتہ جالندھری کا دم غنیمت ہے۔ اللہ دتہ ششتر گربہ قسم کا نام ہے۔ اور اگر عربی میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو عطاء اللہ بنتا ہے۔ مولوی صاحب کے متعلق اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تب بھی یہ بات ان کے طرز عمل سے واضح طور پہ نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ وہ مرزائیوں کے عطاء اللہ بننا ضرور پسند کرتے ہیں۔ مگر اللہ دتہ کو بدل کر عطاء اللہ بن جانے میں سو قباحتوں کی ایک قباحت قادیانی آمر مطلق کی ناراضگی کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اہل علم کی سی راہ نکالی اور اللہ دتہ سے مولانا ابو العطا جالندھری بن گئے۔ ابو العطا میں عطاء اللہ سے دور کی نسبت ہی سہی، مگر نسبت تو ہے۔ پھر آمر مطلق کو خوش کرنے کا آہنگ بھی اس میں موجود ہے"فی لوت"

نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے کل عطا!!
وہ سمجھے، اچھے نام پہ ہوتے ہیں گل عطا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است!
اللہ دیئے بھی بننے لگے ہیں ابو العطا!

مرزائیوں کے ناموں پہ کبھی آپ نے غور فرمایا۔ اکثر و بیشتر اپنے امام کی تقلید میں فاروق احمد، نصیر احمد، فقیر احمد اور داؤد احمد وغیرہ نام رکھتے ہیں۔ اور شاہ صاحب کے بچوں کا نام بھی آپ نے سنا ہو گا۔ عطاء المنعم، عطاء المحسن، عطاء المومن، عطاء المہیمن اب ذرا اس بات پہ غور فرمایئے کہ ذہنی طور پہ اگر مولوی اللہ دتہ صاحب، مرزا صاحب اور اس کی اولاد سے متاثر ہوتے تو وہ بھی اپنے بچوں کے نام انہیں کے وزن پر رکھتے، مگر وہ چونکہ ذہناً شاہ صاحب سے متاثر ہیں اس لیے انہوں نے اپنے بچوں کے نام شاہ صاحب کے بچوں کے ناموں کی تقلید میں عطاء المجیب وغیرہ رکھے۔

دنیا میں سب سے پیاری چیز اولاد ہوتی ہے اور دین میں سب سے پیاری چیز اپنا مسلک ہوتا ہے۔ کبھی آپ نے یہ نہیں سنا ہو گا کہ کسی اثنا عشری نے اپنے بچے کا نام یزید یا ابن زیاد یا اس قسم کا کوئی نام، رکھا ہو۔ ان میں سے اکثر و بیشتر نام غلام علی، یا غلام حسین قسم کے ہوتے ہیں۔ غلام علی سے لے کر نادعلی تک اور غلام حسین سے کلب حسین تک تو نام جائز سمجھے جاتے ہیں مگر یزید و زیاد ہرگز ہرگز گوارا نہیں ہوتے، بلکہ اس مارے کے ایسے نام بھی قابلِ قبول نہیں جو قرآن اوّل میں موجود تھے، مثلاً زید، پھر یہ قیاس کچھ اتنا غلط نہیں کہ مولوی ابو العطاء صاحب اگر ذہناً احمدیت سے متاثر ہوتے تو وہ اپنے بچوں کے نام مقبول احمد، منصور احمد وغیرہ رکھتے جس میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا سا معاملہ ہوتا کہ نام کے نام اور پروپیگنڈہ کا پروپیگنڈہ، مگر انہوں نے نام رکھا عطاء المجیب اور اسی قسم، گو یہ نام بڑا پیارا اور معنوی لحاظ سے بہت خوبصورت ہے، مگر آخر زیاد اور یزید میں معنوی لحاظ سے کیا بدصورتی ہے۔ بنابریں اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ

ذہناً مولوی صاحب شاہ صاحب سے متاثر تھے تو یقیناً یہ بات ناقابلِ تردید ہے۔ ایک اور بات قابلِ غور ہے، مرزا محمود کی بیماری کی خبریں آئے دن اخباروں میں آیا کرتی تھیں مگر یہ کبھی سنا آپ نے کہ مولانا محمد علی جالندھری ان کی عیادت کو تشریف لے گئے ہوں؟ ادھر شاہ صاحب کی علالت کی خبریں مشہور ہوئیں ادھر مولوی ابوالعطاء جالندھری شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔

یہ اگر ذہنی تاثر کی شہادت نہیں تو اور کیا ہے۔؟

اس کے بعد انہیں اپنی چوری کو چھپانے کے لئے اگرچہ بہت سے پاپڑ بیلنے پڑے اور بہت سی ایسی باتیں لکھنی پڑیں جو ان کے علمی پایہ سے بہت فروتر تھیں اور مرزائیوں کی عام سطح پر اترنا پڑا۔

لیکن اگر وہ یہ کرتے تو اپنی اس خواہش کو کس طرح پورا کرتے جو ان کے دل میں شاہ صاحب سے آخری ملاقات کی صورت میں چٹکیاں لے رہی تھی، بہرحال ہمارے نزدیک جہاں یہ باتیں ان کے ذہنی تاثر کی دلیل ہیں وہاں ہم انہیں ان کی مصلحت بینی اور بہ لطائف الحیل خلش پر بھی داد دیتے ہیں۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ بخاری کی عہد آفریں شخصیت سے صرف دوست ہی متاثر نہیں تھے بلکہ دشمن بھی ان سے کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور تھے اور اگر کوئی نفسیات کا ماہر بخاری کے ہم عصر اکابر و اصاغر کی حرکات کا تجزیہ کرے، خصوصاً خطیبان وقت کے اعمال کا جائزہ لے تو اس تجزیئے اور جائزے میں سے بخاری کی عہد آفریں شخصیت نصف النہار کے آفتاب کی طرح ابھر کر سامنے آجائے گی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ میرؔ سے تمہیں صحبت نہیں رہی۔

مولانا غلام رسول مہرؔ

وہ آدمی تھا مگر ــــــــ

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ نیکیوں اور سعادتوں کی ، ایک دنیا لے گئے ۔ جو گوناں گوں اوصاف و خصائل اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے ۔ وہ پہلے بھی ایک وجود میں جمع ہوتے رہے ۔ اب تو زمانہ ان اوصاف و خصائل کی تربیت ہی سے بظاہر محروم نظر آتا ہے ۔ پھر کس بنا پر امید رکھی جا سکتی ہے کہ ویسی کوئی شخصیت ہمیں دوبارہ دیکھنی نصیب ہوگی ۔

جس دور سے میں گزر کر آیا ہوں اس میں ہر طرف عظیم القدر شخصیتوں کی صفیں نظر آتی تھیں جن میں سے ایک ایک فرد علم و فضل ، ہمت و شجاعت ، ایثار و نظریات اور عمل و سرگرمی کا ایک ایسا عجیب و غریب پیکر تھا کہ اسے دیکھتے ہی فرط ادب و احترام سے گردنیں جھک جاتی تھیں ۔ آج ویسے وجود کہاں نظر آتے ہیں ؟ اگر ہوں گے تو وہ جو اکا دکا باقی رہ گئے ۔ جیسے طوفان گزر جاتا ہے تو اپنے پیچھے بادلوں کے چند ٹکڑے چھوڑ جاتا ہے ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور کے لئے اس مجمع عظیم میں بھی ایک معزز مقام حاصل تھا ۔ میں آج ان کی مثال کہاں تلاش کروں ؟ ایک وسیع ظلمت زار میں روشنی کی کرنیں کس امید پر ڈھونڈوں ؟

گزری ہوئی دنیا

حضرت امام بخاریؒ سے ایک شعر منسوب ہے ۔ جس کا مفہوم اردو میں یوں پیش کیا جا

سکتا ہے کہ اگر تیری زندگی طویل ہوگئی تو لازماً تمام احباب کی موت کے غم برداشت کیے بغیر تیرے لیے چارہ نہ رہے گا۔ اس وجہ سے تیری زندگی اندوہ وقلق کا ایک دردانگیز مرقع بن جائیگی۔

اس اندوہ وقلق کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے احباب و رفقاء کا قافلہ منازلِ حیات سے تیزی کے ساتھ گزر گیا۔ اور وہ گردوپیش کا دردان کی حیثیت میں پیچھے رہ گئے۔ میں کیا عرض کروں کہ کن کن بندگوں، محبوں اور ہمدموں کی مفارقت کے داغوں سے سینہ و دل شعلہ زار بنے ہوئے ہیں۔ کان جن صداؤں سے عمر بھر آشنا رہے۔ وہ اب کہیں سننے میں نہیں آتیں۔ نگاہیں جن مناظر کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھیں کہ انہیں کو زندگی کے طبعی اور حقیقی مناظر سمجھنی تھیں۔ ان کی زیارت کے لیے اب دور دور تک جاتی ہیں اور ناکام واپس آتی ہیں۔ کوئی گزری ہوئی دنیا کو کہاں سے لوٹا لاتے اور کیوں لوٹ آتے؟ زندگی کا دھارا انتہائی تیزی سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس میں رجعت ممکن نہیں۔ اس کا پیچھے کی طرف لوٹنا خارج از بحث ہے بلکہ جو موجیں اپنی فطری بے تابیوں کو دھارے کی سطح پر بکھیرتی ہوئی آگے جا چکی ہیں وہ پلٹ کر نہیں آ سکتیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہر موج کے بعد دوسری ویسی ہی یا اس سے ملتی جلتی موج آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور منظر میں شکست یا انقطاع ہی نہیں بلکہ تغیر و تبدل کا بھی احساس بہت کم ہوتا تھا۔ مگر اب؟ ...... میں کیا عرض کروں؟ اب دوسری ہی دنیا وجود میں آگئی ہے۔ وہ دنیا یقیناً باقی نہیں رہی۔ جس میں ہم نے زندگی کے بیشتر اوقات گزارے۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اس گزری ہوئی دنیا کی بہت بڑی شخصیت تھے۔ ان معنوں میں بڑی شخصیت نہ تھے کہ انہیں کوئی بہت بڑا منصب یا وسیع خطے پر اقتدار حاصل تھا۔ ان معنوں میں بھی بڑی شخصیت نہ تھے کہ وہ کثیر المقدار اموال و املاک پر قابض تھے اور اس وجہ سے سیکڑوں ہزاروں افراد کی زندگیاں ان کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھیں۔ اسلام کے نزدیک عظمت کا معیار نہ دولت ہے؛ نہ اقتدار، نہ رنگ ہے، نہ نسل، تنہا علم و فضل ہی

نہیں۔ تقریر وخطابت کی سحر انگیزی، اور تحریر ونگارش کی ندرت کاری بھی نہیں بلکہ صرف تقویٰ ہے۔ صرف حسن عمل ہے اور تقویٰ حسن وعمل کا پیمانہ جی اپنا بنایا ہرگز نہیں۔ بلکہ کتاب وسنت کا پیمانہ۔ اللہ تعالیٰ کے احکام ادھر اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا پیمانہ۔

رفعت و منزلت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسی پیمانے کے مطابق دور حاضر کی رفیع المنزلت شخصیت تھے اگرچہ آج کل بیشتر نگاہوں کا انداز بینش بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ موازنے اور ناپ تول کے مسلمہ معیار باقی نہ رہے۔ زاویہ ہائے نگاہ کچھ اور ہو گئے۔ دقیقہ شناسی کی صلاحیتوں میں فرق آگیا۔ اس لئے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، یقین نہیں کہ اسے آج کل کی سطح فہم ونظر کے مطابق کہنے میں کامیاب ہو سکوں گا اور اپنا مطلب سمجھا سکوں گا مگر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ نگاہوں کی دگرگونی کا موجودہ دور بہرحال عارضی ہے دیرپا نہیں اور جو کچھ عرض کرنے کا خواہاں میں ہوں، وہ جیسا پہلے تھا ویسے ہی آج ہے اور ویسا ہی ہمیشہ رہے گا خواہ زمانہ کتنا ہی چکر کاٹ لے اور کتنی ہی گردشوں کا تختہ مشق بن جائے کیونکہ حقیقتیں بدلا نہیں کرتیں۔ وہ ہر حال میں قائم واستوار رہتی ہیں۔ "کلمات اللہ" میں تبدیلی ممکن نہیں۔

زندگی کے دو مقاصد

بنی رہی۔ کیونکہ برطانیہ ہی پاک و ہند پر قابض تھا۔ اور برطانیہ ہی کے قبضے میں اسلامی دنیا کے وسیع ترین اور بہترین خطے تھے۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمان دنیا میں بالعموم اور پاک و ہند میں بالخصوص آزاد تر، خوددار تر اور خوشحال تر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں اور عقیدہ و عمل کے لحاظ سے سچے مسلمان بن جائیں۔ تفصیلات پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں معاملے میں ان کی رائے صحیح نہ تھی اور فلاں معاملے میں ان سے اندازے کی غلطی ہو گئی مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ جن مقصدوں کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کیے رکھی۔ ان کے لئے سعی و کوشش، جہاد، ایثار یا فداکاری میں کبھی تامل نہ کیا یا کبھی یہ سوچا کہ قدم آگے بڑھایا تو انہیں قید و بند سے سابقہ پڑے گا۔ اور اہل و عیال کے گزارے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ ان مقصدوں کے لئے لڑنا ان کے نزدیک اسلامی زندگی کا گراں بہا فرائض تھا اور فرض اس لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چون و چرا خوش دلی سے ادا کیا جائے۔ اس لئے نہیں ہوتا کہ اسے پورا کرنے کے لئے قدم اٹھانے سے پیشتر ذاتی رنج و راحت کا موازنہ نہ کر لیا جائے۔

شرفِ اولیت

چنانچہ اسلامیت و آزادی کے ہر معاملے میں انہوں نے اولیت و سبقت کا شرف برابر قائم رکھا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے فرائض کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور اس مستعدی و جانفروشی سے انہیں پورا کیا جائے۔ میں اطمینان سے بیٹھا ہوا یہ داستان سرائی کر رہا ہوں اور داستان سرائی سے حقیقی حالات کا اندازہ مشکل ہے۔ اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص اپنے کسی محبوب و مرغوب مقصد کے لئے اپنے اوپر ویسی ہی حالت طاری کرے۔ پھر اسے معلوم ہو گا کہ بلند مقاصد کے دیوانوں کی زندگی کیوں کر گزرتی ہے

پھر یہ معاملہ دو چار دن، دو چار مہینے یا دو چار برس کا نہ تھا۔ حکومت برطانیہ معلوم ہوتی تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ کا عنفوان شباب تھا۔ جب انہوں نے اس میدان میں میرے سامنے بوڑھے

ہو گئے۔

آخری دور کا نقشہ

ان کے ایک نیاز مند نے آخری دور کا نقشہ یوں پیش کیا ہے

اس سحر بیان مقرر اور شیریں المقال خطیب شعلہ نوا اور آتش نفس عالم دین کو اس حالت میں دیکھا جس کی آواز مدھم ہو چکی تھی جس کی زبان سے گفتگو بہ مشکل ہو رہی تھی۔ جس کے قوائے جسمانی و ذہنی کمزور ہو چکے تھے۔ جس کی بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ جو ٹوٹے ہوئے، کچے کرائے کے مکان میں مکین تھے۔ جس کی دینی خدمت کا صلہ عزلت و تنہائی اور جدوجہد آزادی کا انعام مسلسل پریشانی اور کسمپرسی تھا۔ وہ جس کی صحت کبھی باعث صد رشک تھی۔ آج اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھا۔ آج اس کے جوڑ جوڑ اور نس نس میں نصف صدی کا تکان اور مشقت شامل تھی۔

یقیناً ہر شخص کی بڑھاپے کی کیفیت کم وبیش اسی قسم کی ہوتی ہے مگر کیا اس کیفیت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ان مسلسل اور طویل قیدیوں اور اسیریوں کا بھی خاصا بڑا حصہ نہیں جو اس نے دو قرن تک انتہائی مردانگی اور جوان ہمتی سے راہ وطن کی ناگزیر مشقتیں سمجھ کر برداشت کیں ؟ اس حالت میں بسر کیں کہ حکومت برطانیہ بظاہر اٹل نظر آتی تھی ؟۔

بے نفسی اور بلند ہمتی

پھر آپ نے دیکھا کہ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری نے راہ حق کے لئے قربانیوں میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہ کیا وہ اپنی ذات یا اہل وعیال کے لئے کبھی کسی اجر یا متاع دنیے

کا طلب گار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ زندگی کے بالکل آخری اوقات میں بھی وہ چپ چاپ کرائے کے ایک کچے مکان میں مقیم ہو گیا اور کبھی کوشش نہ کی کہ اسے کوئی درمیانے درجہ کا مکان ہی الاٹ ہو جائے۔ حالانکہ اس کے گرد و پیش بارہ تیرہ سال تک الاٹمنٹوں کا ایک ہنگامہ بپا رہا۔ وہ غیر معروف فرد نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل فرطِ عقیدت سے اس کے لیے برابر تڑپتے رہے۔ ارباب حل و عقد میں بھی اس کے شناساؤں ، بلکہ عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی۔ مگر اس نے اپنے لیے زندگی کا جو سانچہ تجویز کر لیا تھا۔ اس میں ایسی باتوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اہلِ حق ہر متاع اہلِ علم کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اہلِ حق اپنی ہر متاع اہلِ علم کی فلاح و بہبود کے لیے لٹاتے رہتے ہیں۔ مگر خود کوئی چیز لینے کے روادار نہیں ہوتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے لیے عزیز ترین متاع اس کی شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ انہوں نے تحریک ہجرت کا آغاز کیا۔ خلافت میں جان ڈالی اور ہر اس سیاسی محاذ پر داد شجاعت دی۔ جس سے انگریز کے پندار استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔

توحید کی پر جوش اشاعت اور سنت کی ترویج میں جس والہانہ انداز سے انہوں نے حصہ لیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عشقِ رسول کی نزاکتوں اور توحید کے اسرار و رموز کو اس کامیابی سے بیان کرتے تھے جو صرف انہی کا حصہ تھا۔

اردو بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ :۔

غالب، ذوق اور داغ نے شاعری کو چھوڑ کر خطابت اختیار کر لی ہے اور پنجابی میں تقریر کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ :۔

چناب اور راوی نے اپنی روانیاں انہیں بخش دی ہیں۔ !

آہ ! آج ہم ایسی جامع صفات شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں،

بخاریؒ کی باتیں

یہ میرے زمانۂ تعلیم کی بات ہے کہ ایک طرف تو ہندوستان کے عوام میں احساس آزادی کی لو بھڑک رہی تھی ـــ اور دُوسری جانب انگریز ہندوستان پہ اپنی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حصولِ آزادی کی ہر تحریک ہر مکتبِ خیال کے لوگوں کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی تھی، خاص طور پہ ملک کا نوجوان طبقہ تو ان تحریکوں کے اثرات قبول کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہا کرتا تھا۔

سیاسی بیداری کے اس موسم میں بیشتر مقرروں اور گھاگ قسم کے واعظوں نے اپنی دکانیں خوب چمکا رکھی تھیں ـــ اس طائفے کے بہت سے لوگ دراصل اقتدار کے ہاتھوں میں کھلونے بنے ہوئے تھے۔ اور اپنی ذاتی اغراض پہ قومی مفاد تک کو قربان کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ غرضیکہ دین اور سیاست کے نام پر مختلف حلقوں میں عجیب النوع تاویلیں اور تفسیریں ہوا کرتیں تھیں

مجھے سیاسی ایچ پیچ کا کچھ زیادہ شعور نہیں تھا ـــ تاہم حالات نے ایک ایسے اضطراب سے ضرور آشنا کر دیا تھا ـــ جسے آگے چل کر نصب العین کی اساس بننا تھا

۱۹۱۸ء میں مہاتما گاندھی نے رولٹ بل کے خلاف تحریک کا آغاز کیا، انگریزوں

کی بدعہدی کے خلاف ملک کے گوشے گوشے میں احتجاج کا آغاز ہوا —— ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہڑتالوں اور جلسوں کی صورت میں احتجاج کا غلغلہ بلند کیا —— میں ان دنوں خالصہ کالج امرتسر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا —— اتحاد باہمی کا یہ عالم تھا کہ ہندوؤں تک نے مساجد میں تقریریں کیں، اور آزادی وطن کی جدوجہد میں انقلاب انگیز قدم اٹھایا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہی دنوں حالات کے اُفق پر حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی شخصیت اُبھری —— اور نکھرتی چلی گئی۔ اُن دنوں میں نے شاہ جی کو محلہ وار مجالس میں سُنا تو اُن کے دین و دانش کی کشش نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا۔ اُس دور کے مناظروں میں اشتعال انگیز گفتگو اور حریف مخالف پر سب وشتم کو مناظرے کا ایک حصہ شمار کیا جاتا تھا، لیکن شاہ جی جس متانت، سنجیدگی، استدلال اور منطق کو پیرایۂ اظہار میں لاتے تھے، وہ انہیں کا حصہ تھا —— اور دین و مذہب کے معاملے میں اُن کے علم کی وسعتوں کا آج بھی خیال آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا کیا خوبیاں اور کیسے کیسے کمالات تھے جن سے فطرت نے بخاری کی شخصیت کو آراستہ کیا تھا۔

ذہنی طور پر تو میں شاہ صاحب کے خیالات کی گرفت میں آ ہی چکا تھا —— لیکن عملی طور پر ابھی تک اُن قرب کی سعادت مجھے نصیب نہ ہوئی تھی کہ غالباً ۱۹۲۰ء میں قادیانیت کی ہر ایک نئی کروٹ کے ساتھ حالات پر اثر انداز ہونے لگی۔ امرتسر کے بندے ماترم ہال میں ایک جلسے کا اہتمام ہوا جس میں مرزا بشیر الدین محمود کو شریک ہونا تھا چنانچہ پولیس کا انتظام بھی بے حد وسیع تھا —— لوگ بھی بڑی تعداد میں جمع تھے —— یہ رمضان کا مہینہ تھا —— لیکن مرزا بشیر الدین محمود کے لئے چائے کا انتظام تھا —— وہ سٹیج کی اوٹ میں چائے نوشی کا لطف اٹھانے لگے، ان کی اس حرکت سے لوگوں میں بڑی سرگوشیاں ہونے لگیں —— بلکہ اُن میں ایک نفرت سی ابھرنے لگی —— خیر اجلاس کا آغاز ہوا، مرزا صاحب میر محفل بنے بیٹھے تھے، ایک مُبلغ روشن دین نے تلاوت قرآن شروع کی۔

اچانک پچھلی صفوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا —— سید عطاء اللہ شاہ بخاری صفیں چیرتے ہوئے دیوانہ وار سٹیج ہی کی جانب لپک رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جلال کی یہ

کیفیت تھی کہ لوگ از خود اُن کے لئے راستہ بناتے گئے، جب وہ اسٹیج سے کچھ ہی فاصلے پر تھے — تو اُن کی آواز کا شعلہ فضا میں لپکا اور یہ الفاظ گونجنے لگے،

"ٹھہرو" تم قرآن پاک غلط تلاوت کر رہے ہو —— خدا کے خوف سے ڈرو"

مرزا بشیر الدین محمود کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں —— اتنے میں پولیس اسٹیج کے قریب آگئی اور مرزا صاحب کو گھیرے میں لے لیا —— لوگوں میں ایک افراتفری سی پھیل گئی —— نعرہ ہائے تکبیر گونجنے لگے اور آن کی آن میں تمام جلسہ تتر بتر ہو گیا۔

شاہ صاحب کی یہ جرأت اُن کے جذبۂ ایمان کی ایک ایسی روشن اور واضح دلیل ہے کہ اس کے بعد اس پہلو پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے واقعات کو معرضِ تحریر میں لانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

امرتسر میں جب جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا —— تو انگریزوں نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ اس دور میں مارشل لا کے نفاذ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی لگن کچھ اور بڑھ گئی۔ اور اندر ہی اندر ایک حرارت انگریزوں کے خلاف ایک نفرت کی شکل اختیار کرتی گئی —— آخر ستر دن کے بعد مارشل لا ختم ہوا —— مسلمانوں نے انگریز کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی —— اور اس شدت سے مصروف عمل ہوئے کہ جلیانوالہ باغ میں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے اور پھر مارشل لا کی قدغن لگانے والے لفٹیننٹ جنرل گورنر سر مائیکل اڈوائر کو رخصت ہونا پڑا۔

برطانوی استبداد کے یہ تماشے، شاہ جی کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت کا ایک ایسا بیج بوتے رہے کہ وہ زندگی کے آخری ایام میں بھی یہ کہا کرتے کہ:۔

"انگریز کی فطرت کا خمیر سانپ کے زہر سے اٹھایا گیا ہے اور اپنی غذا کے لئے اُسے انسانی خون کی جو چاٹ پڑی ہے مشکل سے چھوٹے گی"

مذکورہ مارشل لا کے بعد ہندو مسلم اتحاد نے نئے خطوط وضع کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوا —— جس میں علی برادران، ڈاکٹر کچلو، مسز سروجنی نائیڈو، مفتی کفایت اللہ، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی

پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر انصاری اور دیگر بہت سے راہنمایانِ وطن جمع ہوئے اس اجلاس میں عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اسٹیج کے ایک کنارے ہمہ تن گوش بیٹھے تھے ان دنوں گو شاہ جی کا دائرہ عمل دینی تبلیغ کی حدود سے باہر نہیں تھا — لیکن ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان پر سیاسی رنگ چڑھ رہا تھا۔ اور وقت کو جو عظیم خدمت شاہ جی سے مقصود تھی۔ حالات انہیں اس کے لئے از خود تیار کر رہے تھے، بلکہ دین اور سیاست کی ہم آہنگی کا تصور ان کے دل میں جوان ہو رہا تھا۔

چنانچہ خلافت کانفرنس کے عہد میں مولانا داؤد غزنوی کی وساطت سے شاہ جی نے سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا — میں بھی اُن دنوں عملی طور پر سیاسیات سے وابستگی اختیار کر چکا تھا۔

بلکہ اس جگہ اس امر کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ مجھے سیاست کے میدان میں لانے کے لئے ہر چند کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کا بڑا ہاتھ تھا — لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت کی کشش بھی دراصل اس کی بنیاد تھی۔

مجھے برسوں تک شاہ جی کی رفاقت کا فخر حاصل رہا ہے۔ میں ہمیشہ اُن کی شخصیت کا بڑے غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ اور ہر مرتبہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُن جیسا بیدار مغز، صاحب ایمان عالم دین، خطیب خوش گفتار، راہ اسلام کا شیدائی پھر پیدا نہیں ہو سکتا۔

ان کی عالی ظرفی کا اندازہ کیجئے کہ میرا کئی مرتبہ سیاسی مسائل پر اُن سے اختلاف بھی ہوا۔ بات کے مختلف پہلوؤں پر گرما گرم بحثیں بھی ہوئیں لیکن — اس قسم کے حالات ساون کے بادلوں کی طرح گزر گئے، شاہ جی کے مزاج اور میرے ساتھ برتاؤ میں کبھی فرق آیا — وہ اپنے طرز عمل سے ایک مجھی کو کیا بلکہ ہر دوست دشمن کو اپنا گرویدہ بنا لینے کا کچھ ڈھنگ جانتے تھے کہ — "دور کے کو لوگوں میں وہ بالکل ناپید ہے — بلکہ آئندہ بھی اس قسم کی صفات کی جھلک کسی انسان میں مشکل سے دیکھنے میں آئیں گی

مجلس میں انتخابات کے موقعہ پر وہ کہا کرتے تھے کہ :-

"بھائی! انتخابات ووٹوں کی اساس پر نہ کیا کرو۔ بلکہ مسائل اور ضروریات کی روشنی میں ذمہ داریاں سنبھال لیا کرو۔"

چنانچہ مجلس احرار کے زمانے میں انہوں نے احرار زعما کے اندر ایک ایسی روح پھونک دی تھی کہ وہ کام اور خدمتِ قوم کی لگن میں جماعتی انتخابات کی سطح سے بلند و بالا رہنے کے عادی ہو گئے تھے ۔۔۔ چنانچہ اسی تقریبئے کے تحت ۱۹۳۱ء میں مجھے مجلس احرار کا صدر بنا یا گیا حالانکہ میں دیہ غیر معروف تھا لیکن وقت کی ضرورت کے پیش نظر ہم میں اختلافات کو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ میں مسلسل آٹھ برس تک صدر رہا۔ پھر جب پاکستان بنا تو ماسٹر تاج الدین انصاری نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

مجلس احرار کی صدارت کے زمانے میں شاہ جی نے ہمیشہ سیاسی مذہبی، دینی اور ملی مسائل کو حل کرنے میں در پردہ میری ایسی رہنمائی کی ۔۔۔ کہ اُن کرم فرمائیوں کے سلسلے میں شاہ جی کی روح کو میں جس قدر بھی خراج تحسین ادا کروں کم ہے۔

میں نے شاہ جی کے ساتھ اپنی سیاسی زندگی میں کئی مرتبہ قید و بند کے مراحل بھی طے کئے۔ لاہور، پنڈی اور ملتان کی جیلوں میں بہت سے لیل و نہار ہم نے ایک ساتھ بسر کئے۔ جیل کی دنیا میں بھی میں نے شاہ جی کے مزاج کی ان خوبیوں کو پژمردہ نہیں دیکھا جو ان کی شخصیت کا ایک حصہ تھیں۔ تکالیف پر مسکراہٹیں نچھاور کرنا تو گویا ان کا ایک مشغلہ بن گیا تھا۔ اور بے خوف اٹھ کر فرائض کی بجا آوری کے لئے نتائج کی پروا کئے بغیر ہر مقام پر اور ماحول میں دشمنوں سے ٹکرانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہا کرتے تھے ۔۔۔ اور خاص طور پر عشق رسولؐ کے معاملے میں ان کے جذبات کی مثال اس دنیا میں ملنا ہی ناممکن ہے

انہوں پر انیوں میں میں نے شاہ جی کا جو احترام دیکھا، اُس کے پیش نظر کہہ سکتا ہوں کہ اگر سیاست کی وادیوں میں قدم نہ بھی رکھتے تو پیری مریدی کے میدان میں وہ بڑی شاہانہ زندگی بسر کر سکتے تھے اور دنیاوی آسائشیں اور راحتیں ان کا اوڑھنا بچھونا بن سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے فقر و درویشی کا ایسا شعار اختیار کیا جس پر دنیاوی تکلیفوں کے باوجود وہ زندگی بھر فخر کرتے رہے۔

شاہ جی کی شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے جہاں اور بے شمار صفات سے متصف کیا تھا وہاں ایک صاف ستھرے علمی و ادبی ذوق سے بھی ان کے مزاج کی آراستگی کی تھی۔

نہ صرف وہ جملوں کی پیوستگی کو خوب سمجھتے تھے، بلکہ اشعار کی برجستگی سے بھی کماحقہ آشنا تھے اس سلسلے میں ایک واقعہ خود شاہ جی نے مجھے سنایا تھا، کہ سائمن کمشن کے سلسلے میں الٰہ آباد میں ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا۔ پنڈت موتی لعل نہرو نے شاہ جی کو اس اجلاس میں شرکت کے لئے بہ طور خاص بلوایا اور اپنے ہاں ٹھہرایا ــــ رات کو جلسے میں بڑے بڑے راہنماؤں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ پنڈت موتی لعل نہرو نے سب مقررین کو اس لئے پہلے وقت دیا کہ وہ جانتے تھے کہ شاہ جی کی تقریر کی حدود تو سپیدۂ سحر سے جا ملتی ہیں، اس لئے جب سب مقرر بول چکے تو شاہ جی کا نام پکارا گیا ــــ اتنے میں سائمن کمشن کے خلاف ایک احتجاجی جلوس بھی جلسہ گاہ میں گیا۔ لوگوں نے "سائمن کمشن" کی ارتھی کندھوں پر اٹھا رکھی تھی۔ جیسے دیکھتے ہی شاہ جی کو تقریر کا آغاز ہاتھ آگیا۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کیا ــــ اور ارتھی کی طرف اشارہ کرکے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولے ۔ ؎

ہوئے تم جو مر کے رسوا
ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا!
نہ کہیں جنازہ اٹھتا
نہ کہیں مزار ہوتا

ادھر الفاظ شاہ جی کے ہونٹوں سے جدا ہوئے اُدھر موتی لعل نہرو کرسیٔ صدارت سے اچھل پڑے اور سامعین میں بھی بخاری زندہ باد! کا غلغلہ بلند ہونے لگا بس پھر کیا تھا، اسی شعر کی اساس پر انہوں نے خطابت کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ مجمع لوٹ پوٹ گیا۔ غالب کے اس ایک ہی شعر نے وہ رنگ دکھایا، کہ ایک نہایت مشکل مضمون کی باریکیاں حاضرین پر واضح ہوگئیں۔ وہ سائمن کمشن کے بارے میں شاہ جی کے خیالات کو چند ہی لفظوں میں پوری طرح سمجھ گئے۔ وہ اپنی تقریر کے کسی ایسے

موثر برجستہ شعر استعمال کیا کرتے، کہ محسوس ہوتا جیسے شعر اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے انہیں اردو، فارسی، عربی اور پنجابی کے ان گنت اشعار ازبر تھے۔ خطابت میں زبان اتنی فصیح و بلیغ ہوا کرتی کہ نثر پر بھی شاعری کا گمان ہوتا۔

بذلہ سنج اور خوش گفتار ایسے محض الفاظ کی لوٹ پلٹ سے گفتگو میں طنز و مزاح کے تیور اور نشتریت کا اثر پیدا کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

شاہ جی بعض اوقات بڑے بڑے علمی و دینی مسائل کی گرہیں کھولتے ہوئے شعر و شاعری سے ایسا کام لیا کرتے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی۔

مثلاً ایک مرتبہ حج کے بارے میں تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ اچانک مزاج کا دھارا شعر و سخن کی طرف گیا۔ کہنے لگے ؎

کوئی تو بات ہے ساقی کہ میکدے میں ضرور
جو دُور دُور سے میخوار آ کے پیتے ہیں
بہ فیضِ میکدہ دیکھو کہ چار ہی دن میں
ہم ایسے رند بھی پینا بتا کے پیتے ہیں

شاد عظیم آبادی کے یہ اشعار شاہ جی کے نفیس لب و لہجہ میں سن کر حاضرین بے ساختہ جھوم اٹھے۔

میں نے شاہ جی کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں اور خطیبوں کا چراغ گل ہوتے دیکھا ہے۔ ایک جلسے میں شاہ جی کے علاوہ مولانا محمد علی اور دیگر زعماء نے بھی تقریریں کیں۔ لیکن شاہ جی کی تقریر کا رنگ و روغن ہی کچھ ایسا تھا۔ اُن کے بعد اس فن کے بعض نامی گرامی لوگوں کی تقریر بھی عوام کو متاثر نہ کر سکی ــــ چنانچہ مولانا محمد علی نے شاہ جی سے کہا :-

"بخاری! تم اپنی تقریر میں لوگوں کو جب قورمہ اور پلاؤ فراہم کرتے ہو تو بعد میں انہیں یہ بھی کہہ دیا کرو ــــ کہ محمد علی کی سوکھی روٹی بھی قبول کر لیا کریں۔"

اس پر شاہ جی فوراً بولے :-

"حضور! ایک جرنیل ایک سپاہی کے بارے میں یہ بات کہہ رہا ہے سپاہی کی شہرت تو دراصل جرنیل کی عظمت کا آئینہ ہوتی ہے"

یہ الفاظ سن کر مولانا محمد علی نے مزید بحث و تمحیص کی گنجائش نہ پاتے ہوئے یکسر چپ سادھ لی۔

بخاری جیسے خطیب کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا محمد علی جیسے جادو بیان مقرر نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں شاہ جی کے بارے میں نہایت جلی طور پر لکھا تھا کہ :-

"یہ شخص مقرر نہیں بلکہ ساحر ہے"

شاہ جی کے بارے میں میرے دل میں ان گنت یادوں کا ایک ایسا بے ترتیب سرمایہ موجود ہے جسے مربوط کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے ــــــ وہ ایک ایسی یگانۂ روزگار ہستی تھے کہ اُن کا تذکرہ برسوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتا ــــــ آخر میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ ؎

ما ز مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

مظفر نواز خاں درانی

شاہ جیؒ زندہ ہیں

بھائی شورش : میرا حال تو حضرت عمرؓ جیسا ہے ، جیسے انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا یقین نہیں آتا تھا ، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور سب کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کے باوجود شاہ جی کی موت باور کرنے کو دل نہیں چاہتا دل کو سمجھاتا ہوں تو عقل نہیں مانتی ۔ کہیں وہ مجسم زندگی بھی موت کا شکار ہو سکتی ہے ۔ میرے نزدیک تو شاہ صاحب زندگی کا دوسرا نام ہے ۔ البتہ ان کے سامنے نہ ہونے سے ہم لوگ اب ضرور مر چکے ہیں ۔ مُردوں سے مضمون لکھوانا اور پھر باصرار نارا ض ہو کر لکھوانا آپ کا کام ہے ۔ شاہ جی جیسی باغ و بہار شخصیت پہ لکھنا تو آپ جیسے عبقری لوگوں کا کام ہے ۔ میرا ایسے رضاکار جن کا کام عمر بھر جلسوں کی دریاں سمیٹنا اور بچھانا رہا ہو یا اور آگے بڑھے تو کسی قسم کی زخمیوں یا بیماروں کی کوئی سوشل خدمت کر دی ، کیا شاہ جی پہ مضمون لکھیں گے اور پھر لکھئے بھی تو ان کی کون کون سی بات کو لکھئے انہیں سے ایک سنا ہوا شعر بار بار سامنے آکر ہاتھ پکڑ لیتا ہے کہ میاں کیا لکھو گے ؎

دامانِ نگہ تنگ گلِ حسنِ تو بسیار
گل چینِ نگاہِ تو ز داماں گلہ دارد

خواتی تاثرات کی یہ چند سطریں بھی اس لئے لکھوا رہا ہوں تاکہ آپ کی وہ بدگمانی دور

ہو جائے جو آپ کے ذہن میں پیدا ہو چکی ہے۔ دوسرے یہ بھی خیال ہے کہ یوسف کے خریداروں میں نام تو لکھا جائے گا۔ میرے جیسے لوگوں کے لئے یہی نسبت ہی کافی ہے ؏

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

شاہ جی کا ملتان میں آنا جانا بھی کافی تھا اور مجھے سکول ہی کے زمانے سے ان کی تقریریں سننے کا شوق تھا۔ ملتان کی سیٹھ فیملی کے ایک رکن پورن چند میرے کلاس فیلو تھے اور وہ بھی شاہ جی کی تقریروں میں عموماً میرے ساتھ جاتے تھے۔ سکول کا زمانہ ختم ہوا تو پورن چند نے ڈی اے۔ وی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ اب ہمیں شاہ جی کی مزید تقریریں سننے کا بہترین موقعہ میسر آیا اور لاہور میں بھی پورن چند ہمیشہ میرے ساتھ جاتا۔ اور جہاں شاہ جی کی تقریر کا اعلان ہوتا، میں، پورن چند اور دوسرے احباب وہاں ضرور پہنچ جاتے۔ شاہ جی کی تقریر سننے کے بعد پورن اکثر چپ سادھ لیتا بلکہ تقریر کے دوران میں بھی اس کی حالت ہمیں متغیر نظر آتی میں نے بارہا اس سے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے مگر وہ عموماً بتلانے سے گریز کرتا۔ آخر میرے اصرار پر ایک دن اس نے بتلایا کہ شاہ جی جب قرآن پڑھتے ہیں تو مجھ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے کسی پر جادو کر دیا گیا ہو۔ وہ قرآن پاک پڑھتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ابھی ابھی آسمان سے اتر رہے ہیں، وغیرہ

اس کی یہ کیفیات سن کر میں نے اسے اسلام لانے کی ترغیب دینے کی خاطر کہا "پھر اسلام کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے معاً کہا۔ "آپ کے مذہب کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن آپ کی قوم کا مستقبل مجھے روشن نہیں دکھائی دیتا۔ بخاری جیسے آتش بیان مقرر تو آپ کے ہاں بے شک موجود ہیں لیکن دت اور بھگت سنگھ جیسے رضاکار مفقود ہیں"۔ میں نے بے ساختہ اسے جواب دیا: "میں شاہ جی کا رضاکار ہوں اور تازندگی ان کا رضاکار رہوں گا"۔ اور یہ صرف وقتی جواب نہیں تھا بلکہ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شاہ جی کا رضاکار ہوں گا اور وہ جو خدمت بھی میرے سپرد کریں گے میں اسے ہر صورت میں بجا لاؤں گا۔ اور اس وقت سے آج تک کہ تیس پنتیس

برس گزر گئے، میں اپنے آپ کو شاہ جی کا رضاکار ہی سمجھتا ہوں۔ مواقع اگرچہ میسر آئے اور دوستوں نے آگے بڑھانا بھی چاہا مگر میں نے کبھی آگے بڑھ کر لیڈر بننے کی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ کبھی سٹیج پر نمایاں ہو کر بیٹھنے کی کوشش بھی نہیں، کبھی تقریر نہیں کی کبھی قلم کی گھس گھس کو پیشہ نہیں بنایا اور معاف کرنا آج بھی آپ کے اصرار کو یہ مضمون لکھوا کر پورا کر رہا ہوں لکھ نہیں رہا ہوں) صرف اس لئے کہ میں اپنے عہد نبھانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور رضاکار رہنے کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا

ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

شاہ جی تو شورش بھائی! ایک نجم ہدایت تھے ہم انہیں دیکھ کر نشان راہ کا پتہ پاتے تھے۔ بلکہ وہ ماہتاب مسرت تھے کہ ہم ان کی ٹھنڈی اور میٹھی چاندنی سے دلی مسرتوں کی کیفیتیں سمیٹتے تھے، نہیں نہیں بلکہ وہ آفتاب رشد و ہدایت تھے۔ وہ وقت کے شہنشاہ تھے اور اسی طرح اپنے وقت کے بہت بڑے فقیر بھی تھے۔ وہ عالم نہیں بلکہ عالم گر تھے وہ بظاہر طبیب نہیں تھے مگر حقیقت میں وہ دلوں کے طبیب اور حکیم الامت تھے۔ میں نے بڑے بڑے وزراء، حکام اور درد ساء کو ان کی چوکھٹ پر آتے دیکھا مگر وہ کبھی نہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ ان کی کسی ناجائز خواہش کو مانا اور ہمیشہ غریبوں میں بیٹھ کر اپنے آپ کو انہیں میں کا ایک فرد بنا لیتے اور اس بات میں زیادہ خوشی اور مسرت محسوس کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جن دنوں آپ کی رہائش خان گڑھ میں تھی اور خان گڑھ کو سیلاب نے آگھیرا تو ان کے دوست بہت مضطرب تھے۔ میرے بھائی ملک عطاء اللہ نئے مکتبے والے روزانہ سائیکل پر خان گڑھ جاتے اور شام کو واپس آ کر شاہ جی خیریت احباب کو سناتے ایک دن محمد اشرف درزی بھی فرط محبت میں اپنی بیماری اور کمزوری کے باوجود سائیکل پانی میں چلا کے شاہ جی کے پاس پہنچے تو شاہ جی ان سے بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم نے بیماری اور کمزوری میں اتنی تکلیف کیوں کی ہے ـــــ اس وقت ان کا اضطراب دیدنی تھا، فوراً اس کے لئے شربت پانی اور روٹی کا اہتمام کرنے میں مصروف ہو گئے، مگر جب اشرف نے کہا میں

روزے سے ہوں تو شاہ جی اضطراب دوگنا ہو گیا۔ پہلے تو یقین نہ کیا کہ کہیں میری تکلیف کو دیکھ کر یہ بہانہ ہی نہ بنا رہا ہو پھر جب یقین آ گیا کہ واقعی یہ روزے سے ہے تو خود ماٹھ کر اندر سے ایک کپڑا لے آئے اور اشرف سے فرمایا اسے باندھ کر جلدی سے ٹانگے کے پیچھے بیٹھ جاؤ اور خود ٹانگا چلانا شروع کر دیا۔ دوسرے دوستوں نے عرض کیا کہ ہم اسے نہلا دیتے ہیں مگر نہ جانے اور فرمایا مجھے مسرت اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور گھنٹہ بھر اسے ٹانگے سے علیحدہ نہ ہونے دیا اور پورا گھنٹہ خود ٹانگا چلاتے رہے۔ کیا کوئی دوسرا لیڈر آپ ایسا بتا سکتے ہیں کہ اپنے ادنیٰ رضاکاروں کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہو!

انہیں دنوں میں احباب نے بہت کوشش کی کہ شاہ جی کے لئے کوئی مکان ملتان میں الاٹ کرا لیں کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ وہ امرتسر میں اپنا بہترین مکان چھوڑ کر آئے تھے اور شاہ جی کے اشارے یا رضا کے بغیر یہ کوششیں تادیر جاری رہیں مگر نمائشی دینداروں کی ٹولی نے ہماری یہ کوششیں بارآور نہ ہونے دیں آخر میں مجبور ہو کر بھی شیر خان کے محلہ میں ایک چھوٹا سا کچا مکان ہم نے شاہ جی کی خاطر کرایہ پر لے لیا۔ اس زمانے میں اس کا کرایہ بارہ روپے ماہوار تھا اور کوئی دوسرا اچھا مکان مل نہیں رہا تھا اس لئے ہم نے کوشش کی کہ شاہ جی کسی طرح ایک بار ملتان تشریف لے آئیں۔ پھر موقعہ ملنے پر مکان بدلا جا سکتا ہے۔ جب ملک عطاء اللہ شاہ جی کو معہ سامان لے آئے تو میں نے معذرت کے انداز میں کہا یہ مکان اگرچہ آپ کے لائق نہیں مگر یہ عارضی انتظام ہے اور بہت جلد ہم کوئی اچھا سا مکان آپ کے لئے ڈھونڈ لیں گے مگر آپ نے ہنستے ہوئے پر مسرت لہجے میں فرمایا۔ "میری جو حیثیت ہے وہ میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں میری حیثیت سے تو یہ مکان بھی بڑا ہے میرے بزرگوں نے تو کھجور کی عارضی چھتوں اور کچی دیواروں میں ہمیشہ گزارا کیا جنہیں مکان کہنا آپ لوگ شاید گناہ سمجھیں گے اور یہ تو بہر حال مکان ہے اور مجھے اس واسطے بھی بہت پسند ہے۔ کہ آپ لوگوں نے اسے میرے لئے پسند کیا ہے رہا

دوسری طرف جاتے دیکھ کر میں نے بات بدلنے کی کوشش میں عرض کیا کہ شاہ جی یہ محلہ کچھ اچھا نہیں اس محلہ کے لوگ آپ کو وہابی سمجھتے ہیں اس لئے مکان تو بہرحال ہم کہیں اور لیں گے البتہ عارضی طور پہ چند دن آپ کو یہاں گزارنے ہی پڑیں گے۔ یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا وہابیت کا انتظام میں خود کروں گا۔ اور پھر مکان نہ بدلنا تھا نہ بدلا اور آخر وقت تک اسی مکان میں رہے اور وہیں سے آپ کا جنازہ اٹھا اور وہابیت کا انتظام یوں ہوا کہ سال بھر کے اندر میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ محلے کے بڑے چھوٹے جوان اور عورتیں آپ کے ساتھ "ابا جی ابا جی" کے الفاظ سے مخاطب ہوتے تھے۔ وہ سب کی غمی شادی میں صرف شریک ہی نہیں بلکہ مشیر بھی تھے اور ڈیوڑھی کے بارہ فٹ کمرے میں ہر وقت پندرہ بیس آدمی موجود رہتے کوئی باتیں کر رہا ہے کوئی کمر دبا رہا ہے اور کوئی پاؤں دبانے میں مصروف ہے اور شاہ جی ہیں کہ بچے بوڑھے سب کے ساتھ باتیں کئے جا رہے ہیں اور مجلس ہر دو منٹ کے بعد کشت زعفران بن جاتی ہے۔

ایک دن محلے کا ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی کہنے لگا شاہ جی میں مر رہا ہوں اور آپ توجہ ہی نہیں کرتے۔ فرمایا بھئی، بیٹھو میں ذرا ہاتھ صاف کر لوں۔ ہاتھ صاف کر کے تشریف لائے تو اس آدمی کے روبرو بیٹھ گئے اور فوراً منہ کھول کر اپنے مصنوعی دانت نکال لئے اور پھر فرمایا کہ دیکھو بھائی کہ سید کا ایک دانت بھی باقی نہیں بچا سب ایک ایک کر کے گر گئے ہیں اب تیرے دانت کا کیا علاج کروں؟ ڈاکٹر کے پاس جاؤ دوائی لگواؤ اور دعا میں کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جلد شفا عطا فرمائیں۔ اور لاکھ بات کی کہو تو ایک بات اور بھی بتا دوں جس سے ڈاکٹر بھی متفق ہیں۔ پھر مسکرائے اور فرمایا:۔

علاج دنداں اخراج دنداں

ایک روز شاہ جی نے اپنی ابتدائی بیعت کا واقعہ سنایا کہ میں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے پاس بیعت کے لئے حاضر ہوا آٹھ روز وہاں رہا تو حضرت

نے میری طرف توجہ نہ فرمائی ادھر ان کی بے رخی سمندِ شوق پر تازیانہ ثابت ہوئی حتی کہ جب ایک دن وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں باہر تشریف لے جا رہے تھے تو میں بھی گھوڑے کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ انہوں نے گھوڑا دوڑایا تو میں نے بھی پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ جب ان کی نظر پڑی تو پوچھا کیا بات ہے؟ میں عرض کی، حضور آپ کی توجہ کا طلب گار ہوں۔ فرمایا:۔ جاؤ ایک دو روز اور انتظار کرو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ دو روز کے بعد مجھے بلایا۔ بیعت فرمائی اور چند کلمات پڑھنے کے لئے بتلائے میں عرض کیا اگر اجازت ہو تو قصیدہ غوثیہ بھی پڑھا کروں۔ فرمایا میں نے تمہیں وہ چیز بتلائی ہے جس کو پڑھ کر غوث الاعظم غوث بنے اور تم قصیدہ غوثیہ پڑھنے کی اجازت مانگتے ہو!

شاہ جی ایک مرد قلندر تھے اور آپ جانتے ہیں ع

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

اس لئے طبعاً بہت بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ اُن کے دوستوں کو ان کا ذاتی مکان نہ ہونا بہت کھٹکتا تھا اور اکثر ان کی محفل میں بھی اس موضوع پر باتیں شروع ہو جاتا کرتی تھیں۔ مگر آپ ہمیشہ ہنس کر ایسی بات کو ٹال جایا کرتے تھے بلکہ فوراً موضوعِ سخن بدل لینے کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک دن میری موجودگی میں ایک شیخ صاحب جن کی میانوالی میں لکڑی کی دکان تھی چار ہزار روپیہ لائے اور آپ کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ یہ مکان کی خاطر ہے آپ اس میں کچھ اور روپیہ ملا کر کوئی چھوٹا موٹا مکان خرید لیں۔ آپ نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا مگر ساتھ ہی کہا آپ ابھی یہ روپیہ اپنے پاس رکھیں میرے پاس رہا تو خرچ ہو جائے گا بھائی مظہر میرے لئے مکان کا انتظام کر رہے ہیں۔ جب انتظام ہو جائے گا۔ اور ضرورت ہو گی تو روپیہ آپ سے منگوا لیں گے۔ وہ خوش خوش واپس گئے اور اس کے بعد وہ ہفتے عشرے کے بعد جب بھی ملتان آتے، تو مجھ سے پوچھنے کے لئے آتے کہ مکان کا کچھ انتظام ہوا اور میں بھی ہمیشہ انہیں یہی جواب دیتا ابھی تو نہیں ہوا ہو جائے گا۔

ایک دن تنگ آ کر انہوں نے کہا اگر دیر ہے تو یہ روپیہ اپنے پاس رکھ لیں

کہیں مجھ سے خرچ نہ ہو جائے اور چونکہ یہ منت کا روپیہ ہے اس لئے میں اسے خرچ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے دریافت کیا کہ منت کیسی؟ تو شیخ صاحب نے بتایا کہ میرے ہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں اور لڑکا کوئی نہیں تھا۔ میں نے شاہ جی کی خدمت میں استدعا کی آپ نے مجھے ایک دعا بتائی جس کے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور میری مراد پوری ہو گئی۔ جس دن لڑکا پیدا ہوا تو میں نے عہد کیا تھا کہ شاہ جی کے مکان کے لئے میں بھی امداد کروں گا۔ میں شیخ صاحب کی بات سے متاثر ہوا اور ان سے کہا میں شاہ جی سے اجازت لے کر ہی روپیہ اپنے پاس رکھوں گا۔ اور جب میں نے یہ ساری بات شاہ جی کے گوش گزار کی اور ان کی اجازت کا طلب گار ہوا تو انھوں نے فرمایا۔ میرے بھائی! شیخ صاحب سفید پوش آدمی ہیں۔ کثیر الاولاد ہیں۔ وہ تو محبت کی وجہ سے دیتے ہیں لیکن میں اپنی خواہشات پر ان کے بچوں کو قربان نہیں کر سکتا۔ اگر سو پچاس ہوتے تو میں نے بھی لے لیتا مگر تم بھی اُن کی دل شکنی نہ کرو اور کسی نہ کسی طرح انہیں ٹال دو تاکہ ان کے دل کو ٹھیس بھی نہ لگے اور روپیہ بھی انہیں کے پاس رہے یہ تھا پیسے ٹکے کے سلسلے میں ان کا کردار! اور سوائے مردِ قلندر کے اور ایسا کون کر سکتا ہے؟

ایک دن لائل پور سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دس روپے آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ آپ نے لے کر اسے واپس کر دیئے۔ اس نے بار بار اصرار کیا تو آپ نے فرمایا بھائی میں نے لے تو لئے ہیں اب اپنی طرف سے تمہیں دیتا ہوں اس میں کیا حرج ہے۔ مگر وہ شخص نہ مانا۔ اس پر آپ غصے ہو گئے اور قطعاً روپے لینے سے انکار کر دیا وہ مغموم ہو کر چلا گیا تو میں نے عرض کیا آپ نے ایک غریب آدمی کو مغموم کر دیا، لے لینے میں کیا مضائقہ تھا تو فرمایا بھائی مظہر تمہیں معلوم ہے میری کوئی جاگیر نہیں کوئی تجارت نہیں مسلمان دیتے ہیں میں کھاتا ہوں اور میرا کام ہی یہی ہے مگر ہمیشہ یہ خیال ضرور رکھتا ہوں کہ دینے والا ایک تو صاحب حیثیت ہو اور اپنی حیثیت کے مطابق دے رہا ہو دوسرے اس کا یہ کام صرف رضائے الٰہی کے لئے ہو۔ لوگوں میں یہ بھی ایک رسم ہے کہ پیسے

پاس خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیئے اب وہ بیوی کا زیور بیچ کر بھی کچھ ساتھ لے کے آتے ہیں ایسے آدمیوں سے میں کسی طرح بھی کچھ لینے کا روادار نہیں ہو سکتا۔

بہت پرانے زمانے کی ایک اور بات یاد آئی ہے۔ ایک بار ملتان میں آئے اور دیگر رسومات پر آپ نے فرمایا۔ تعزیہ اور دوسری رسوم سب کا پوسٹ مارٹم کیا وہ تو تقریر فرما کر چلے گئے مگر رسوم کے پجاریوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے اور شاہ جی کے خلاف وہ طوفان بدتمیزی اٹھایا کہ الامان۔ چند ماہ کے بعد شاہ جی پھر تشریف لائے اور ہم لوگ حافظ محمد یار مرحوم کے مکان پہ ان سے ملنے گئے اور انہیں سب حال سنایا اور انتقامی جوابی کاروائی کی اجازت چاہی، تو آپ ہنس پڑے اور فرمایا:۔ بھائی ایسی باتوں سے آزردہ کیوں ہوتے ہو۔ کوئی جو کچھ کہے اسے کہنے دو۔ وہ اپنا کام کر رہے ہیں تم اپنا کام کئے جاؤ۔ اور ہمیں تو وطن کی آزادی کے سلسلے میں اس قدر کام ہے کہ ایسی باتوں پہ توجہ دینے کی فرصت ہی میسر نہیں۔ وطن آزاد ہو جائے گا تو سب کام درست ہو جائیں گے یہ سب فتنے انگریز کے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔ پھر انتہائی سوز ناک لے میں ایک بند پڑھا۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں مگر خیال آتا ہے کہ کچھ ایسے ہی الفاظ تھے ؎

اپنا کچھ غم نہیں پر یہ خیال آتا ہے
مادر ہند پہ کب تک یہ زوال آتا ہے
دیس آزادی کا کب ہند میں کال آتا ہے
قوم اپنی پہ یہ رہ رہ کے ملال آتا ہے
منتظر رہتے ہیں ہم خاک میں مل جانے کو

پھر رات کو جب تقریر ہوئی تو آپ نے فرمایا:۔

میرے ملتانی بھائیو! تم یہ کیوں دیکھتے ہو کہ میں کون ہوں اور کیسا ہوں فی الحال تو تمہیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ میں جو قرآن تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں اور اس کا ترجمہ کرتا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ اگر صحیح ہے تو اس پہ عمل کرو اور اگر غلط کہتا ہوں تو میرے منہ پہ جوتے مارو۔ رہا میرا نسب تو مجھے ابھی اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس

کے پوچھنے کا حق صرف اس آدمی کو ہے جس کے گھر میں میں اپنے بیٹے کے رشتے کے لئے جاؤں وہ پوچھے گا تو میں کم از کم اپنی سولہ پشتوں تک کا حال اس کو بتا سکوں " یہ سن کر گالیاں دینے والوں کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔

شاہ جی مجھ نالائق و ناکارہ پر بہت ہی مہربان تھے اور جب کبھی ملتان میں تشریف لاتے تو میرے غریب خانے پر ملنے کے لئے ضرور آتے تھے چونکہ میں ایک ایسے محلے کا رہنے والا تھا جس کے زندگی کے طور طریق عام لوگوں سے مختلف ہیں اس واسطے ہمیشہ خیال رکھتا تھا کہ شاہ جی کو کوئی بات ناگوار نہ گزرے۔ ایک بار آپ مغرب کی نماز کے وقت ہی تشریف لے آئے ہیں مسجد کے دروازہ کے قریب کھڑا مصری خان کا ایک پٹھان کھڑا تھا۔ اس نے شاہ صاحب کو دیکھتے ہی ایک نامعقول بات کہی۔ وہ میں نے بھی سن لی اب شاہ صاحب مسجد کے اندر تشریف لے آئے ادھر میں مسجد کے باہر چلا گیا اور طیش میں آکر اس پٹھان سے الجھ گیا ادھر لوگ آپ سے مصافحہ کرنے کو لپکے مگر آپ سب کو چھوڑ چھاڑ کر فوراً مسجد سے باہر آگئے اور نہایت ٹھنڈے انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا بھئی طیش میں کیوں آگئے بندۂ خدا کس کس سے لڑو گے؟ میرا چونکہ رواں رواں جل رہا تھا اس لئے میں برابر جلی کٹی کہتا گیا مگر آپ نے مجھے دھکیل کر مسجد کی طرف میرا منہ کر دیا کہ چلو نماز کو دیر ہو رہی ہے اور اس کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"اس نے ہمارے دوست کو ناراض کر دیا ہے خوش یہ بھی نہیں رہ سکے گا"

خیر یہ ان الفاظ کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ چند دن کے اندر اندر بیمار ہو گیا دو سال تک چارپائی پر پڑا رہا اور اس کے بعد لکڑی کے سہارے بڑی کوشش کرتا تو سو دو سو گز تک جا سکتا۔

ملتان میں ایک نواب زادے کی وفات پر ملتان کے جملہ رؤسا اور نواب صاحبان جمع تھے ایک کمرہ میں جس میں نواب مرید حسین قریشی بھی موجود تھے بخاری کا ذکر بھی چھڑ گیا میں کمرے سے باہر کھڑا خود اپنے کانوں سے باتیں سنتا رہا نواب مرید حسین نے فرمایا باتیں تو بخاری سچی کہتا ہے مگر ہمارے پیٹ کا سوال درمیان میں ہے۔ اس لئے ہم ان کی باتیں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں نے آگے بڑھ کر کہا "نواب صاحب

آج تو آپ نے سچ فرمایا" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ برخوردار میں ہمیشہ سچ کہتا ہوں۔

شاہ صاحب بیماری کے زمانہ میں بھی تبلیغ کے فریضہ کو نہ بھولے۔ ہر آنے جانے والے سے ختم نبوت کی حفاظت کا عہد لیتے اور اپنی تکلیف کا ذکر نہ کرتے۔ مولیٰ کی دی ہوئی تکلیف کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا صرف انہیں کا کام تھا کبھی ناشکری یا احساس تکلیف کا ایک لفظ بھی اُن کی زبان سے نکلا وہ ہمیشہ اپنے مولیٰ سے راضی رہے اور یقیناً مولیٰ بھی اُن سے راضی رہا وہ درجنوں محلے کی بیواؤں اور یتیموں کی پرورش فرماتے تھے اور جس طرح کا تعلق جس سے تھا اسے آخر تک نبھانے کی کوشش فرماتے رہے۔

ایک دن ان کی محفل میں ایک شخص نے کہا کہ شورش کاشمیری نے "بوئے گل نالۂ دل" میں کسی کو معاف نہیں کیا۔ آپ نے فوراً فرمایا مجھے تو معاف کیا ہے۔ محفل کشت زعفران ہو گئی۔ پھر فرمایا۔ میرے بھائی شورش نے جتنی محبت کی ہے وہ میں جانتا ہوں وہ ساری ساری رات آنکھوں کاٹتا ہے۔ دن رات محنت کرتا ہے۔ اب اللہ نے اس کی محنت کا اس کو اجر دیا ہے۔ میرا دل ٹھنڈا ہے۔ اللہ اور اس کو اس سے زیادہ دے۔

نذیر مجیدی

سیّد عطاء اللہ شہ بخاریؒ زندہ باد

۱۴ ھ ۸۱

انتقال پرملال سیّد عطاء اللہ شہ

۱۳۸۱ ہجری المقدّس

"بُرائی بہرحال برائی ہے، جو انسان دوسرے کا
بُرا چاہتا ہے وہ گویا اپنے یا اپنی اولاد کے لئے
بدی کاشت کرتا ہے"

(سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ)

مولانا غلام قادر گرامی

در شہادت گاہِ تکمیلِ رموزِ امر و نہی!

آرزومندِ شہادت جز عطاء اللہ نیست
حرف حرفش معنیٔ تفسیرِ قرآں است و بس
حرف با حرفش بگیرد آنکہ رمز آگاہ نیست
ہر چہ می گوید قلندر دیدہ گوید اے پسر
در نگاہِ اہلِ معنی غیرِ وجہ اللہ نیست
نفی و اثباتِ شہید دوست در معنی یکیست
ہم عطاء اللہ ہست و ہم عطاء اللہ نیست

علامہ اقبالؒ مرحوم

گلہائے عقیدت

مولانا سیّد بخاریؒ کی خدمت میں ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیّت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن دربند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

از سوانح حیاتِ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مصنف خان کابلی ۔۔۔ لاہور، ۱۹۴۰ء

؎ علامہ اقبال مرحوم نے یہ نظم ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی جب تحریک خلافت شباب پر تھی اور شاہ صاحبؒ تین سال کے لئے زندانِ فرنگ میں اسیر و محبوس کر دیئے گئے تھے

مولانا ظفر علیخاں

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

اک چست فقرہ کس کے بخاری نے کس دیا
ڈھیلا پن آگیا جو مسلماں کی چول میں

حرّیت ضمیر کا ڈنکا بجا دیا
ہندوستاں کے عرض میں اور اسکے طول میں

ارکان دین ہیں بستۂ آزادیٔ وطن
یہ سب فروع آگئے ایک اس اصول میں

کہدو یہ اس سے تم کو "خودی" کا جو درس دے
رکھا ہی کیا ہے تیری فعولن فعول میں

کانوں میں گونجتے ہیں بخاریؒ کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

از سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری مصنفہ خان کابلی لاہور ۱۹۴۰ء

شورش کاشمیری

جرأت تیری احرار کا عنوانِ جلی ہے

قربانی و ایثار کی تفسیر بخاری

ایمان کے گلزار کی ہے بادِ بہاری!

یہ ایک ہی لفظوں کے ہزاروں پہ ہے بھاری

واللہ زبان اس کی ہے شمشیرِ دو دھاری

گفتار کی گرمی سے خیالات بدل دے!

چاہے تو غلامی کی روایات بدل دے

اے قافلۂ ملتِ بیضا کے عناں گیر

جذبوں میں چھلکتی ہے ترے جرأتِ شبیر

ہیں کوثر و تسنیم کی موجیں تری تقریر

لہجہ میں تڑپتی ہے ترے برّشِ شمشیر

روشن ہوئی یہ بات ترے حسنِ عمل سے

ڈرتے نہیں توحید کے فرزند اجل سے

فطرت تری دامانِ شجاعت میں پلی ہے
جرأت تری احرار کا عنوان جلی ہے
غیرت تری ایمان کے سانچے میں ڈھلی ہے
لاریب کہ تو لختِ دلِ ابنِ علیؓ ہے
نگراں تری عزت کا زمانے میں خدا ہے
اولادِ شمر معرکہ آرا ہے تو کیا ہے؟

از سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مصنفہ خان کابلی لاہور ۱۹۴۰ء

ودود علی خاں رئیس کیلاش پور (سہارنپور)

وہ جس کے فقر سے لرزاں بتِ سرمایہ داری ہے

وہ جس کے فقر سے لرزاں بتِ سرمایہ داری ہے
امیرِ ملتِ بیضا، عطاء اللہ بخاریؒ ہے

شرف بخشا خدا نے جس کو حق کی پاسبانی کا!
پڑھایا درس دنیا کو حیاتِ جاودانی کا

کبھی باطل کے آگے جھک نہیں سکتی جبیں جسکی
دلوں میں گھر بنا لیتی ہے تقریرِ حسیں جسکی

جسے نغمہ سرائے باغ ختم المرسلیں کہیئے
جسے شیدائے روئے رحمت اللعالمیں کہیئے

نہاں ہے جس کی آنکھوں میں خمارِ بادۂ ہستی
رہینِ ساغرِ کوثر ہے جس کی شانِ سرمستی

نظر ہے جس کی اسرارِ کلام اللہ سے واقف
جہادِ حریت کی روح، رسمِ دراہ سے واقف

رہا برسوں جو پابند جفائے قید سلطانی
بلا شک عصر حاضر کا وہی ہے یوسفِ[۱] ثانی
نمایاں جس کے چہرے پر جلالِ حیدری اب تک
ہویدا جس کے رخ پر ہے جمالِ سرمدی اب تک
وجودِ ناتواں کی پوری یارب التجا کر دے
عطاء اللہ کے قدموں پہ اپنی جاں فدا کر دے

۱؎ سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مصنفہ خان کابلی، لاہور ۱۹۴۰ء

مولانا انعام اللہ خاں ناصر حسن پوری

جس زمیں پر ہو عطاء اللہ کا نقشِ قدم
ذرہ ذرہ اُس زمیں کا آسماں پیدا کرے
کارفرما اس کی ہمّت ہو تو قلبِ سوختہ
اپنی مشتِ خاک سے اپنا جہاں پیدا کرے
ابرِ رحمت بن کے برسے آرزو کی کشت پر
حسرتوں کی آگ دل میں وہ دھُواں پیدا کرے

از حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مصنفہ خاں کابلی ——— لاہور ۱۹۶۴ء

راحت شریفی امرتسری

جہ منبرِ احرار پر ہے تو درخشاں آفتاب

تیری تقریروں نے پیدا کر دیا ہے انقلاب

قوم کی خاطر تجھے منظور ہے تختہ دار

ہند میں پیدا نہ ہو گا حشر تک تیرا جواب

از سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مصنف خان کابلی لاہور ۱۹۴۰ء

قطعات تاریخ

[illegible]ات المعلقة

احسان دانش

۱. علامہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
۱۳۸۱ھ

۲. شمع محفل بخاریؒ
۱۳۸۱ھ

۳. امیر شریعت والا نسب
۱۳۸۱ھ

۴. بخاری قوی امیر شریعت
۱۳۸۱ھ

۵. شیفتہ بخاری
۱۳۸۱ھ

بزم جہاں میں سب ہیں لیکن نہیں بخاری
عالم کو کر گیا ہے اندوہ گیں بخاری

پیدا نہ ہوگا کوئی ایسا خطیب دانش
ایوانِ خلد میں ہے محفل نشیں بخاریؒ
۱۳۸۱ھ

علامہ طالوت

سلام اے امیرِ شریعت سلام
سلامِ کرامت ہے خیرا لختام
امیرِ شریعت تھے جیسے کہ آپ
کلام آپ کا تھا امیرا لکلام
رہا عمر بھر دین سے انہماک
رہا عمر بھر دین سے انضمام
ودیعت ہُوا سول کو عشقِ رسول
زباں کو ملا نازِ حُسنِ کلام
مراتب بڑھائے خدا آپ کے
ملے خُلد میں سب سے اعلیٰ مقام

مجھے فکرِ تاریخ تھی رات جب
تو قدرت نے یوں کر دیا اہتمام
کہا مجھ کو ہاتف نے سالِ وفات
سلام اے کلیم شریعت سلام

۲۸ + ۱۳۵۳ھ = ۱۳۸۱ھ

خلیق قریشی

شمعے کہ مدتے بہ جہاں نور می فشاند

آں شمعِ نور پاش ز دستِ قضا فسُرد

درد آشنا مجاہد، و شیوا بیاں خطیب

فردِ عمل بہ ناز حضورِ خدا ببرد

تاریخِ انتقالِ بخاری بگو خلیق

گویند "آہ بلبلِ باغِ نبیؐ ببرد"

۱۳۸۱ ہجری

نذیرِ مجیدی

بزمِ وطن ہے درہم برہم — ارض و سما میں برپا ماتم
موت العالِم، موت العالَم — رنج سراپا، حزنِ مسلّم
آج فضا بے کیف ہے کلام — آج نہیں پہلا سا دم خم
آج طبیعت ہے افسردہ — کیسا نغمہ؟ کیسا ترنم؟
چشمِ فلک نے کس کو تاکا؟ — کس کا دیا ہے آج ہمیں غم؟
تیرِ قضا نے سونپ دیا ہے — نالۂ پُرغم، گریہ پیہم
رو رو کر اب یاد کریں گے — ان کا تخاطب، ان کا تکلّم
ان کی بات نبات کی ڈلیاں — اُن کے قہقہے، اُن کا تبسّم
یُوں تاریخ مجیدی کہدو — سکتہ سا ہے طاری تا ہم

رحلتِ سیّد وشیرِ مجسّم

۱۳۸۱ھ

تا سیدِ افضلِ دین مکرّم

۱۳۸۱ھ

انور صابری
دیوبندی

سالارِ کاروانِ جہانِ وفا گیا
سوئے ریاضِ خُلد بخاری چلا گیا

ہر آنکھ میں ہیں اشک ہر لب پہ آہ سرد
اربابِ درد عشق کا درد آشنا گیا

پہنچا جہاں فضا میں لطافت بکھیر دی
گذرا جہاں سے نقشِ قدم چھوڑتا گیا

روحِ ابوالکلام کا آئینہ دارِ فکر
چشم و چراغِ محفلِ مشکل کشا گیا

تصویرِ خلق، پیکرِ اخلاصِ زندگی
سرتاپا نمونۂ صبر و رضا گیا

الفاظ کے مزاج معانی کا رازداں
جمہور کے دلوں میں اتنا بڑا گیا
آزادیٔ وطن کا جواں عزم رہنما
آزادیٔ وطن کے ستم جھیلتا گیا
سالِ وفات کیلئے انور جو عرش تک
وابستۂ جنوں مرا فکر رسا گیا
آئی ندائے غیب کہیں کیشو آپ ہائے
باغِ وطن کا بلبل آتش نوا گیا

۱۹۴۲ + ۱۹ = ۱۹۶۱ء

نصرت قریشی

رخصت ہوئے دنیا سے بخاریؒ کے جلو میں
اندازِ بیاں، سحرِ بیاں، لذتِ گفتار

نصرت! پئے تاریخ یہ ہاتف نے ندا دی
اب ختم ہوئی رونقِ ہنگامۂ احرار

۱۹۶۱ء

غلام نبی حکیم

کھویا نہ وقت شاہ نے کارِ فضول میں
کوشاں رہا خدا کی رضا کے حصول میں

جس کے اثر سے شاہ بخاری تھا شعلہ دم
وہ کیفیت ہے بادۂ عشقِ رسولؐ میں

تبلیغِ دیں کے واسطے سیّد تھا سربکف
خوئے رسولؐ ہوتی ہے آلِ رسولؐ میں

اس دم "وہ شاہ خلد میں محوِ خرام ہے"
۱۹۶۱
آواز آ رہی ہے یہ گوشِ قبول میں

وہ شمع ضو فگن ہے "بہشت بریں میں اب

۱۲ ھ ۸۱

اجلاس ہو رہے ہیں وہاں عرض و طول میں

سن کر ظفر علی نے کلام اس کا "یہ کہا

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں"

۱۹ ء ۶۱

ذکرِ حبیب باعثِ تسکیں ہے اے حکیمؔ　　ہر چند اضطراب ہو قلبِ طپاں میں

عربی، پنجابی، اُردو

نظمیں

(جو حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر لکھی گئیں)

محمد احسان الحق ایڈمنسٹریٹو سول جج گوجرانوالہ

امیر شریعتؒ

اَمِیْرُ شَرِیْعَۃٍ مَلِکُ الْبَیَانِ

(امیر شریعت رئیسِ خطابت کو)

لَہٗ فِیْ جَنَّۃٍ اَعْلَی الْمَکَانِ

(جنّت میں بلند درجات نصیب ہوں)

فَمَاتَ وَلَمْ تَمُتْ نَغَمَاتُ صَوْتٍ

(وہ فوت ہو گئے مگر

لِمَا یَتْلُوْا مِنَ السَّبْعِ الْمَثَانِیْ

ان کی تلاوتِ قرآن کی آواز زندہ ہے)

وَقَدْ رَجَعَ الْعَطَاءُ اِلَی الْاِلٰہٖ

(اللہ کی عطا اللہ کی طرف لوٹ گئی

ھُوَ الْقَیُّوْمُ وَالْمَخْلُوْقُ فَانِیْ

وہ ہمیشہ سے قائم ہے اور مخلوق فانی)

پتھر دلاں نوں موم بناوندا سی

بڑا ہر رج پہنچاوندی قوم تائیں ! — دردمند عالم غمخوار دی موت
دل لکھاں سپاہیاں دا ٹوٹ دیوے — ہو جاوے جد سپہ سالار دی موت
جدوں موت آئے سچے رہبراں نوں — تدوں ہوندی اے لکھ ہزار دی موت
یاد رہے سانوں کدی بھلنی نئیں — بارو سید بخاری سردار دی موت

جہڑے قوم توں جان قربان کر دے — گھٹ ہوندے او سردار سید
اج موت نے آن کے چھڈیا نہ — ہے سی مدتاں دا بیمار سید
سچی گل سنائے نڈر ہو کے — گیا جیل اندر کئی وار سید
دلوں بُرا غلامی نوں جاندا سی — تر گیا اوہ آج احرار سید

لکھاں رحمتاں تیرے نصیب ہوون — ہووے جنت دے وچ مکان تیرا

بخش دیوے گا رب کریم تینوں ہے سی بڑا مضبوط ایمان تیرا
پتھر دلاں نوں موم بناؤندا سی سچا خلق تے سوہنا بیان تیرا
قرآن دے نال سی پیار تینوں بھلا کرے گا رب رحمان تیرا

عبدالحمید عدم

اخوّت کا پیکر، لگن کا ضمیر

امیرِ شریعت، قلندر، فقیر
اخوّت کا پیکر، لگن کا ضمیر

خطابت کی اقلیم کا شہریار
ندیمِ محبت، نقیبِ بہار

سخن جس طرح آبِ کوثر کی دھار
چلن جس طرح لہجۂ آبشار

طبیعت میں موجِ صبا کا خرام
ارادوں میں خیریت صبح و شام

مشیت کی شائستگی کا جمال!
ہمہ کیف و برکت، ہمہ کیف و حال

ہدایاتِ سادہ کا دلکش نصاب
علومِ درخشاں کا بہتا چناب

تبسّم سے تسخیر کرتا ہُوا!
نگاہوں سے تسخیر کرتا ہُوا

حقیقی مربّی، حقیقی رفیق
ملے گا کہاں ایسا مردِ عمیق

ادا کر کے قرض اپنی خدمات کا
سحر دم، وہ جاگا ہُوا رات کا

اَبد کے نگر کو روانہ ہُوا
مکمّل سفر کا فسانہ ہُوا

سید عبدالحمید عدمؔ

محمدؐ کی سیرت کا پیغامبر

(رئیس الاحرار حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے عارضی سکوت پر)

اخوّت کے پرچم اڑاتا ہوا — محبت کے نغمے سناتا ہوا
گرجتا ہوا، دندناتا ہوا — مگر دمبدم مسکراتا ہوا
صداقت کے چہرے سے بیساختہ — توہّم کے پردے اٹھاتا ہوا
خدا کی محبت کے عرفان سے — چمکتا ہوا، جگمگاتا ہوا
مخالف ہواؤں کی یلغار پر — عزائم کے خنجر چلاتا ہوا
ضمیرِ منوّر کی تلوار سے — رگیں شرک کی کاٹ جاتا ہوا
محمدؐ کی سیرت کا پیغام بر — خدا کے سندیسے سناتا ہوا
جیالوں کا عاشق سپاہی کی ہٹھ — حمیّت کے جوہر دکھاتا ہوا
بڑی منزلیں کر کے طے علم کی — بڑی دیر چلتا چلاتا ہوا
نہایت اہم سوچ میں کھو گیا — گھڑی دو گھڑی کے لئے سو گیا

اگرچہ وہ مصروف ہے خواب میں — حسیں ولولے اس کے بیدار ہیں

صبا اس کے اخلاق کا گیت ہے　　ریاض و چمن اس کا اطوار ہیں
ہیں لوحِ ابد پر جو لکھے ہوئے　　وہ اس کی ریاضت کے اشعار ہیں
بقا اس کی مرغوب پوشاک ہے
خدا اس کی تحقیق ادراک ہے

صُوفی تبسّم

چوں نشتری بسینۂ ملت خلید و رفت

برق اندرونِ سینۂ ہستی دمید و رفت
طوفانِ شعلہ در رگِ دوران جہید و رفت

چوں خنجری بقلبِ عزیزاں فرو نشست
چوں نشتری بسینۂ ملّت خلید و رفت

چوں داغ درد در دل حسرت نشست و خاست
چوں اشکِ غم ز دیدۂ حرماں چکید و رفت

دیوانہ بود و شیوۂ دیوانگی نمود!
افسانہ گشت و بر لبِ دنیا رسید و رفت

صد قصّہ ہائے دردِ و الم گفت و شد خموش
آشفتہ حالیٔ دلِ یاراں ندید و رفت

شہباز ما پرید و رہ آسماں گرفت!
مرغی نہ رفتہ است کہ دیگر تو آں گرفت

رُو تافتہ ز عالمِ امکاں چگونہ ای
ای رہسپارِ روضۂ رضواں چگونہ ای

صد حشر آفریدہ بمحفل نوای تو!
برقِ تپاں و رعدِ غریواں چگونہ ای

یکدم نبود قلبِ ترا فرصتِ قرار
آسودہ درمیانِ خموشاں چگونہ ای

خفتی بخاک و طالعِ یارانِ تو بخفت   ای بختِ ما بخوابِ پریشاں چگونہ ای
آبِ تشنگی نزد و خونِ آشامی ولت   تا خوردہ آبِ چشمۂ حیواں چگونہ ای

چوں سر بسر رضائے خدا بود کارِ تو
خود میکشید رحمتِ حق انتظارِ تو

احسان دانش

وہ اپنے وقت کا خود نوحہ خواں ہے

بخاری ہے زمینِ ملتان ہے
الٰہی کیسا انساں اور کہاں ہے

یہ خستہ گھر، یہ گرمی اور یہ خلوت
گلے پر سانس کا آرا رواں ہے

کہے اب وقت کیا اس کا فسانہ
وہ اپنے وقت کا خود نوحہ خواں ہے

گزرتی جارہی ہے مشکل زیست
یہ شاید آخری اک امتحاں ہے

کبھی تھا کارواں اس کا فدائی
اور اب تنہا یہ میر کارواں ہے

گلا بیٹھا ہوا آواز کیا دے
نہ جانے مرقدِ ماضی کہاں ہے

کہاں اب آگیا یارب زمانہ
کہ عنقا اعتماد دوستاں ہے

یہ عالم پیشوائے علم و دیں کا
لب اہل نظر پر الاماں ہے

کریں دنیا کو مجبور وفا کیا
کہ یہ دولت نصیب دشمناں ہے

مآلِ رہنمائی اللہ اللہ
نہ منزل ہے نہ گرد کارواں ہے

یہ دنیا اب ہے ظلمت کی پرستار — کسی کو کیا خبر سورج کہاں ہے
نہ الفت ہے، نہ غیرت ہے، نہ ایماں — مسلماں کب یہاں تھا اب جہاں ہے
خیال و خواب ہے حفظ روایات — نظر سے تا افق دل کا دھواں ہے
خداوندا عطا عزم ہمہ گیر! — گنہ گاروں پہ اتمام کرم کر!

القصہ ایک عہدِ صحابہ کی یادگار

(شورش کاشمیری)

اچھا ہوا کہ آپ بھی ہم سے بچھڑ گئے
ورنہ امید و یاس کا قصہ دراز تھا

تھے لوگ بے حسی کے سمندر میں غوطہ زن
اور اس پہ یہ ستم کہ خدا بے نیاز تھا

تیری زباں کے پھول تھے ندرہائے تابدار
تیرے بیاں پہ فنِ خطابت کو ناز تھا

تیرے دل و دماغ تھے قدرت کا معجزہ
سینہ ترا مدینۂ سوز و گداز تھا

ہر مرحلے میں صبر و تشدد کا سامنا
ہر معرکہ میں فضلِ خدا کارساز تھا

القصہ ایک عہدِ صحابہ کی یادگار
جس کا وجود نغمہ طرازِ حجاز تھا

شورش وہ آج عازمِ فردوس ہو گیا
دار و رسن کے خوف سے وہ بے نیاز تھا

اے وائے! داستانِ وفا ختم ہو گئی

صرصر کی چوٹ کھا کے صبا ختم ہو گئی

جو کچھ ہوا، درست ہوا، خوب تر ہوا!
نوکِ قلم پہ آہ و فغاں آ گئی تو کیا؟

بوہم بنا ہے نقشۂ عالم اس طرح — آندھی اُفق سے تا بہ اُفق چھا گئی تو کیا؟
نالہ بلب ہیں نغمہ سرایانِ فصلِ گل، — لُٹے چمن کو بادِ خزاں کھا گئی تو کیا؟
وہ لوگ جو قفس ہی میں بیٹھے ہیں تمام عمر — اُن کے چمن پہ برق ستم ڈھا گئی تو کیا؟
جن کا وجود تھی جہاں تاب کا جواب — اک مرگِ ناگہاں انہیں تڑپا گئی تو کیا؟
کوثر پہ آملیں گے حریفانِ بادہ نوش — اے مرگ شکریہ تیرا تو آ گئی تو کیا؟

"لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے"

دل انقلابِ حال سے نالاں ہے دوستو — شیرازۂ حیات پریشاں ہے دوستو
ناسازگار آب و ہوا ہے کہاں چلیں — صرصر کی زد میں نظمِ گلستاں ہے دوستو
جو کچھ سلوک ہم سے چمن میں کیا گیا — تاریخ اس پہ ششدر و حیراں ہے دوستو
اپنے لہو سے لالہ و گل کو نکھار دو — یہ بھی علاج گردشِ دوراں ہے دوستو
کچھ دوستوں کے غم ہیں کچھ ساتھیوں کی یاد — اس پہ مدارِ دیدۂ گریاں ہے دوستو
آخر کہاں چلا گیا سالارِ کارواں؟ — کس سے کہیں کہ حشر کا ساماں ہے دوستو
اک بند ٹوٹی ہے زندگی مستعار پر — اور سچ کہوں تو موت کا احساں ہے دوستو

چکمہ دیا اجل نے غریب اللہ یار کو
لوٹا ہے فصلِ گل میں خزاں نے بہار کو

۱۲ اگست ۶۱ء

اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے

دل درد میں ڈوبا ہے زباں نوحہ کناں ہے
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں، بخاری تُو کہاں ہے

اے خطۂ فردوس کے راہی تو پلٹ آ
رحلت پہ تری غلغلۂ آہ و فغاں ہے

آواز تو دے خانہ خرابانِ وفا کو
اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے

کس حال میں ہیں پیش رسانِ عدم آباد
معلوم تو ہو گا تجھے اب کون کہاں ہے؟

ہیں لونگِ زباں قاسم و محمود کی باتیں
ان میں بھی کبھی تذکرۂ ہم نفساں ہے؟

ہم نے تو جلائے ہیں چراغ اپنے لہو سے
لیکن یہ جہاں کارگہ شیشہ گراں ہے
یہ کون اٹھا محفلِ ہستی سے عزیزو؟
خورشیدِ جہاں تاب بھی خونابہ فشاں ہے
"جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا کوئی اور نشاں ہے
اس عقدۂ پرپیچ پہ مغموم ہوں شورش
کیا چیز یہاں کشمکشِ عمرِ رواں ہے

آج بھی روحِ بخاری یہ صدا دیتی ہے

فاش ہیں مجھ پہ کئی سال سے اسرارِ دروں
سوچتا ہوں کہ سرِ عام کیوں نہ کہوں
کوئی ہنگامہ بہ عنوانِ وفا ہو جائے
کوئی تحریک اُبھر آئے بہ عنوانِ جنوں
کیا ضروری ہے کہ ہم بستۂ زنجیر رہیں
دن وہ آتا ہے کہ ٹوٹے گا شبِ غم کا فسوں
رات نے گاڑ کے خورشید کے سینے میں سناں
جگمگاتے ہوئے تاروں کا اجاڑا ہے سکوں
وہ ذرا پردۂ تاریخ سے باہر آئیں
جن کی یلغار سے عشاق ہوئے خوار و زبوں

جن کے پنجے اٹھے دامنِ گل و لالہ پر
جن کی گردن پہ ہے قربانی و ایثار کا خوں

ہم نے جو کچھ بھی کیا اس کا خلاصہ یہ ہے
توڑ ڈالے ہیں فرنگی کی سیاست کے ستوں

تم نے جو کچھ بھی کیا سامنے لے کر نکلو!
ہاں! وہ افسانۂ شب تاب ذرا میں بھی سنوں

آج بھی روحِ سنجاری یہ صدا دیتی ہے
"تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد"

لطیف انور

وہ آنچ جس سے محبت نمو پاتی ہے!

بہار باغ سے جائے نہ اس ہوس میں رہے — ہم آشیانے میں ہوتے ہوئے قفس میں رہے

کچھ اور فیصلہ کر لے نہ دل کی بے تابی — خدا کرے کہ تری یاد میرے بس میں رہے

کہاں کہاں نہ رہے کاروانِ عمر رواں — اگر شریک نہ تیری صدا جرس میں رہے

وہ آنچ جس سے محبت نمو پاتی ہے — دعا کرو کہ مرے سوزِ نیم رس میں رہے

نمودِ برق سے گلشن کا حسن بڑھ جائے — کچھ ایسی بات بھی ترتیبِ خار و خس میں رہے

ترا کرم ہی سہی، انتزاعِ دل ہی سہی — کوئی سکون کا پہلو تو دسترس میں رہے

مآلِ ربطِ تمنا نہ کھل سکا انورؔ
قفس چمن میں رہا اور ہم قفس میں رہے

علامہ لطیف انور

جیسے ملتا رہا الزام، دل کی بے قراری کا

وہ عالم کون بھولے گا عطا اللہ بخاریؒ کا
کہ اُس کا ہر نفس پیغام تھا بادِ بہاری کا

وہ خوش گفتار تھا، وہ حق بیں تھا، وہ حق پر جان دیتا تھا
ادا اُس نے کیا حق، دینِ حق پر جاں نثاری کا

قدم لیتی رہی خود بڑھ کے تاثیرِ زباں اُس کے
اُسے معلوم تھا ہر راز دل کی کامگاری کا

کبھی بددل نہ اس کو کر سکی زنداں کی تنہائی
ہزاروں بار آیا مرحلہ اختر شماری کا

ہراساں کر سکی اس کو نہ باطل کی ستم رانی
اسے خدشہ نہ تھا انگریز کی ناسازگاری کا

فروغِ زیست تھا وہ شعلۂ بیتاب سینے میں
جسے ملتا رہا الزام، دل کی بے قراری کا

مشائخِ ملک و ملت موت کے پنجے میں جا پہنچے
کسی جانب سے کیوں اظہار ہو اب شرمساری کا

نہ روکے تلخیٔ عمرِ رواں میرے تکلم کو !!
کہ میں نوحہ کروں گا وقت کی غفلت شعاری کا

بنائے میکدہ در دل، تہی ساغر بکف انورؔ
زمانہ پائے گا انداز اُس بادہ خواری کا

سید عبدالمنان شاھد

ماتم کناں ہے عشق بخاری نہیں رہا

اک پیکرِ وفا و محبت چلا گیا
اک آشنائے سرِ حقیقت چلا گیا
وا حسرتا! امیرِ شریعت چلا گیا
وہ نگہ دارِ ختمِ نبوّت چلا گیا

نغمہ سرا بہ صوتِ ہزاری نہیں رہا
ماتم کناں ہے عشق بخاری نہیں رہا

وہ رندِ پاکباز و خطیبِ سخن طراز
وہ مردِ با اصول، وہ درویشِ بے نیاز
وہ غمگسارِ قوم، وہ ملّت کا چارہ ساز
وہ دوستوں کا دوست، وہ مخلص، وہ دلنواز

آئینہ دارِ عظمتِ اولادِ بوترابؓ
ہر وصف بے نظیر ہر اک بات لاجواب

غیور و خوش نہاد و خوش اسلوب و ارجمند
سرزادۂ سرفروش و سرافراز و سربلند
حق گو و حق شناس و حق اندیش و حق پسند
دائم رہا طریقِ عزیمت پہ کاربند

اُس کی رگوں میں عشقِ پیمبر تھا موجزن
اسکے لبوں پہ صدقِ ابوذرؓ تھا ضوفگن

ملت کو اُس نے عزم و عمل کا دیا سبق
اسکی کتابِ زیست کا روشن ہے ہر ورق
اُس کی نوا تھی بانگِ جرسِ کاروانِ حق
باطل کا جس سے رنگ ہوا زرد چہرہ فق

عشقِ نبیؐ کی جوت جگاتا چلا گیا
طاغوتیت کا نقش مٹاتا چلا گیا

آتش نفس خطیب و سپہر صفت زعیم
اوصاف میں حمید تو اخلاق میں عظیم

ذوقِ نظر بلند، مذاقِ سخن سلیم
ہیبت سے اسکی سطوتِ افرنگ ہے دو نیم
رشکِ شہنشہاں تھی فقیری میں اس کی ذات
ملتے کہاں ہیں دہر میں اب ایسے خوش صفات

دل کا ہر ایک زخم نمایاں کئے ہوئے
آنکھوں میں دردِ عشق فروزاں کئے ہوئے
نطقِ حسیں کو حشر بداماں کئے ہوئے
حبِّ نبیؐ کو حرزِ دل و جاں کئے ہوئے
باطل کو ہر محاذ پہ ناکام کر گیا
اسلام کا جہاں میں بڑا نام کر گیا

فرشِ زمیں کی بات نہیں عرش ہل گیا
محفل سے جب وہ اہلِ نظر اہلِ دل گیا
پیکِ اجل بھی موت پہ اس کی مچل گیا
یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
وہ گفتگو کا فن، وہ سخن، وہ دہن کہاں

بدباطنوں کی ہے یہ عبث آرزوئے خام
ہوگا نہ کم دلوں میں بخاری کا احترام
اعدائے دینِ حق علی الرغم اس کا نام
چمکے گا آفتاب کی مانند صبح و شام

مانندِ نکہتِ گلِ تر پھیل جائے گا
دنیا میں اس کا نام سدا جگمگائے گا

صہبائے عشقِ جنتِ رضواں بہ جامِ اُو
گنجینۂ سعادتِ دوراں بہ کامِ اُو
برج العروجِ ہمتِ کیواں مقامِ اُو
ثبت است بر جریدۂ گیہاں دوامِ اُو

"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق"
پائندہ باد نامِ بخاری بہ فیضِ عشق

حبیب جالب

تجھ سے پہلے عام کہاں تھی، دار و رسن کی بات

ایک طرف توپوں کے دہانے ایک طرف تقریر
زنداں میں بھی ساتھ رہی، آزادی کی تو تصویر
خوشبو بن کر پھیلی تیرے خوابوں کی تعبیر
ٹوٹ گئی زنجیر

تجھ سے پہلے عام کہاں تھی دار و رسن کی بات
چاروں طرف چھائی ہوئی تھی محکومی کی رات
اپنے بھی تھے ظلم پہ مائل بیگانوں کے سات
آگے بڑھ کر تو نے بدل دی ہم سب کی تقدیر
ٹوٹ گئی زنجیر

گلی گلی میں تیرے چرچے، نگر نگر کہرام
جیالے کے میٹھی بولی تو نے کیا تھا جگ کو رام
جب تک قائم ہے یہ دنیا رہیگا تیرا نام

کون مٹا سکتا ہے تیری عظمت کی تحریر

ٹوٹ گئی زنجیر

ہنسی ہنسی میں تو نے کھولے اہلِ ستم کے راز
مرتے دم تک تو نے اٹھائے سچائی کے ناز
کہیں دبائے سے دبتی ہے شعلہ صفت آواز
چیر گئی ظلمت کا سینہ لفظوں کی شمشیر

ٹوٹ گئی زنجیر

تیرے خوشہ چیں ہوتے ہیں آج بڑے دھنوان
تو نے اپنی آن نہ بیچی کیسی تیری شان
بات پہ اپنی جو مٹ جائے وہی ہے بس انسان
شاہ تجھے کہتی ہے دنیا، تو تھا ایک فقیر

ٹوٹ گئی زنجیر

رشید کامل

کجلا گیا ماحول کا مہتاب بہاراں

ناگاہ یہ کس نے خبرِ مرگ سنائی — سینے میں دھواں بن گیا سرمایۂ افکار

بے ساختہ آنکھوں سے ٹپکنے لگے آنسو — اور روح ہوئی صدمۂ جانکاہ سے افگار

گریاں ہے تری مرگ پہ اک عالمِ اسلام — اس رنج پہ دل خستہ ہیں چند کہ دوچار

محسوس ہوا چھن گئی ہم سے بڑی دولت — اجڑا ہے کچھ اس رنگ سے تہذیب کا دربار

کجلا گیا ماحول کا مہتاب بہاراں — ویران ہوا علم و فضیلت کا چمن زار

ہاں لٹ گیا گہوارۂ تقریر و خطابت — ہاں بجھ گیا اک مہرِ درخشندہ و ضو بار

تقریر تھی تیری کہ حریفانِ دغا پر — میدانِ وغا میں کوئی چلتی ہوئی تلوار

ٹھہری نہ ترے سامنے باطل کی حقیقت — ٹوٹا ہے تدبر سے ترے کفر کا پندار

تقریر تھی تیری کہ محبانِ وطن کو — اک جوش تھا اک ولولۂ تازہ و بیدار

چھیڑا کبھی توحید کا نغمہ سرِ منبر — گرجا ہے کبھی حق کی حمایت میں سرِ دار

برسائی کبھی آگ کبھی پھول بکھیرے | لب بستہ مگر آج ہے وہ نطقِ فسوں کار
اک عرصہ اٹھائے ہیں دل و جاں پہ مصائب | اک عمر فسردگی سے رہا برسرِ پیکار
رقصاں تھی لہو میں ترے ایماں کی حرارت | تھے بادۂ عرفاں سے دل و جاں ترے سرشار

تب ایسے مقاموں سے بھی گزرا ہے جنوں میں | دیوار کہیں بھی نہ کوئی سایۂ دیوار
سینے میں منوّر تھی ترے شمعِ محبت | ہستی تھی تری تجسیمِ مروت کرم آثار
آئینۂ کردار تھے پاکیزہ خیالات | پاکیزہ خیالات تھے آئینۂ کردار
یہ سب ترے عادات و خصائل کا اثر تھا | احباب ثنا خواں ترے دشمن تھے پرستار
اس بات کی شاہد تری خندہ جبینی | آساں تھی ترے عزم کو ہر منزلِ دشوار
پہلو میں دھڑکتا تھا ترے درد بھرا دل | تھا عاجز و مجبور کا تو ہمدم و غم خوار
انساں کو انساں سمجھنا ہے بڑی بات | یہ بات سمجھتے ہیں کہاں خود رو و بدکار

دم لینے نہیں دیتی مگر گردشِ دوراں
صد حیف کہ ہے تیز بہت وقت کی رفتار

اٹھتی ہیں جو بھیگی ہوئی آنکھیں کسی جانب | آتے ہیں نظر روتے ہوئے کوچہ و بازار
ہر گوشۂ گیتی پہ سکوت سا ہے طاری | افسردہ ترے غم میں ہیں بام و در و دیوار
تاریخ میں ایسا نہ خطیب اور اٹھے گا | فطرت نے تراشا تھا فقط ایک ہی شہکار

اس پختہ حقیقت سے مگر کس کو مفر ہے
محفوظ نہیں دامِ اجل سے کوئی جاندار
ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ ہو، ولی ہو کہ پیمبر
اس رہ سے گزرنا ہے ہر اک شخص کو اکبار

دل دکھتا ہے لیکن تری رحلت کی خبر پر
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہے زندہ و بیدار

کچھ آہوں میں شامل ہے، کچھ اشکوں میں ہے ماتم
ہوتا نہیں الفاظ میں جذبات کا اظہار

آباد رہے گوشۂ فردوس میں تا حشر
اور سایہ فگن تجھ پہ رہے رحمتِ غفار

شیر افضل جعفری

اُس کا جنون دانش کا بدل

اُس کی تقریریں حلِ مشکل — اُس کی سیاست مستقبل
اُس کی محفل باغ و بہار — اُس کی ہر اک بات غزل
اُس کی خرد کشمیر سرود — اُس کا جنون دانش کا بدل
اُس کی مست نگہ کے حضور — رقص میں آتے تھے بادل
اُس کا ارادہ کوہ شکوہ — اُس کا چلن کردار اٹل
اُس کا جنوں خانہ بدوش — اُس کا مسکن تاج محل
وہ جرأت کا جیت گلاب — اُس کا محور خیر افق
اُس کی زباں قرآن ترانہ — اُس کے گلے میں لالۂ لال

اُس کی لحد پر پھول نثار
رحمت کا رنگیں آنچل

پرنسپل اصغر ہمدانی ایم۔ اے

تخلیق کے ماتھے کا چمکتا ہوا غازہ

تھا زندہ و پائندہ و تابندہ و بیدار
وہ مردِ جری شیرِ خدا صاحبِ اسرار

تخلیق کے ماتھے کا چمکتا ہوا غازہ
تعمیر کے چہرے کا دمکتا ہوا نکھار

آئینہ اخلاص و وفا جس کی نگاہیں
جو وقت پہ ہوتیں خارا شگافی کو بھی تیار

ہونٹوں کے نواؤں میں براہیم کا اعلان
ہاتھوں کا عصا ضربِ کلیمی کا نشاندار

بُت خانہ افرنگ میں اک مردِ حق آگاہ
تھا عظمتِ کعبہ کا نگہبان و نگہدار

اسلام کی صف ہو تو ہر اک درد کا درماں
کفار کا لشکر ہو تو بپھری ہوئی تلوار

وہ شاہ تھا ہاں شاہ قلمروئے بیاں کا
فن اس کی خطابت کا کمالِ لبِ اظہار

تقریر کے ہنگام اُمڈتا ہُوا دریا
تحریر کے دوران صد قلزمِ زخار

یہ حُسنِ بیاں، حُسنِ ادا، حُسنِ تلفظ
جذبات کی تلخی میں بھی شیرینیٔ گفتار

قرآں کی تلاوت میں پیام سحر انگیز
سن لیں تو فرشتوں کی بھی تقدیر ہو بیدار

تفسیر کا موقع ہو تو اللّٰہ غنی علم　　　　گرتی ہی چلی جائے ہر اک کفر کی تلوار

پُر مغز تھا، پُر شوق تھا، پُر شوق سنجاری

وابستۂ توحید تھا دانندۂ اسرار

جانباز مرزا

ایسا جانباز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے؟

ایسا غمخوار مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے
کھو گیا واقفِ قرآن ڈھونڈیں گے

بے خطر آتشِ نمرود میں جو کود پڑے
ایسا ملّت کا نگہبان کہاں ڈھونڈیں گے

فیصلے دل کے نگاہوں سے کئے ہوں جس نے
ایسا درویش مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

جس کی للکار سے لرزاں تھا سگانِ باطل
ختمِ مرسل کا وہ دربان کہاں ڈھونڈیں گے

کل ہمیں سنّتِ یوسفؑ کی ضرورت ہوگی
ہائے وہ واقفِ زندان کہاں ڈھونڈیں گے

جذبۂ موت بھی ہے دار و رسن بھی لیکن
جانِ منصور کی پہچان کہاں ڈھونڈیں گے

سطوتِ شاہ سے مرعوب نہ ہونے والا
کتنا بے باک تھا انسان کہاں ڈھونڈیں گے

پاسباں ملک کا اور شریعت کا امیر
ایسا جانباز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

کون ٹوکے گا ترے بعد جہانبانوں کو

(جانباز مرزا)

آج ہم واقفِ اسرار گنوا بیٹھے ہیں
آج ہم دولتِ احرار گنوا بیٹھے ہیں

آج وہ ختمِ نبوّت کا نگہدار گیا
دل کے بازار سے اُلفت کا خریدار گیا

روشنی ماند ہوئی اپنا ستارہ ڈوبا
جس کنارے پہ تھے ہم وہی کنارہ ڈوبا

کارواں روئے گا منزل کا نشاں ڈھونڈیگا
تجھ کو چاہے گا مگر تجھ کو کہاں ڈھونڈیگا

چاہنے والوں سے یُوں روٹھ کے چلنے والے
شاخِ اُمید سے یُوں ٹوٹ کے جانیوالے

زندگی تیری ترے بعد بھی باقی ہوگی
اپنی ہر حرکت پہ قضا دیکھنا شاکی ہوگی

کون قرآن سنائے گا مسلمانوں کو!
کون ٹوکے گا ترے بعد جہانبانوں کو

آنکھ روئے گی، جگر روئیگا دل روئے گا
اپنے جانباز پہ ہر آنکھ کا تل روئے گا.

خلیق قریشی

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے

جس نے کیے ہیں تاجوروں سے مقابلے
درویش جس نے جیتے ہیں شاہوں سے معرکے

سحر آفریں خطیب اثر آفریں خطاب
اِک موج ہے کہ شعلہ! اُسے کوئی کیا کہے

جھڑتے ہیں جب کہ جلوت و خلوت میں منہ سے پھول
شیریں ہے جس کا ہر کلمہ شہد و شیر سے

ہر نکتے میں فسونِ فصاحت کی انتہا
ہر بات میں حروف نگینے جڑے ہوئے

الفاظ میں ہے صورِ سرافیل کا خروش
اسلوب میں ہیں جوشِ شہادت کے ولولے

اقلیم پاک و ہند کا سرمایۂ غرور
اس مردِ باخدا کے عجب ہیں معاملے

ہر دوست کیلئے ہیں اس کے جان و دل
اک تیر بے اماں ہے وہ دشمن کیواسطے

افرنگ کی نگاہ میں کانٹا بنا رہا -
جس کی ہر ایک سانس سے صدہا چمن کھلے

صبحِ شباب، شام شبِ حیات
ٹکڑے ہیں اک جہادِ مسلسل کے دیکھئے

قرآن کے معارف و انوار کا بیاں
خوش بخت ہے جو اس کی زباں سے کوئی سنے

صورت گری و بہزاد خوب تھی لیکن ہے گرد نطق بخاری کے سامنے

تقریر میں وہ حسن، بیاں میں وہ بانکپن ؛
کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے

عبدالکریم ثمر

تجھے نسبتِ خصوصی تھی نبیؐ کے آستاں سے

کبھی پستیوں میں چمکا تو فرازِ آسماں سے — کبھی رفعتوں سے الجھا تو نشیب کارواں سے
جو مٹے گا دینِ حق پر وہی رہ سکے گا زندہ — یہ سبق ملا ہے مجھ کو تری مرگِ ناگہاں سے
تھکے ہارے قافلے نے تجھے خضرِ وقت جانا — تو چلا ہمیشہ ہٹ کر رہ و رسمِ کارواں سے
گلِ سرمدی بکھیرے تیرے خامہ و زباں نے — تو خراج لے رہا ہے ابھی خامہ و زباں سے
یہ خلوص یہ عقیدت یہ حضورؐ سے محبت — تجھے نسبتِ خصوصی تھی نبیؐ کے آستاں سے
تری آہ صبح گاہی، ترا نالۂ شبانہ — یہی یاد رہ گیا ہے شبِ غم کی داستاں سے
ترا ذوقِ حق پسندی تجھے لے گیا رسن تک — بنے خار بھی گلستاں تیرے شوقِ بیکراں سے
تری بے غرض قیادت ترا علم اور خطابت — تری داستاں کو چھیڑیں مگر اب کہاں کہاں سے

عاصی کرنالی

مقامِ مردِ قلندر ورائے افلاک است

(شاہ جی کی زندگی میں یہ اشعار بعقیدت خود شاعر نے اُن کے حضور عرض کیے)

زبانِ فیض بیانش فقط رگِ تاک است
چکیدہ اش مئے ناب است گوہرِ پاک است

چو لب کشا بہ تلاوت شود، دلم گوید
کہ عندلیبِ گلستانِ شاہِ لولاک است

بیا بہ اُو، اگرت زہرِ کفر روزی شُد
چو گفت گو بکند حرف حرف تریاک است

بہ خاک اگرچہ نشیند، بر خاکیان سازد
مقامِ مردِ قلندر ورائے افلاک است

جنونِ او کہ بہ ارض و سمائی گنجد
تعارفے ز مقامش بہ عجز ادراک است

بہ فصلِ لالہ چہ حال است مردِ عارف را
کہ زیبِ غنچہ، ولے دامنِ دلش چاک است

سلام شوق به دیوانهٔ که در مستی
نفس کشید و گریبان زندگی چاک است

نگه فسون و ادا سحر و گفت گو اعجاز
ز دین و دل ببریدیم که فتنه چالاک است

غلط روند مریدان و شیخِ ما نادم
خطا ز ما و جبینِ کرم عرق ناک است

صد آفتاب نهادند در دلِ پاکش
اگرچه پیکرِ مومن ز ذرۂ خاک است

خدا نکرده که بادے بدیں چراغ رسد
که ایں تجلیٔ آخر ز نورِ افلاک است

بگو به شعلۂ نازے که خیز و در ما گیر
وجودِ اہلِ تمنا تمام خاشاک است

حفیظ تائب

مردِ آزاد الگ اپنا جہاں رکھتا تھا

منفرد ذوقِ عمل، زورِ بیاں رکھتا تھا
دلِ پُرسوز، شعلہ فشاں رکھتا تھا

لب پہ توحید کے نغمات رواں رہتے تھے
دل میں عشقِ شہ لولاک نہاں رکھتا تھا

کوئی خواہش نہیں رکھتا تھا بجز خدمتِ دیں
اس تمنا کو بہرحال جواں رکھتا تھا

اٹھ گیا عظمت و تقدیس رسالت کا خطیب
سینۂ شوق میں جو برقِ تپاں رکھتا تھا

روشِ اہلِ جہاں کا وہ نہیں تھا پابند
مردِ آزاد الگ اپنا جہاں رکھتا تھا

اس کے پاؤں میں نہ آئی کبھی لغزش تائبؔ
راہ میں گرچہ کئی سنگِ گراں رکھتا تھا

امین گیلانی

جیسے خورشید کوئی اسکے گریبان میں ہے

جس کے ایمان کی گرمی مرے ایمان میں ہے
اس کو اللہ سلامت رکھے ملتان میں ہے

دیکھ کر اس کا خلوص اسکی محبت اے دوست
تو کہے ہاں ابھی انسانیت انسان میں ہے

اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے حمیّت کا خمار
اس کا دل ڈوبا ہوا نشۂ عرفان میں ہے

کتنی تاریک فضاؤں کو اجالے بخشے
جیسے خورشید کوئی اس کے گریبان میں ہے

اس کو باطل کے مقابل میں ہمیشہ دیکھا
پرچم حق کو سنبھالے ہوئے میدان میں ہے

میرا دعویٰ ہے کہ اس دور میں اُس جیسا خطیب
نہ عرب میں ہے نہ ترکی میں نہ ایران میں ہے

وہ کھویا ہوا لاچار آج ضعیفی کے سبب
ورنہ پھر کشتیِ قوم اک نئے طوفان میں ہے

کم نظر کو نظر آسکتا نہیں اس کا مقام
دیدہ ور کہتے ہیں کہ وہ منزل ایقان میں ہے

سید امین گیلانی

ہم ایک گوہر یکتا گنوا کے بیٹھ گئے

سکون زیست کی دولت لٹا کے بیٹھ گئے
ہم ایک گوہر یکتا گنوا کے بیٹھ گئے

وہ جب سے چہرۂ انور چھپا کے بیٹھ گئے
ہم اپنی پلکوں پہ شمعیں جلا کے بیٹھ گئے

ترس رہی ہیں نگاہیں تمہاری صورت کو
اب آبھی جاؤ کہ سب لوگ آ کے بیٹھ گئے

قریب کر کے محبت سے ایک دنیا کو
عجیب بات ہے خود دور جا کے بیٹھ گئے

وفا شعار تھے تم کیا ہوا خدا کے لئے
کہ اپنے یاروں سے دامن چھڑا کے بیٹھ گئے

ہمارا جی نہیں لگتا کہیں تمہارے بغیر
مگر ہو تم، کہ کہیں جی لگا کے بیٹھ گئے

زمیں پہ پھولوں میں کم ہو گئی تھی بوئے وفا
کہ اب فلک پہ ستاروں میں جا کے بیٹھ گئے
رواں رہے گا یونہی کارواں بہاری کا
عدو نہ سمجھیں کہ ہم دل بجھا کے بیٹھ گئے
تڑپ کے چاک گریباں کریں گے باطل کا
وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم چوٹ کھا کے بیٹھ گئے

انور صابری

کرے گی ناز تجھ پر حشر تک تاریخِ انسانی

خطیبِ اعظمِ اسلام فخرِ بزمِ ایمانی — جمالستانِ عرفاں تھی تری نورِ پیشانی
دلوں کا ذکر کیا روحوں کو گرماتی رہی برسوں — فضاؤں میں ترے الفاظ کے جھرنوں کی تابانی
چراغِ محفلِ ختمِ رسالت بن کے چمکی ہے — تری آنکھوں کے حجروں میں ضیائے شمعِ ربانی
جہادِ حریت میں رہبرانہ شان کے صدقے — کرے گی ناز تجھ پر حشر تک تاریخِ انسانی
محمد کی غلامی تیرا تاجِ زندگانی تھی! — ہمیشہ تو نے ٹھکرایا غرورِ تاجِ سلطانی
وقارِ بوذری تھا تیری درویشی کی رگ رگ میں — فقیرانہ ادا تھی ہم مزاجِ فقرِ سلمانی
تیرے خود دار جذبوں کا مزاجِ عزم ہستی تھا — مکمل تھا کہ تکمیلِ دستورِ جہانبانی
مری مجبوریوں کو دیکھ اے آزاد خو انساں — لحد پر آ نہیں سکتا برائے فاتحہ خوانی
نئی حد بندیاں ہیں اور میری چشمِ گریاں ہے — ہے درس آموزِ دنیا میرے اشکوں کی پریشانی

بہاروں میں بھی میرے دل کا غنچہ کھل نہیں سکتا
تیری راہوں پہ چل سکتا ہوں لیکن چل نہیں سکتا

نذیر احمد خواجہ
لیکچرار اسلامیہ کالج لاہور

ظلم کے آگے ترا سر خم ہوا؟ ہرگز نہیں!

تھی فضا خاموش حرکت میں نہ تھی بادِ صبا
لطمۂ امواج سے خالی تھا دامن بحر کا

ظلمتوں کے جال میں انجم تھے سب رشتہ بہ پا
ایک سناٹے کا عالم گلشنِ ملت پہ تھا

تھے خزاں کی گرد سے سب پھول کملائے ہوئے
باغبانوں کے بھی دل تھے سخت مرجھائے ہوئے

اس طرح اغیار نے لوٹی بہارِ زندگی
نے یقینِ مرگ تھا نے اعتبارِ زندگی

کوئی باقی ہی نہ تھی وجہ قرارِ زندگی
بجھ چلا تھا قلبِ ملت سے شرارِ زندگی

ظلمتِ باطل نے یوں مستور نورِ حق کیا
زمزموں سے عشق کے خاموش طورِ حق کیا
ایک ہنگاموں کی دنیا اپنے دامن میں لئے
آگیا ایسے میں کوئی تیغِ حق عریاں کئے
اُس کی پھونکوں سے چمک اٹھتے تھے ایماں کے دیے
سوزنِ تدبیر سے سب چاک دل اُس نے سئے
اس مجاہد کا عطا اللہ بخاریؒ نام تھا
راستی پر ڈٹ کے جاں دینا یہ اس کا کام تھا
اے کمالِ عظمتِ ملت کے تابندہ نشاں
اے شریعت کے علمبردار اے غازی جواں
تُو تو نہ تھا اک بلبلِ رنگیں نوا شیریں بیاں
شعلۂ آواز میں تیرے نہاں تھیں بجلیاں
تو مثالِ ابرِ غرّاں چھا گیا افلاک پر
اور برسا صورتِ شبنم وطن کی خاک پر
اے غلامِ مالکِ ہر دو جہاں صاحب یقیں
ظلم کے آگے ترا سر خم ہوا ؟ ہرگز نہیں

یہ کبھی ممکن نہ تھا اے قافلہ سالارِ دیں

توڑ دے زنجیرِ آہن تیرا عزمِ آہنیں

جذبۂ آزادیٔ توحید زنداں کم نہ کرد

ذوقِ سیرِ راہِ حق خارِ مغیلاں کم نہ کرد

حیرت جلالپوری

ملتان جس کے فقر سے شاہی کا ہمنشیں
وہ پیکرِ حمیّت و غیرت نہیں رہا

سرمایہ دارِ حسنِ خطابت نہیں رہا
آئینہ دارِ شوکتِ ملّت نہیں رہا

پروانۂ چراغِ رسالت نہیں رہا
اور رازدارِ ختمِ نبوت نہیں رہا

افسوس وہ شہیدِ نبوت نہیں رہا
واحسرتا! امیرِ شریعت نہیں رہا

اک حق بے اماں تھا جو باطل کیو اسطے
وہ شعلہ نوائے صداقت نہیں رہا

افسوس بزمِ عشق پہ طاری ہے اک سکوت
لذت شناسِ دردِ محبت نہیں رہا

ملتان جس کے فقر سے شاہی کا ہمنشیں
وہ پیکرِ حمیّت و غیرت نہیں رہا

جس نے کلی کلی کو کیا آشنائے درد
نغمہ طرازِ گلشنِ وحدت نہیں رہا

رنگیں ہے جس سے قصۂ آزادیٔ وطن
صد حیف وہ مجاہدِ ملّت نہیں رہا

تھا عالمِ شباب کو پیری پہ جس کی ناز
وہ امتزاجِ دین و سیاست نہیں رہا

انگریز جس کے نام سے لرزاں تھا آج تک — وہ امتزاجِ دین و سیاست نہیں رہا

حیرت لحد پہ اس کی ہوں رحمت کی بارشیں

صد نازشِ تلاوتِ قرآں نہیں رہا

بسملؔ سعیدی دہلی

گرمی سے حرّیت کی اک آتش کدہ تھا دل

باطل پسند ہونا بڑا سود مند تھا   وہ مردِ باخدا تو مگر حق پسند تھا

بے لوث بے ہراس گزاری تمام عمر   تھی حرصِ عزّت و جاہ نہ خوفِ گزند تھا

اٹھی نہ سوئے دولتِ دنیا کبھی نظر   کس درجہ بے نیاز دلِ مستمند تھا

چلتا فریبِ دانہ و دام اس پہ کس طرح   سدرہ نشین بلند ز کید و کمند تھا

تھا دردِ ملک و ملت اُسے جان سے عزیز   درماں سے بے نیاز دلِ دردمند تھا

گرمی سے حرّیت کی اک آتشکدہ تھا دل   اور دل میں جو خیال تھا گویا سپند تھا

اس ساحرِ کلام کے اک ایک لفظ میں   اک قلزمِ معانی و مفہوم بند تھا

دار و رسن کے پنجۂ خونیں سے بے نیاز   محبوب اس کو سلسلۂ قید و بند تھا

ہم اور اس کی موت کے شایانِ شانِ غم   اس کا مقام و مرتبہ بسملؔ بلند تھا

سالک ربانی میاں چنوں

یکتائے روزگار بخاری بھی چل بسے

آنکھیں ہیں اشکبار بخاری بھی چل بسے
دنیا ہے سوگوار بخاری بھی چل بسے

جادو اثر خطیب وہ شعلہ نوا خطیب
یکتائے روزگار بخاری بھی چل بسے

بیباک حق پسند محبِّ وطن خطیب
ملت کے جاں نثار بخاری بھی چل بسے

آزاد زیبِ صحنِ گلستانِ ایشیا
رنگِ گل و بہار بخاری بھی چل بسے

ظاہر پرست آنکھ نے شبنم سمجھ لیا
گریاں تھے برگ و بار بخاری بھی چل بسے

اے بوستانِ فکر و عمل بزمِ شاعری
اجڑی تری بہار بخاری بھی چل بسے

وحشت فزائے آہوئے افرنگ جن کی ذات
وہ شیرِ مرغزار بخاری بھی چل بسے

جورِ فرنگ گردشِ ایام کے اسیر
خنداں تھے زیرِ دار بخاری بھی چل بسے

صدرِ نظامِ مجلسِ احرار بالخصوص
قائد وہ شہسوار بخاری بھی چل بسے

جن کا ضمیر فیضِ نبوت سے مستنیر
الفت کے راز دار بخاری بھی چل بسے

گریاں فلک ملائکہ نوحہ کناں زمیں
قدرت کے شاہکار بخاری بھی چل بسے

جرأت شکن تھے زاویے جسکی نگاہ کے — ہائے وہ فیصلہ باز سنجاری بھی چل بسے

سالک زبان شعر میں کیسے ادا کریں — مذہب کے غمگسار سنجاری بھی چل بسے

فانی مراد آبادی

وہ ایک مومن جو لطفِ احمدؐ کی برکتوں سے ثمر بنا تھا

فضا کے سینے پہ خونی کرگس کے تیز پنجے مچل رہے ہیں
چراغ علم و عمل کی لَو سے دھوئیں کے بادل اُبل رہے ہیں

کہ آج احرار کا نگہباں جو تختِ علمی پہ تھا فروزاں!
حیات فانی سے ہو کے گریاں سدھارا سوئے جہانِ یزداں

وہ ایک عالم جسے جہاں نے خراجِ تحسیں ادا کیا تھا
وہ ایک مومن جو لطفِ احمد کی برکتوں سے ثمر بنا تھا

وہ ایک رہبر کہ جس کی نظروں میں ساری دنیا تھی کوزۂ گل
وہ اِک معلّم کہ جس کے صدقے میں راہنوردوں نے پائی منزل

وہ اک مفسّر دلوں سے جس نے نکالے شبہات نومیدا
وہ اک مقرّر کہ جس کے طرزِ بیاں میں شعلوں کا سوز پیدا

اسی چراغِ سحر بہ پہلو کے غم میں عالم یہ رو رہا ہے!
مگر وہ بادِ قضا سے بجھ کر زمیں کے پہلو میں سو رہا ہے

حافظ امرتسری

وہ حق گو، وہ بیباک، ساحر بخاری
گلستانِ نبویؐ کی بادِ بہاری

خطابت تھی تجھ کو خدا سے ودیعت ہُوا ہم سے رخصت وہ امیرِ شریعت
وہ میداں کا غازی وہ مردِ قلندر شجاعت کا پُتلا، شرافت کا پیکر
مصائب کا خوگر مجسّم صداقت مجاہد، نڈر، پارسا، پاک طینت
وہ عابد وہ زاہد وہ بندہ خدا کا جواں فکر، معجز بیاں تھا بلا کا
ملی جس کے ہاتھوں میں شعلہ نوائی ہوئی جس کی گرویدہ ساری خدائی
خلوص و محبت رہا جس کا زیور عطا تھے جسے خسرویّت کے زیور
وہ شاعر، مبلغ، مبصر، مقرّر شریعت کا پیرو، طریقت کا رہبر
فصاحت، بلاغت کا سیلِ رواں تھا وہ الفاظ و معنی کا بحرِ رواں تھا
سیاست فراست میں تھا وہ یگانہ رہا جس کا زنداں میں برسوں ٹھکانہ

وہ حق گو وہ بے باک ساحر بخاری گلستانِ نبوی کی بادِ بہاری

خطابت تھی جس کو خدا سے ودیعت
ہوا ہم سے رخصت وہ امیرِ شریعتؒ

قمسن لالہ حیانوی

جس کی گفتار میں تھا نغمۂ بیدار حیات

آج اس دور میں دشوار ہے، تم کو جینا!
موت جس دور میں ہے سرگرمیاں یارو
آج اس دور میں شکوے ہیں خدا سے تم کو
جس میں شدت سے ہے احساس بہاراں یارو

⁂

تم ستمہائے زمانہ کا گلہ کرتے ہو
جب کہ مائل بکرم وقت کا ہر لمحہ ہے
تم کو اس عہد میں حاصل ہے فقط ماتم زیست
یعنی جس عہد کا ہر سانس حسیں نغمہ ہے

⁂

تم نے دیکھا نہیں شاید وہ زیاں کار سماں
قابلِ دار تھے جب وقت تمام اہلِ وفا
جب کہ تقدیسِ حرم راہ میں لٹ جاتی تھی
چند قزاق بنے بیٹھے تھے جب راہ نما

٭ ٭

تم نے دیکھے نہیں شاید وہ ستم کے منظر
جب کہ ہر لفظ پہ تعزیری پابندی تھی
روشِ عام تھی گلچیں کے عقیدہ سے ملنا
غنچہ و گل کو مسلنا ہی چمن بندی تھی!

٭ ٭

ثبت تھی وقت کے ہونٹوں پہ جب اک مہرِ سکوت
کون اٹھا تھا مگر شعلۂ احساس لئے
ہاں یہی پیکرِ ایثار و جنوں تھا جس نے
قوم کو فکر و عمل کے نئے اسلوب دیئے

٭ ٭

دیکھ اے گردشِ ایام یہی شخص ہے وہ

جس کے الفاظ میں تھے کتنے ہی پرسوز الاؤ

جس کی گفتار میں تھا نغمۂ پیکارِ حیات

جس کی تقریر میں تھا شعلہ و شبنم کا رچاؤ

اشرف قدسی

ہر معرکۂ دار و رسن یاد ہے تیرا
تو ایک طرف، ایک طرف نسلِ ہلاکو!

چھایا ہے زمانے میں جدھر دیکھیے ہر سُو
اے مردِ قلندر ترے الفاظ کا جادو

کیسے میں کہوں اِن میں ترا خون نہیں ہے
بکھرے ہیں جو محبوبۂ ایام کے گیسو

اصنام فرنگی کا نشاں بھی نہیں باقی
گونجا ہے فضاؤں میں ترا نعرۂ یاہُو

ہر معرکۂ دار و رسن یاد ہے تیرا
تو ایک طرف، ایک طرف نسلِ ہلاکو

عظمت کو تری آج بھی دنیا نہیں سمجھی
دنیا ہے سراپا ہے بدطینت و بدخُو
مدت سے ترستے ہیں جو آواز کو تیری
سمجھائے انہیں کون کہ خاموش ہے کیوں تُو

نذیر لدھیانوی

آزادی کی تحریک کا اِک باب تھا گویا

وہ سیفِ زباں فاتحِ اقلیمِ خطابت وہ سحر بیاں بلبلِ بستانِ فصاحت
وہ واعظِ شیریں سخن و عالمِ یکتا وہ ساحرِ اعجاز فن و مصحفِ گویا
وہ حافظِ دیں گنجِ شریعت کا نگہدار وہ حاملِ سوز و تپش سینۂ احرار

آزادیِ جمہور کا وہ عاشقِ جانباز ہر دم جسے اسلام کی تعلیم پہ صد ناز
تحریکِ خلافت کا وہ بیباک علمدار وہ معرکۂ ترکِ موالات کا سالار
۱۹۱۹ء
انیس سو انیس کے ہنگاموں کا شاہد ملت کا فدائی صفِ اول کا مجاہد
الفاظ سے جس نے کیا عالم تہ و بالا تصویر کشِ حادثۂ جلیانوالہ

انگریز کی ہیبت کو جو خاطر میں نہ لایا آزادی کا نقارہ دلیرانہ بجایا
بیدار کیا جس نے ہمیں خوابِ گراں سے ڈالی تنِ بے روح میں جاں نعرۂ بیاں سے
جس نے غمِ دوراں کو ہواؤں میں کیا گم تاریکیِ زنداں کو نواؤں میں کیا گم
نعمت تھی جسے پیرویِ ختمِ رسالت کی نصف صدی قوم اور اسلام کی خدمت

محمد حسن نے ہمیں بادۂ یثرب کے پلائے — میخانۂ توحید کے آداب سکھائے
سرمایۂ تابِ تبِ پنجاب تھا گویا! — آزادی کی تاریخ کا اک باب تھا گویا

سید قاسم رضوی

نہ کر سکے گی کبھی موت پائمال اُسے

بساطِ وقت سے افسوس اٹھ گیا وہ خطیب　　مزاجِ عصر کا جو عمر بھر طبیب رہا
وہ جس کے فکر و عمل میں فرشتگی تھی اسیر　　تمام عمر جو اخلاص کا نقیب رہا!
ہیولا بن کے جھپٹتا رہا جو باطل پر　　مخالفت کے ہر ایک خبر کا رقیب رہا
یہ واقعہ ہے کہ جس نے سنا نہ اسکا سخن　　حصولِ علم بصیرت میں کم نصیب رہا

تھا اس کا قلب حریم صفات کا محرم　　خلوصِ عشقِ محمد کی سلسبیل لئے
وہ اک شعورِ مجسم تھا عظمتِ دیں کا　　حق آگہی کی شکیبائی جمیل لئے
شکوہ و عظمتِ ملت کا پاسدار رہا　　سخن تھا اس کا تب و تابشِ جمیل لئے

وہ اس کی صدق بیانی وہ اس کا صدق و خلوص　　تلاش کرتا تھا خود شاہد مقال اُسے
گزر گیا جو ہر اک موڑ کاٹ کر غم کا　　ڈرا سکا نہ کبھی موت کا جلال اُسے

نگل سکی نہ جسے صرصرِ حوادث بھی — خدا نے بخشا تھا وہ وردِ لازوال اُسے
ستیزہ کار رہا شاطرِ فرنگی سے — تمام عمر رہا قوم کا خیال اُسے

اُتر گیا جو دلِ قوم میں لہو بن کر
نہ کر سکے گی کبھی موت پائمال اُسے

قیصر مصطفیٰ قیصر

جہاں سے ہائے وہ شعلہ نوا خطیب گیا

فدا تھے اہلِ چمن جس پہ وہ خطیب گیا
جو نالہ زن تھا شبِ غم وہ عندلیب گیا

زمانہ کہتا تھا جس کو معالجِ ملت
وہ قوم کے دِل پہ درد کا طبیب گیا

چراغِ عشقِ محمدؐ کی لَو لگی تھی جسے
ارم کا ملتے ہی پروانہ خوش نصیب گیا

نہ بس حبیبِ خدا پر تھا وہ ازل سے فدا
بشوقِ دید سوئے محفلِ حبیب گیا

سخن طراز جسے جانتے تھے اپنا رقیب
وہ کہہ کے روتے ہیں اب ہاتھ سے وہ رقیب گیا

یہ غم محاذِ نو ملت کی مرگ پر ہے بپا
جگر پہ داغِ الم لے کے غم نصیب گیا

وہ کہتا تھا کہ اگر پیشِ داورِ محشر
ہلے گا عرش جو روتا ہوا غریب گیا

جو دم میں کرتا تھا مردہ دلوں کو گرمِ عمل
جہاں سے ہائے وہ شعلہ نوا خطیب گیا

فرنگی جس کی صداؤں سے کانپ اٹھتا تھا
وہ دینِ پاک کا سحر آفریں نقیب گیا

وہ دورِ جوش پہ تھا جس میں ذوقِ داورِ سن
پلک جھپکتے ہی کیا دور وہ عجیب گیا

نہیں ہے شعر و ادب میں مزا کہ محفل سے
سخن شناس گیا، شاعر و ادیب گیا

وہ راہِ قرب یعنی جو تھی زندگی میں بعید ہوئی جو قطع تو محبوب کے قریب گیا
تنا رے عرش سے قیصر جو توڑ لاتا تھا ارم کو آج وہ واعظ گیا خطیب گیا

تجمل حسین دلؔ

چند لمحوں کے لئے فصل وفا مہکی تھی

آج ہر گوشۂ گلزار میں ویرانی ہے،

پھر مرے نغمۂ جذبات کی لے ٹوٹ گئی
ساز روتے ہیں غزل زار میں ویرانی ہے

خاک سی اڑتی ہے اب وقت کے ویرانوں میں
عقل کے کوچہ و بازار میں ویرانی ہے

عشق پھر دست بہ دل خاک بہ سر بیٹھا ہے
آج پھر حسن کے بازار میں ویرانی ہے

جن کے لہجے میں خیالوں کی کھنک ہوتی تھی
اُن کے پیرایۂ اظہار میں ویرانی ہے

چند لمحوں کے لئے فصل وفا مہکی تھی

آج ہر گوشۂ گلزار میں ویرانی ہے

اس نے پھولوں پہ رگ جاں کا لہو چھڑکا تھا
تو نے وہ رنگ بھی اے دستِ صبا چھین لیا

کس نے پیراہنِ لیلائے چمن چاک کیا
کس نے کلیوں سے وہ اندازِ حیا چھین لیا

رہنماؤں نے دیا ہم کو وہ دستورِ حیات
جس نے مفہومِ رہ و رسمِ وفا چھین لیا

ہر نئے دور میں وہ ظلِّ الٰہی ٹھہرا　　جس نے جمہور کی محنت کا صلا چھین لیا

میں نے جب بھی تیرے نغمات کی دھن چھیڑی ہے

میرِ محفل نے میرا سازِ نوا چھین لیا

اُف آفتاب زیرِ زمیں ہو گیا ہے آج

(از مولانا حافظ محمد یوسف صاحب ملکیار (رح))

باطل پہ آج خوف سا طاری نہیں رہا ۔ کیا حکم عرش فرش پہ جاری نہیں رہا
بولا کوئی مجاہدِ باری نہیں رہا ۔ دنیا میں آج شاہ بخاری نہیں رہا

محبوبِ بزم گوشہ نشیں ہو گیا ہے آج
اُف آفتاب زیرِ زمیں ہو گیا ہے آج

درویش تجھ سا کوئی تہِ آسماں نہ تھا ۔ ایسی ادا نہیں ہے کسی کی زباں نہیں
تجھ سا بلا مبالغہ قرآں خواں نہیں ۔ واعظ تو بیشمار ہیں جادو بیاں نہیں

خوش دل تھے خوش مزاج تھے اور خوش خصال تھے
اسلاف کی مثال تھے خود بے مثال تھے؛

اے دلبرِ فصیح و بلیغ و حسیں آ ۔ آنکھوں کے نور دل کے سرور و مکیں آ
نانا کے دینِ پاک کے وارث امیں آ ۔ تجھ کو تلاش کرتے ہیں اہلِ زمیں آ

چرچا ترے فیوض کا ہے ہند و پاک میں
تو کس خیال سے شہا سویا ہے خاک میں

جنگل میں کوہسار میں تیری تلاش ہے — ندی میں آبشار میں تیری تلاش ہے

گلشن میں سبزہ زار میں تیری تلاش ہے — بستی میں رہگذار میں تیری تلاش ہے

اے نورِ چشم، چشم کے تم روبرو رہو

اس بزم کے چراغ رہو، گُل کی بُو رہو

اے حضرتِ امیرِ شریعت بتایئے — اے آشنائے راہِ طریقت بتایئے

اے رازدارِ سرِ حقیقت بتایئے — اے پیشوائے اہلِ بصیرت بتایئے

تیرے بغیر قوم کو آکر جگائے کون

اعلائے حق کے واسطے سب کچھ لٹائے کون

پاکیزہ بچپن اور جوانی بھی طے ہوئی — سیلابِ علم کی تیز روانی بھی طے ہوئی

حق گوئی اور فیض رسانی بھی طے ہوئی — آخر بخیر منزلِ فانی بھی طے ہوئی

اب اس جہاں کی منزلیں آساں خدا کرے

جنّت مقام صدقہ خیر الوریٰ کرے

اے بے شعور قوم کے معمار الوداع — اخلاق عالیشان کے معمار الوداع

اے شاہ اور شاہ کے کردار الوداع — عالی وقار قائدِ احرار الوداع

اے جانیوالی ہستی ممتاز السلام

اے حق کی گونجتی ہوئی آواز السلام

نوشتہ محمد انور کالاباغ

"تیری رحلت سے ہوا علم و ادب کا گل چراغ"

۱۔ اے خطیبِ ملک و ملت، اے امیرِ باکمال
کر گیا ہے آج کیوں ملت کو تو وقفِ ملال

۲۔ ہو گیا وقفِ خزاں اب سارا عالم بے گماں
مضمحل فرقت میں تیری ہو گیا سارا جہاں

۳۔ اس جہانِ فانی سے اک دن سب نے ہونا ہے فنا
خالقِ کونین کا ارشاد بے شک ہے بجا

۴۔ ملک و ملت کو ہے تیری موت پر صدمہ عظیم
خادمِ اسلام تھا، تو ملک و ملت کا زعیم

۵۔ یاد کرتی ہی رہے گی تجھ کو اے والا صفات
ملت اسلامیہ خدمت تیری ساری حیات

س۔ روشنی بن کر رہا دنیا میں تو روشن دماغ

تیری رحلت سے ہُوا علم و ادب کا گُل چراغ

ش۔ شرعِ نبوی کی اطاعت میں تری گزری حیات

عالمانِ دین میں مشہور تھا تو ذی صفات

س۔ رہنمائے قوم تھا تو سیّد الاحرار تھا

جان و دل سے تو فدائے احمدِ مختار تھا

ی۔ یک زباں ہو کر رہا ہر بات میں ثابت قدم

تو نے ہر آلام میں اونچا کیا دیں کا علم

ع۔ عالمِ اسلام میں زندہ رہے گا تیرا نام

خُلد میں تجھ کو ملے گا بالیقیں اونچا مقام

ت۔ تیری تربت پر سدا ہو رحمتِ حق کا نزول

یا خدا یہ التجا انور کی ہو جائے قبول

عبدالغفور ریاضؔ فورٹ منڈیین

''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

اجل کا تلخ پیمانہ لئے پھر عزرائیل آیا
کہا رہبرِ شریعت سے چلیں وقت رحیل آیا

ہوا مردِ مجاہد باندھ کر رحلت سفر رخصت
ہوئی محروم میر کارواں سے قوم بد قسمت

دماغ و دل ہوئے مفلوج اس جانکاہ صدمے پہ
بصیرت ہو گئی مجروح اس ناگاہ صدمے پہ

وہ منزل جس پہ ہر اک طالبِ دیدار جا پہنچا
وہاں ختمِ نبوّت کا علمبردار جا پہنچا

لئے اعمال کے گوہر بڑی سرکار جا پہنچا
حقیقت میں حضور پاک کے دربار جا پہنچا

وہ جس کی قوت کردار نے دنیا بدل ڈالی
اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوا اس باغ کا مالی

نہ ہوگا پھر کوئی تجھ سا یہاں بالغ نظر پیدا
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شرافت اور نجابت میں وہ تھا اک گوہر یکتا
خطابت اور قیادت علم و عرفاں میں وہ تھا تنہا

مجالِ اف نہیں ہے رب اکبر کی مشیت پر
نہیں ضبط فغاں ممکن مگر اس حالِ ابتر پہ

تری فرقت غم و اندوہ کے نشتر چبھوتی ہے
مثالِ نرگسِ بے نور تجھ کو آنکھ روتی ہے

الٰہی رحمۃ اللعالمین کے نام کے صدقے
تو اس کو دامنِ رحمت کے سائے میں جگہ دے دے
